

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

فروری 2020

خواتین کا جامعہ



خواتین ڈائجسٹ

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

MEMBER
APNS
CPNE

انیس ویں اعلیٰ — محمود ریاض

مسیحہ — نگارہ خاتون

مسیحہ — اذریغ

نائب مسیحہ — رضیہ جمیل

مسیحہ خصوصی — امت الصبور

بلقیس بھٹی

نفسیات — عدنان

اقتصادیات — خالد جیلانی

قانونی مشیر — نور الدین سرکی اینڈ کپنی

ایڈوکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز



خواتین! ذاتِ نبوتِ فروری کا شمار لے ماضی ہیں۔
 انسان کو تمام عقائد سے افضل قرار دیا گیا ہے۔ افضل البشر ہونے کے نکتے اس پر کچھ ذمہ داریاں بھی عائد کی گئیں۔ ان ذمہ داریوں کا احساس کرنا اہل ایمان ہی کے خصوصی امتیاز ہے۔ انسان کی قدر و قیمت کا تعین کرتا ہے۔ انسان میں جتنا احسان و ذمہ داری ہوگا، وہ اتنا ہی قیمتی ہوگا۔
 اللہ تعالیٰ کی بندگی اور عبادت سے لے کر دنیا کے تمام معاملات کے حوالے سے ہم پر کچھ ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں۔ ان میں ایک اہم ذمہ داری اپنی زبان پر قابو اور سوچ سمجھ کر بولنا ہے۔
 ہماری اچائی اور بلندی دونوں زبان سے نکلے ہوئے الفاظ پر منحصر ہے۔ ہماری زبان سے نکلے ہوئے غلط الفاظ ہمیں ذلت کی آفتاب کو بخیر میں بھی دھکیل سکتے ہیں اور بلند یوں بھی ہم پر عتاب اور سزا دے سکتے ہیں۔
 سوچ سمجھ کر بولنا اور ثابت قدمی سے اپنے کچے پر قائم رہنا ایک بالکر قادر اور سمجھنے والے انسان کا وصف ہے۔ آپ چاہے کچھ بھی ہوں۔ آپ کے اندر گروہ کو کچھ ایسے ہوں گے جن پر آپ کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ اثر انداز ہوں گے۔ اس لیے بولتے ہوئے الفاظ کے انتخاب میں بھی احتیاط ضروری ہے۔
 ملکہ نور عیسیٰ کو سوچ سمجھ کر بولنا چاہیے لیکن منصب اعلیٰ پر قابو نہ رکھنا زیادہ ہی غلط رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کی زبان سے نکلے ایک ایک لفظ کی اہمیت ہوتی ہے۔ ان کے بار بار اپنی زبان سے چھڑنے والے کلمات ان کی بددی قوت کا اوصاف و صبر ہو سکتے ہیں۔ درود گواہ اپنی زبان کا پاس نہ رکھنے والے انسان پر کبھی بھی امتیاز نہیں ملتا۔ وہ اپنی عزت اور وقار کو ہتھیار سے جوڑے لوگ اور ہتھیار گزرنے والے ہیں۔ انہوں نے اپنا مقصد مقبول کیا اور ان کے آخر تک اپنے اصولوں اور موقف پر پوری طرح قائم رہے۔ انہوں نے کسی اپنے مقصد پر گھبراہٹ اور ہراسہ نہیں اپنی بات سے بھرے اداسی ثابت قدمی کی بنا پر وہ خواہ کیا سیاق ہوئے اپنا کام انہوں نے دلوں پر حکومت کی۔
 ایک رہنما یا منصب اعلیٰ پر فائز حکمران کے لیے الفاظ کا انتخاب بھی بہت اہم ہے۔ کیونکہ اس کو سامنے والے، لیسنہ کرنے والے اور اس کے پیروکار اس کی تقلید کرتے ہیں۔ اگر وہ ہمت دینے کے لیے نہ رہند بلکہ الفاظ استعمال کر کے سنا کر قوت معاشرے میں بھی بدترین سی اور بد زبانی فروغ دے گی۔ اس میں خاص طور پر بہت سوچ سمجھ کر بولنا چاہیے۔ اور یہی کہنا چاہیے کہ اس کے مطالب سے بھی پوری طرح واقف ہونا چاہیے۔ الفاظ کے غلط استعمال سے بلاشبہ ہمارا مقصد کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ جس طرح ہمیں کچھ نکات فہم کر لیے جائیں۔

اس شمارے میں،
 ۱۔ نیک نام کا مکمل ناول۔ غلوں کی خطا،
 ۲۔ گنہ گار کا مکمل ناول۔ سب جھوٹ نہیں ہوتا،
 ۳۔ ثمرہ بخاری کا ناول۔ خوشبو کا پیغام،
 ۴۔ سنہ بشری، شانِ الطافِ ہاشمی، قورنظر، اجروہ سبحان، تحسین گل اور طاہرہ عالمی کے افسانے،
 ۵۔ نثر احمد راحت جیس اور محنت کو طائر کا ناول،
 ۶۔ ادکارہ عالیہ علی سے باتیں،
 ۷۔ معروف مصنفہ ماہرہ احمد سے ملاقات،
 ۸۔ کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
 ۹۔ نفسانی اذیتوں کا چھین اور عدنان کے مشورے میں شامل ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔
 پوری امت مسلمہ اس پر مشفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی ناممکن اور اجسوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں جہت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔
 کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موسطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔
 ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔
 حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

سکین کن روشنی

ادب

بھوک سے (اللہ کی) پناہ مانگنا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا۔ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے۔ ”اے اللہ! میں بھوک سے تیری پناہ میں آتا ہوں، وہ بستی کی بری سٹھی ہے۔ اور خیانت سے تیری پناہ میں آتا ہوں، وہ بری ہمارا ہے۔“
 فوائد و مسائل 1: جس طرح زیادہ کھانا اور عیش و تمنا نہیں، اسی طرح زیادہ بھوک اور فقر جس پر صبر نہ ہو سکے، بھوک نہیں۔ حلال روزی مانگنا اور اس کے حصول کی کوشش کرنا بڑا بد وقتوں کے منافی نہیں۔
 2- جمع الکفای ”مطلب“ ”ما تھ لیسے والا“ ہے۔
 بھوک کی حالت میں شوق سے عبادت ہو سکتی ہے اور نہ آرام سے سویا جاسکتا ہے۔ ایسی بھوک سے اللہ کی پناہ مانگنا ہی بہتر ہے۔
 3- انتہائی گہرا دوست جب انسان کے ذاتی معاملات سے واقف ہو، اسے بھی بظاہر کہتے ہیں۔ خیانت ایک پوشیدہ عیب ہے۔ جب راز فاش ہو جائے تو انسان بدنام ہو جاتا ہے، اس لیے اس سے محفوظ رہنے کی دعا کرنے کی ضرورت ہے۔ نیک آدمی کو نیکی پر قائم رہنے کے لیے بھی اللہ تعالیٰ سے مدد و توفیق کی دعا کرتے رہنا چاہیے۔

رات کا کھانا ترک کرنا
 حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”رات کا کھانا مت چھوڑو، خواہ کتنی بھر گھوڑی ہی کسی، اس لیے کہ اس کا چھوڑ دینا (آدمی کو بھلا) بڑا گناہ مارتا ہے۔“

مہمان نوازی
 حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”جس گھر میں مہمان آتے ہیں اس میں بھلائی اس سے بھی زیادہ جلدی آتی ہے، چھٹی جلدی چھری اونٹ کے کوہان پر چلتی ہے۔“
 حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”جس گھر

میں مہمان کھانا کھاتے ہیں، اس میں بھلائی اس سے بھی جلد آتی ہے، جتنی جلدی چھری اونٹ کے کوبان پر چلتی ہے۔“
حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”یہ بھی سنت ہے کہ آدمی مہمان کے ساتھ (اسے رخصت کرتے وقت) گھر کے دروازے تک آئے۔“

جب مہمان کو کوئی خلاف شرع کام دیکھتو تو (کھانا کھائے بغیر) واپس ہو جائے

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا ”میں نے کھانا تیار کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو گھر میں تصویریں نظر آئیں، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم واپس چلے گئے۔“
حضرت ابو عبد الرحمن سفینہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دعوت کی۔ اس نے ان کے لیے کھانا تیار کیا۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا۔ ”کاش ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی دعوت کرتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ساتھ کھانا کھاتے۔“
اس جوڑے کے مطابق انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور اپنا ہاتھ دروازے کی چوکت پر رکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں ایک طرف ایک بار کی پر دہ نظر آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم واپس لوٹ گئے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا۔ ”جلدی سے جائیے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیجیے اے اللہ کے رسول! آپ واپس کیوں تشریف لے گئے؟“

(حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دریافت کرنے پر) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”مزین گھر میں داخل ہونا میری شان کے لائق نہیں۔“
فوائد و مسائل 1: کھانے کی دعوت دینا اور دعوت قبول کرنا ایسے اخلاق میں شامل ہے۔

2- پردے سے مراد وہ کپڑا جو گھر میں داخل

کے لیے لٹکا جایا ہے۔ دروازے یا کھڑکی پر اس لیے لٹکا یا ہوا کپڑا کہ باہر سے کسی کی نظر نہ پڑے۔ مطلوب ہے۔ سادگی شرعاً مطلوب ہے۔ بے جا تکلفات سے اجتناب کرنا چاہیے۔ نامناسب چیز سامنے آنے پر فوراً سمجھ کر نامناسب ہے۔ بشرطیکہ تاخیر سے کوئی حکمت نہ ہو۔
3- اگر دعوت دینے والا کسی ناجائز کام کا ارتکاب کرے تو کھانا کھائے بغیر واپس چلے جانا جائز ہے۔ البتہ اگر وہ اس غلطی کا ازالہ کر دے تو واپس نہ جائیں۔

گوشت اور گھی ملا کر کھانا

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ وہ کھانا کھا رہے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لے آئے۔ انہوں نے مجلس کے احترام والے مقام پر انہیں جگہ دی۔ (حضرت عمرؓ مجھے اور کھانا شروع کرتے ہوئے) فرمایا۔ ”بسم اللہ“ پھر ہاتھ بڑھا کر ایک لقمہ لیا، پھر دوسرا لقمہ لیا۔ پھر فرمایا ”مجھے چکنائی کا مزہ محسوس ہو رہا ہے اور یہ چکنائی گوشت کی چکنائی نہیں۔“ گوشت میں تھوڑی بہت چربی ہوا ہی کرتی ہے۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا۔ ”امیر المؤمنین! میں فریہ (جانور کے) گوشت کی تلاش میں اسے خریدنے بازار گیا۔ مجھے وہ مہکا محسوس ہوا۔ میں نے ایک درہم کا دیلے (جانور کے گوشت) میں سے خرید لیا۔ (جس میں چربی تھی) اور اس پر ایک درہم کا بھی ڈال لیا۔ میں چاہتا تھا کہ میرے بچوں کو ایک ایک پیڑی مل جائے۔“
حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کبھی بھی یہ دونوں چیزیں (گوشت اور گھی) جمع ہو جاتی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں سے ایک تناول فرماتے تھے اور دوسری چیز صدقہ کر دیتے تھے۔“

حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔ ”امیر المؤمنین! (اب تو) تناول فرمائیے۔ (آئندہ) میرے پاس جب بھی یہ دونوں جمع ہوں گے میں بھی اسی طرح عمل کروں گا۔“

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ”میں نہیں کھاؤں

گا۔“

سالم پکا تے وقت زیادہ پانی ڈالیں

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”جب تو شوربہ تیار کرے تو اس میں پانی زیادہ ڈال لیا کر اور اس میں سے کچھ شوربہ اپنے پیڑیوں کو دے دیا کر۔“

فوائد و مسائل 1: ہمسایوں میں اچھے تعلقات قائم رکھنے کے لیے تجھے تحائف کا لین دین بہت اچھا طریقہ ہے۔ جتنی تحائف کے بجائے ایسی چیز دینا بہتر ہے جو فوری استعمال میں آجائے۔

2- جب کوئی خاص کھانا تیار کیا جائے تو کچھ نہ کچھ ہمسایوں کے ہاں بھی بھیجا جائے۔ عام سادہ کھانا بھی بھیجا جاسکتا ہے۔

3- معمولی بدیہ ملے تو قبول کر لینا چاہیے اور ہر بار ادا کرنا چاہیے۔

4- گوشت میں پانی زیادہ ڈال کر کچھ سالم ہمسایوں کے ہاں بھیج دینا ایسا طریقہ ہے جس کے لیے خاص طور پر اضافی خرچ نہیں کرنا پڑتا۔ اس قسم کی اور چیزیں بھی ہو سکتی ہیں۔

لہسن، پیاز اور گندنا کھانا

حضرت سعدان بن ابوطالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ جمعہ کے دن دل خراب دینے کھڑے ہوئے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اللہ کی حمد و ثناء کے بعد فرمایا۔ ”اے لوگو! تم دو پودے کھاتے ہو میں تو انہیں برا ہی سمجھتا ہوں، یعنی یہ لہسن اور پیاز، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دیکھا ہے کہ اگر کسی آدمی سے اس (لہسن یا پیاز) کی بو محسوس ہوتی تو اس کا ہاتھ پلا کر اسے (بچے کے میدان) کی طرف نکال دیا جاتا تھا، اس لیے جس نے ضرورت انہیں کھانا ہو، وہ انہیں پکا کر ان کی بو ختم کر دے۔“

فوائد و مسائل 1: جب مسجد میں جانا ہو تو کچا پیاز یا لہسن نہیں کھانا چاہیے۔ اگر کھانا پڑے تو نماز

سے اتنی دیر پہلے کھایا جائے کہ نماز کے وقت تک اس کی بو ختم ہو جائے، یا کوئی ایسی چیز کھالی جائے جس سے پیاز کی بو ختم ہو جائے۔

2- جب ایک مسئلہ پہلے بیان کیا جا چکا ہو، اس کے بعد اس سے متعلق غلطی کرنے والے کو سختی سے تنبیہ کی جاسکتی ہے۔ مسجد سے نکلنے کا مقصد یہ تھا کہ بو ختم ہونے پر مسجد میں آئے۔

حضرت ام ایوب انصاریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا میزبان رسول ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی (الہیہ) سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔ ”میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کھانا تیار کیا۔ اس میں کوئی (ناگوار بو والی) چیز تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (وہ کھانا) نہ کھایا۔ اور فرمایا۔ ”میں اپنے ساتھی (جبریل علیہ السلام) کو تکلیف دینا پسند نہیں کرتا۔“

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ چند افراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے گندے کی بو محسوس ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”کیا میں نے تمہیں یہ پودا کھانے سے منع نہیں کیا تھا؟ جس چیز سے انسان کو ایذا پہنچتی ہے اس سے فرشتے بھی ایذا محسوس کرتے ہیں۔“

فوائد و مسائل 1: گندنا، پیاز سے ملتی جلتی چیز ہے جس میں پیاز کی طرح بو ہوتی ہے۔ فرشتے بوسے نفرت کرتے اور اذیت محسوس کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان چیزوں سے اجتناب کرتے تھے تاکہ جبریل علیہ السلام کو ناگوار نہ ہو۔

2- مسلمان کو فرشتوں کا احترام کرتے ہوئے ناگوار بو والی چیز کھانے سے، نفس الفاظ بولنے سے، عریانی اور فسق حرکات سے پرہیز کرنا چاہیے۔

3- لہسن، پیاز اور گندنا حرام نہیں، تاہم انہیں استعمال کرنا پڑے تو بیکار کیا جائے یا بعد میں کوئی ایسی چیز کھائی جائے جس سے منہ کی بو ختم ہو جائے۔

پنیر اور گھی کھانا

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھی، پنیر اور پوتین کے بارے میں سوال کیا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "حلال وہ ہے جو اللہ نے اپنی کتاب میں حلال کیا ہے اور حرام وہ ہے جو اللہ نے اپنی کتاب میں حرام کیا ہے اور جس کے بارے میں خاموشی اختیار فرمائی ہے، وہ ان چیزوں میں شامل ہے جن کے بارے میں اللہ نے معافی دے دی ہے۔"

فوائد و مسائل 1: فراء کے دو معنی ہیں فرد کی جھ، یعنی پوتین یا کھال سے بنا ہوا لباس۔ فراء جھ، یعنی جمار و گدھی (گورخ) یہاں دونوں مطلب صحیح ہو سکتے ہیں۔

2- اللہ کی کتاب سے مراد اللہ کا قانون ہے جس میں قرآن اور حدیث دونوں شامل ہیں۔

3- جن چیزوں کے بارے میں حرمت کی صراحت نہ ہو بلکہ حرمت کا اشارہ ملتا ہو، وہ بھی حرام ہیں، مثلاً وہ جانور جنہیں مار ڈالنے کا حکم ہے۔ یا جنہیں قتل کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ جن چیزوں میں حرمت کا کوئی سبب نہ پایا جائے وہ حلال ہیں، خواہ ان کا ذکر قرآن و حدیث میں آیا ہو یا نہ آیا ہو۔

پھل کھانا

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا: "میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں طائف کے انور بدیہ کے طور پر پیش کیے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلایا اور فرمایا: "یعنی خوش لے اور رانی والدہ کے پاس لے جاؤ۔" میں نے والدہ کے پاس پہنچانے سے پہلے خود ہی کھالیا۔ پھر کئی راتوں کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: "اس خوشے کا کیا بنا؟ کیا تم نے وہ اپنی والدہ کو پہنچا دیا تھا؟"

میں نے کہا: "نہیں۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا نام دھوکے باز رکھ دیا (مجھے دھوکے باز فرمایا۔)

حضرت طبرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے،

انہوں نے فرمایا: "میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں سفر جل (بجی کا پھل) تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اے طلحہ! یہ لے لو، اس سے دل کو راحت (اور قوت) حاصل ہوتی ہے۔"

لیٹ کر کھانے کی ممانعت کا بیان

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ انہوں نے کہا: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ آدمی چہرے کے بل لیٹ کر کھائے۔"

فائدہ: مذکورہ روایت سنداً "ضعیف" ہے تاہم صحیح احادیث میں منہ کے بل لیٹنا ویسے بھی منع ہے۔ تو اس طرح لیٹ کر کھانا کب جائز ہوگا؟ علاوہ انہیں شیخ البانی رحمۃ اللہ نے مذکورہ روایت کو دیگر شواہد کی بنا پر حسن قرار دیا ہے، لہذا مذکورہ روایت سنداً ضعیف ہونے کے باوجود دیگر شواہد کی بنا پر قابل عمل ہے۔

پانچ چیزیں

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمایا: "اے مہاجرین! ہماری جماعت! پانچ چیزیں ایسی ہیں کہ جب تم ان میں مبتلا ہو گئے (تو ان کی سزا ضرور ملے گی۔) اور میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ وہ (بری چیزیں) تم تک نہ پہنچیں۔"

جب بھی کسی قوم میں (بے حیائی، بدکاری وغیرہ) اعلانیہ ہونے لگی ہے تو ان میں طاعون اور ایسی بیماریاں پھیل جاتی ہیں جو ان کے گزیرنے والے بزرگوں میں نہیں ہوتی تھیں۔

جب بھی وہ ناپ تول میں کمی کرتے ہیں، ان کو قحط سالی، روزگاری کمی اور بادشاہ کے ظلم کے ذریعے سزا دی جاتی ہے۔

جب وہ اپنے مالوں کی زکوٰۃ دینا بند کرتے ہیں تو ان سے آسمان کی بارش روک لی جاتی ہے۔ اگر جانور نہ ہوں تو انہیں بھی بارش نہ ملے۔

جب وہ اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد توڑتے ہیں تو ان پر دوسری قوموں میں سے وہ ان سے کچھ نہیں لیتے ہیں جو ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

وہ ان سے کچھ نہیں لیتے ہیں جو ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جب بھی ان کے امام (سرور اور لیڈر) اللہ کے قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتے اور جو اللہ نے اتارا ہے اسے اختیار نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ ان میں آپس کی لڑائی ڈال دیتا ہے۔

فوائد و مسائل 1: مصائب و تکالیف کے ظاہری اسباب کے علاوہ کچھ روحانی اور باطنی اسباب بھی ہوتے ہیں۔ اگر عقائد و اخلاق کی ان خرابیوں سے پرہیز کیا جائے تو اللہ تعالیٰ ظاہری اسباب کو تبدیل فرما دیتا ہے۔

2- بے حیائی کے نتیجے میں آتشک اور سوزاک، بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، پھر ایلیز اور ہپاٹائٹس وغیرہ لاپرواہیاں سامنے آئیں۔ کوئی معاشرہ بے حیائی سے جتنا محفوظ ہے، اسی قدر اس میں بے نیاریاں کم ہیں۔

3- ناپ تول میں کمی اور حرص کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اس سے دودھ و روغن کا حق مارا جاتا ہے، اس لیے اس کی سزا بھی مالی نقصان اور قحط کی صورت میں ملتی ہے۔

4- زکوٰۃ مال میں برکت کا باعث ہے۔ جب معاشرے میں زکوٰۃ دینے والے کم ہو جائیں تو اس کی سزا میں معاشرے کا رزق روک لیا جاتا ہے۔

5- دوسروں پر رحم کرنے والے پر اللہ تعالیٰ رحم کرتا ہے۔ اس کے برعکس دوسروں کو تکلیف پہنچانے والا، ان کی مدد نہ کرنے والا اور ان کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے والا اللہ کے رحم کا مستحق نہیں رہتا۔

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے مراد اسلامی ملک میں رہنے والے غیر مسلموں کے جائز حقوق کا تحفظ ہے۔ اس کے علاوہ اسلام قبول کرنے والا اللہ کی عبادت اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا عہد کرتا ہے۔ اس عہد کی خلاف ورزی بھی تو کمزور کا حق بنا دیتی ہے۔

6- شریعت پر عمل کرنے سے اختلاف ختم ہو جاتا ہے۔ جس کے برعکس دنیوی مفاد کے لیے اللہ کے احکام کی

خلاف ورزی سے خود غرضی کی عادت پختہ ہوتی ہے اور ایمان و ہمدردی کے جذبات ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں معمولی بات پر اختلاف شدت اختیار کر لیتے ہیں۔

7- قوی صحت کی حفاظت کے لیے ملک سے فحاشی کے تمام ذرائع، مثلاً فحش لٹریچر، ساز، رقص، فلمیں، مرد و عورت کا اختلاط، ریڈیو اور ٹیلی ویژن وغیرہ کے بے ہودہ پروگرام وغیرہ کا سد باب ضروری ہے۔

8- معاشی آسودگی اور اقتصادی ترقی کے لیے ملک میں دیانت داری کا پلچان ضروری ہے۔

9- پانی کی قلت موجودہ دور کا ایک اہم مسئلہ بننا چاہیے۔ اگر زکوٰۃ کے نظام کو کچھ بنیادوں پر قائم کر کے اسے شریعت کے مطابق چلایا جائے تو یہ مسئلہ ہو سکتا ہے۔

10- ملکی دفاع کی مضبوطی کے لیے عقیدہ توحید کی ترویج و تبلیغ اور توحید کے صحیح تصور کو پختہ کرنا چاہیے۔ تب اللہ کی وہ مدد آئے گی۔ جس کا وعدہ قرآن میں کیا گیا ہے۔ فرقہ، پارٹی، علاقے، زبان اور قبیلے کی بنیاد پر انتشار دور حاضر کا بہت بڑا المیہ ہے۔ اس کا علاج ہر سطح پر شریعت کا مکمل نفاذ ہے۔

فوائد و مسائل:

ہر شر اور چیز حرام ہے۔ خواہ اس کا کوئی نام رکھ لیا جائے۔ نام بدلنے سے چیز کا شرعی حکم تبدیل نہیں ہو جاتا۔ جیسے سود کو منافع کہیں یا بارک اپ وہ سود ہی رہتا ہے۔ جیسے حرام چیز حلال نہیں ہو جاتی بلکہ جرم زیادہ شدید ہو جاتا ہے۔ ساز بنانا اور سننا حرام ہے۔ ساز کے ساتھ اچھے شرعی نغمے جیسے ناپ جائز نہیں ہوں گے۔ بعض لوگ سازوں کے ساتھ نعت پڑھتے اور سنتے ہیں۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نہیں بلکہ گستاخی ہے، اور اگر ان کا مفہوم شریکی ہو تو گناہ اور زیادہ سنگین ہو جاتا ہے۔ اس امت میں زمین میں جس جہنم جانے اور صورت تبدیل ہو کر بندہ ریاخیز برین جانے کے واقعات پیش آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔ پہلے سے خبر دینے کا مقصد یہ ہے کہ کوئی سلیمان الاطی میں وہ جرم نہ کر بیٹھے جس سے وہ اس سزا کا مستحق ہو جائے۔



- 1- اصلی نام؟
عالی علی۔
- 2- پیار کا نام؟
عالی یا پھر سچ نام لیتے ہیں عالی علی۔
- 3- تاریخ پیدائش؟
22 فروری 1989ء۔

4- مادری زبان؟
اردو..... مگر اردو بھی بولتے ہیں، پنجابی بھی۔ ملا جلا رہتا ہے۔

- 5- فیملی ممبرز/ آپ کا نمبر؟
ہم سات بہنیں ہیں اور میں چھٹے نمبر کی ہوں۔
- والدین نہیں ہیں۔
- 6- شادی/ بچے؟
نہ شادی نہ بچے..... ہنستے ہوئے۔

وقت

بائیں عالیہ علی سے

شاہین رشید

- 11- آپ کا سورج کب نکلتا ہے؟
الہ اللہ میں بہت صبح اٹھ جاتی ہوں۔ صبح کے وقت سے مجھے عشق ہے۔ یوگا کرنا، ایکس سائز کرنا، واک پہ جانا، جم جانا مجھے بہت پسند ہے اور میرا یہ خیال ہے کہ جو صبح کے وقت نہیں اٹھتے وہ بہت بد قسمت ہیں۔

- 12- صبح کیانہ طے صبح نہیں ہوتی؟
میں ڈنر پر نہیں ہوں مگر ناشتہ پر نہیں ہوں۔ صبح ایکس سائز سے فارغ ہو کر ناشتہ ضرور کرتی ہوں اور جوتے جاتے کھاتے ہوں۔

- 13- پاکستان کے لیے کیا سوچتی ہیں؟
ہمارے ملک کے جتنے بھی حکمران ہیں، اپنی ذات کی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ عوام سے یہ صرف دھوکا لیتے ہیں، میں پاکستان کو بہت ترقی یافتہ دیکھنا چاہتی ہوں۔
- 14- سیاست میں کون پسند ہے؟

- 7- تعلیمی قابلیت؟
بی کام۔

- 8- بی وی پر آم؟
میں نے سب سے پہلے ایک کرکٹ میں کام کیا تھا۔ ایک ٹیکسٹ باؤڈر کا..... اور بس اتفاقاً آگئی تھی۔

- 9- بچپن کی کس عادت سے گھر والے پریشان ہوتے تھے؟
میں سوئے اور ہوں تو بچپن میں چینی بہت کھاتی تھی تو امی ناراض ہوتی تھیں۔ مگر مجھے اپنی عادت بہت پیاری لگتی تھی۔

- 10- پہلی کمانی کس کے ہاتھ میں رکھی؟
پہلی کمانی پانچ سو روپے تھی اور ہم ہیں سات بہنیں۔ تین شادی شدہ ہیں تو ہم چاروں بہنوں نے اس پانچ سو روپے کی پارٹی کی تھی اور پیسے کسی کو نہیں دیے تھے۔

خاموش رہو

انشائی

کچھ کہنے کا وقت نہیں ہے، کچھ نہ کہو، خاموش رہو
اے لوگو خاموش رہو، ہاں اے لوگو، خاموش رہو

سچ اچھا، پراس کے جلو میں، زہر کا ہے اک پیالا بھی
پاگل ہو، کیوں ناتی کو مستراط بنو، خاموش رہو

حق اچھا، پراس کے لیے کوئی اور مرے تو ادا اچھا
تم بھی کوئی مقصود ہو جو سوئی پر چڑھو، خاموش رہو

اُن کا یہ کہنا سورج ہی دھرتی کے پھیرے کرتا ہے
سرا نکھول پر، سورج ہی کو گھومنے دو، خاموش رہو

جلس میں کچھ میں ہے اور زنجیر کا آہن چھتا ہے
پھر سوچو، ہاں پھر سوچو، ہاں پھر سوچو، خاموش رہو

گرم آنسو اور ٹھنڈی آہیں، من میں کیا کیا موسم ہیں
اس گلیا کے عہد نہ کھو لو، میر کرو، خاموش رہو

آنکھیں مونہ کنارے بیٹھو، من کے رکھو بند کواڑ
انشائی لو دھاک لودا لب سی لو، خاموش رہو



برے طریقے سے غلامیات ہوں۔

33- بچن سے لگاؤ؟

ہاں..... بہت لگاؤ ہے۔ مگر کھانے کی حد تک..... مگر کھانا بنا بھی لیتی ہوں اور بہت اچھا بناتی ہوں اور سب کچھ کھا لیتی ہوں۔

34- ایک خواہش جس کے پورا ہونے تک زندہ رہنا چاہتی ہوں؟

ایک نہیں..... میری ایک سے زیادہ خواہشات ہیں اور مرنے سے پہلے بھی ایک خواہش ہے جو صرف میرا اللہ جانتا ہے اور وہ مجھے ایسا نہیں کرے گا۔

35- کس کے لیے زندہ رہنا چاہتی ہیں؟

میں کسی کے لیے زندہ نہیں رہنا چاہتی، میں اپنے لیے زندہ رہنا چاہتی ہوں کیونکہ اللہ نے مجھے دنیا میں بھیجا ہے، اکیلا بھیجا ہے، اکیلا بلائے گا۔

36- انسان کی زندگی کا مقصد؟

ہر انسان کو اپنے زندہ رہنے کا مقصد محفوظ بنانا ہے کہ اسے اللہ نے کیوں بنایا تو میں کوشش کروں گی کہ زندگی میں کوئی ایسا کام کروں جس کی وجہ سے لوگ مجھے یاد رکھیں۔

37- ایک صحت جو گرہ سے باندھ لی؟

جھوٹ نہیں بولنا چاہیے اور اپنے رزق، اپنی کمائی کو ہاتھ نہ رکھنا چاہیے، ہماری امی ہمیں اسکول کے لیے دوپٹے بکس بنا کر دیتی تھیں کہ ایک تم نے کھانا پودھ دوسرا کسی کے ساتھ بانٹ کے کھانا ہے۔

38- آپ کو نفرت ہے؟

نفرت کسی سے نہیں کرتی..... کیونکہ میں درگزر کرنے والوں میں سے ہوں۔

39- اگر تم کہیں گرواٹ خالی؟ کیا کریں گی؟

میں ایسا نہیں ہوا کہ پیسے نہ ہوں۔ گھر سے نکلے وقت پہلے پیسے ہی رکھتی ہوں۔

40- بچپن میں کس نے زیادہ مارا؟

امی سے مار پڑتی تھی، مگر ابو نے بھی نہیں مارا۔ یا بچہ بچہ سے مار پڑتی تھی۔

24- مارنا کب شروع ہونے لگا؟

بالکل ہونے لگا نہیں۔ مگر ایسے جوئی نسل کے کام آئیں، صرف شادی بیاہ، ناچ گانے اور میک اپ کی باتیں نہیں ہونی چاہئیں۔ اس شو کا کاروبار نہ بنائیں۔

25- گھر میں سب سے زیادہ پیار کس سے ملا؟

اپنی بہنوں سے، ان کے بچوں سے، والدین سے۔ سب سے بہت پیار ملا۔ ہم تو جی حضوری والے لوگ ہیں۔ پیار لیتے بھی ہیں اور دیتے بھی ہیں۔

26- پیار ہونے پر پیاری کو سیریس لیتی ہیں؟

سیریس تب لیتی ہوں جب پیاری تھوڑی لمبی ہو جائے ورنہ تو نہیں لیتی۔ نارمل ہی رہتی ہوں۔

27- پیار ہونے پر شور مچاتی ہیں؟

نہیں، شور نہیں مچاتی۔ میرے بچپن کی بڑی خوب صورت بات ہے کہ میں جب بھی پیار ہوتی تو ظاہر ہے کہ بھوک کم ہو جاتی تھی اور امی مجھ سے پوچھتی تھیں کہ کیا کھانا ہے تو میں کہتی تھی کہ ”گول“ ہے، ”یہ“ ”وہ“ ”کھانا“ تو آج بھی یہی حال ہے اور میں جب پیاری کے دو تین گول کے بعد گول کئے اور دہی بھلے کھالوں تو جی ہو جاتی ہوں۔

28- آپ کے ڈراموں کی تعداد؟

کافی لمبی فہرست ہے۔ آپ کو آرام سے بتاؤں گی۔

29- رول آسانی کیسے کرتی ہیں؟

یہ مختصر ہے کہ سامنے کون سے؟

30- ادب سے لگاؤ ہے، کس کو پوچھتی ہیں؟

پڑھتی کسی کو نہیں لیکن میں ”قاسم علی شاہ“ کو بہت زیادہ سنی ہوں اور ان کو بہت فالو کرتی ہوں۔

31- کس شخصیت سے ملنے کی خواہش ہے؟

”قاسم علی شاہ“ سے۔ وہ بہت اچھے اور بہت ناچ رکھنے والے انسان ہیں، وہ پڑھا لکھا بھائی ہے اور مجھے بہت پسند ہیں۔

32- اپنا کوئی فیصلہ جو غلط ثابت ہوا ہو؟

جی..... دو تین بڑے فیصلے کر لیے تھے جو بہت

ایسا کوئی ہے تو نہیں مگر عمران خان اس لیے اچھا لگتا ہے کہ وہ بس اچھا لگتا ہے۔ کیا اس نے بھی ابھی تک کچھ نہیں۔

15- کس ملک کی شہریت کی خواہش ہے؟

کسی بھی ملک کی شہریت نہیں چاہیے۔ میرا پاکستان بہت خوب صورت ہے۔ ہم کسی سے کم نہیں۔

17- فیض ملتے ہیں تو آپ کا رد عمل؟

بہت اچھا لگتا ہے اور اس وقت تو بہت ہی اچھا لگتا ہے جب لوگ میرے ڈراموں کی اور میری پرفارمنس کی تعریف کرتے ہیں۔

18- اسپورٹس سے آپ کا لگاؤ۔ کون سا گیم پسند ہے؟

کچھ خاص لگاؤ نہیں ہے۔

19- زندگی سے کیا سیکھا؟

زندگی سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ زندگی بہت خوب صورت ہے، زندگی آپ کی نیت ہے، آپ کا کردار ہے۔ آپ کی شخصیت ہے۔ زندگی میں کامیابی حاصل کرتی ہے تو زندگی سے پیار کریں۔

20- ایک صحت جو آپ کرنا چاہتی ہیں؟

جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ دنیا ہمارے بارے میں کیا کہے گی، یا کہ لوگ ہمارے بارے میں کیا کہیں گے، تب آپ کچھ بھی نہیں کر سکتے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سچ کا ساتھ دیتا ہے۔ جھوٹ مٹ بولیں اور والدین کی خدمت کریں۔

21- پہلی بار کس سے کا سامنا کیا تو؟

بہت نروس تھی۔ اپنی نروس تھی کہ ڈانیا لگا بھی بولے نہیں آ رہے تھے۔ بہت کچھ طاری ہوئی تھی۔

22- کبھی جھوم میں تھیں؟

نہیں، ابھی تک ایسا نہیں ہوا۔

23- دل کی دھڑکن کب تیز ہو جاتی ہے؟

میں بہت حساس انسان ہوں، اپنے رشتوں کے بارے میں۔ اگر میری کوئی بہن گھبرا کر فون کرے تو میرے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے کہ یا اللہ خیر ہو۔

ضروری تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔
سب سے پہلے ہمارے دل کا خیال آتا ہے، پھر
بائیں اور دوسری ہاتھوں کا۔

69- نی نی بانی ہو جاتا ہے جب؟
تو کوشش کرتی ہوں کہ کسی سے بات نہ کروں اور
پانی پیتی رہوں اور کسی کام میں مصروف ہو جاتی ہوں۔

70- اچھی بری خبر پہلے کے سنائی ہیں؟
سب کو..... گھر والے کہتے ہیں کہ تیری زندگی میں
کچھ اچھا ہو یا برا، جب تک تم سب کو بتائیں دیتیں انہیں
سکون نہیں آتا۔

71- اپنا کل سوچ کر اداسی ہوتی ہے، ہنسی آتی
ہے یا انجوائے کرتی ہیں؟
کبھی اداس ہو جاتی ہوں، والدین کی کمی محسوس
ہوتی ہے تو رونا بھی آتا ہے۔ اپنی بے وقوفیوں سے ہنسی آتی
ہے جو بچپن میں کی ہوتی ہیں اور لانگ کا انجوائے بھی کرتی
ہوں۔

72- آگے کو کتنا وقت دیتی ہیں؟
شوٹ ہے۔ پوچھتی ہوں تو بہت، گھر پر ہوں تو
الٹ بھی نہیں۔

73- سب کو خوش کرنے میں اپنا دل ٹوٹ جاتا
ہے؟
نہیں، ایسا کبھی نہیں ہوا۔ دوسروں کو خوش کر کے
مجھے بہت سکون ملتا ہے۔

74- خواتین راسخز میں آپ کی پسندیدہ
راسخز؟
سرفرست نہت سکن ہیں۔ ابھی کچھ ہی عرصہ قبل
ان کا "گھر ویاہر" کیا جو نہت سکن نے لکھا تھا۔
اٹلی بھی لکھا ہے۔

75- کسی تقریب میں جانے کے لیے تیاری
میں کتنا وقت لیتی ہیں؟
میں بہت جلدی تیار ہو جاتی ہوں..... کیونکہ تیار
ہونے کی پریکٹس ہوگئی ہے، سارا دن یہی کام کرتا ہوتا
ہے۔

76- شاپنگ کے لیے جاتی ہیں تو پہلے کس کا
خیال آتا ہے؟
اگر آپ کی شہرت کو زوال آ جائے تو؟
ہر عروج کو زوال ہے۔ اللہ جب دے تو شکر ادا کرو
اور جب نہ دے تب بھی شکر ادا کرو۔ بس مصیبت میں
سب کچھ پینل کرنا آنا چاہیے۔

77- کب ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کرتی
ہیں؟
جب میں کوئی اچھا اور نیک کام کرتی ہوں تو بہت
خوش محسوس ہوتی ہے، وہ دن میری زندگی کا بہت خوب
صورت دن ہوتا ہے۔

78- کبھی چھپ چھپ کر کسی کی باتیں نہیں؟
نہیں، کبھی نہیں..... اور جب میں محسوس کرتی ہوں
کہ کوئی پرائیوٹ بات کرنا چاہ رہا ہے تو میں وہاں سے یا تو
اٹھ جاتی ہوں یا پینڈ فری کا ٹون میں لگا لیتی ہوں۔

79- کبھی تنہائی میں کسی کو یاد کر کے رونا آیا؟
بہت زیادہ..... کیونکہ معلوم ہے کہ قیامت آ جائے
گی مگر جانے والے واپس نہیں آئیں گے۔ بہت روتی
ہوں، بہت زیادہ۔

80- فلم، ڈراما اور کمرشلز کی تعداد؟
کافی ہے۔ ان شاء اللہ آپ کو بتا دوں گی۔
81- اگر آپ کو کسی سلسلہ بندی کا انٹرویو کرنے کو
کہیں تو آپ کا پہلا انتخاب؟
بہت سارے ہیں اور بہت اچھے سے کر سکتی ہوں۔
قوی انگل کا کرتا جا ہوں گی وہ تو آئینہ ہیں ہماری۔

82- نیند کی بیماری ہے؟
بہت ہی بیماری۔ نیند آ جانے تو دنیا کی ہر چیز سائیز
پر کر دیتی ہوں۔ نیند کے لیے کوئی کمر و مائز نہیں کر سکتی۔
83- نیند والا خواب جس نے بہت ڈسٹرب کیا
ہو؟
کبھی کوئی ڈراؤنا خواب آ جائے تو..... ورنہ تو کوئی
خواب پریشان نہیں کرتا۔

58- کوئٹہ لوور ہیں یا فوڈ لوور؟
وہ تو کھانا زیادہ پسند ہے مگر جیسا کہ کہا کہ میں
کوئٹہ بھی بہت اچھی کر لیتی ہوں کیونکہ ہمارے گھر میں
سب کو کھانا پکانا پڑتا ہے۔

59- کون سا رول کرنے کی خواہش ہے؟
کچھ ایسا جس میں درد ہو اور ہمارے معاشرے کی
عکاسی ہوتی ہو۔

60- آپ کا ناٹا قبل فراموش کر دیا؟
نہیں ابھی تک تو کوئی نہیں ہے۔

61- کوئی رول جو کرنے سے انکار کیا ہو؟
نہیں..... منہ نہیں کرتی لیکن یہ ضرور دیکھتی ہوں کہ
اداکاری کا مارجن کتنا ہے۔

62- کس خاتون سیاست دان سے ملنے کی
خواہش تھی؟
بے نظیر بھٹو سے مجھے ملنے کا بہت شوق تھا۔

63- مرد خوب صورت ہو یا کیا ہو؟
دونوں خوبیاں ہو جائیں تو کیا فانی بات ہے۔

64- آپ کی فوڈ چیلنج؟
اپنے آپ کو ایک بہترین انسان دیکھنا چاہتا ہوں۔

65- کبھی آنکھوں سے کون سا خواب بار بار
دیکھتی ہیں؟
تھوڑی حقیقت پسند ہوں لاہور پر برقی تار
ہوں۔ خواب نہیں دیکھتی۔

66- پسندیدہ فوڈ اسٹریٹ؟
کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں جا کر آپ بھل کھانا کھاؤں۔
لاہور فوڈ اسٹریٹ میں کئی بار کھانا کھایا کیونکہ لاہور لاہور
ہے۔

67- اگر میک اپ ایجاد نہ ہوتا تو؟
تو ہم نہ کرتے..... یاہو۔

68- شادی کیوں ضروری ہے؟
میاں بیوی کا رشتہ بہت خوب صورت ہوتا ہے اور
بے اللہ کا حکم بھی ہے اور شادی میں بہتری بھی ہے..... ورنہ

69- کوشش کرتی ہوں کہ کسی سے بات نہ کروں، کیونکہ
غصے کی حالت میں آپ بہت کچھ بلا سٹ کر دیتے ہیں۔
48- نی وی کے ٹاک شو کے بہترین اسٹکر؟
فیصل قریشی، اقرار الحسن اور بھی کافی ہیں۔

49- نصیحت جو بری لگتی ہے؟
نصیحت مجھے کبھی بری نہیں لگتی۔ نصیحت کرنا تو اچھی
بات ہے۔ زندگی میں کام آتی ہے۔

50- جوائنٹ اکاؤنٹ یا سنگل..... کیا پسند
ہے؟
دونوں ہی ٹھیک ہیں۔ مگر مختصر ہے کہ جوائنٹ
اکاؤنٹ کس کے ساتھ ہے۔

51- ایک ڈیٹ جو بھول نہیں سکتیں؟
مجھے تاریخ یاد نہیں رہتی۔

52- کھانا..... کوئی چیز جو کسی بھی وقت کھا سکتی
ہیں؟
کھانا تو نہیں..... لیکن بھجور پسند ہے اور کبھی بھی
کھائی جا سکتی ہے اور اس کے فائدے بھی بہت ہیں۔
ہماری سوچ سے زیادہ۔

53- اپنی پرفارمنس میں کیا کی نظر آتی ہے؟
بہن! کبھی مجھے بہت محنت کی ضرورت ہے، ابھی
وہ نہیں کر پاتی جو میں کرنا چاہتی ہوں۔

54- اپنا ڈراما دیکھ کر کیا سوچتی ہیں؟
میں کبھی بھی اپنے کام سے مطمئن نہیں ہوتی، اپنی
غلطیاں ان کا کرتی رہتی ہوں اور کینے کی کوشش کرتی ہوں۔

55- کس چینل پر ریمورٹ رک جاتا ہے؟
کاؤن چینل پر یا جس چینل پر میرا ڈراما آ رہا ہو۔

56- پہلی فلم جو تینا میں دیکھی؟
پہلی فلم "چوڑیاں" دیکھی تھی۔ صابریہ بیگم اور معمر رانا
کی فلم تھی اور دوستوں کے ساتھ فلم دیکھی تھی۔

57- کبھی ان کے ساتھ کام کرنے کا اتفاق
ہوا؟
جی ہوا اور جب ان کے ساتھ کام کیا تو بہت اچھا
لگا۔



مَعْرُوفٌ مُصَنَّفٌ

عابد احمد سے ملاقات

جب انسان یہ سوچ لے کہ اسے کچھ کر کے دکھانا ہے، کچھ بن کے دکھانا ہے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اس کے ارادوں کو بدل نہیں سکتی اور کوئی رکاوٹ اس کی راہ میں حاصل نہیں ہو سکتی۔ ”عابدہ احمد“ کو کل تک ڈراموں کی دنیا میں کوئی نہیں جانتا تھا..... لیکن آج وہ ایک کامیاب ڈرامہ نگاری کے حوالے سے جانی پہچانی جاتی ہیں۔ کیونکہ ان کے سیریلز اور سوپ بہت پسند کیے جاتے ہیں۔ آج کل ان کا ایک سوپ ”دفا کر طے“ آن ایر ہے۔

”کیسے مزاج ہیں عابدہ صاحبہ؟“

”جی احمد اللہ۔“

”کچھ اپنے بارے میں بتائیے؟“

”جی ضرور..... میرا تعلق ایک مڈل کلاس فیملی

”بچپن میں کسی تھیں، شرابی باز ہا کو؟“
 ”بچپن میں میں نے شرارتیں نہیں کیں، ایک
 بیچیدہ، کم گو اور بڑھاکو ٹائپ کی بچی تھی۔ جو اپنی کلاس
 میں فرسٹ آئی تھی اور مجھے بچپن سے ہی مطالعہ کا
 شوق تھا۔“

”آج کل کیا مصروفیات ہیں۔ کیا آن ایئر

ہے۔ کیا انڈر پروڈکشن ہے؟“

”جی..... آج کل میرا ایک سیریل ”دفا کر
 جے“ ہے۔ ”نی وی سے آن ایئر ہے اور ابھی حال ہی
 میں ”جیو“ کے لیے ایک سیریل مکمل کیا ہے اور کچھ ہی
 دن پہلے ”ای بلس“ کے لیے ایک ڈرامے کی شوٹ
 شروع ہوئی ہے۔“

”آپ کے آن ایئر ڈراموں کی تعداد؟“

”جاؤ راجے آن ایڑ آجکے ہیں۔“ ”ہم“ سے
 ”سانوری“ اور ”خفا کر چلے“ اور ”اے آروائی“ سے
 ”حسد“ اور ”اے طمس“ سے ”میرا کیا تصور“ آن ایڑ
 آجکے ہیں۔“

”تک سے لکھنے کا عمل جاری ہے اور ڈراموں

تک یعنی ٹی وی تک رسائی کیسے حاصل ہوئی؟“

”میں۔“

”گندہ..... یقین تھا کہ کامیابی ملے گی؟ اور پہلا
ڈرامہ کون سا تھا اور گھر والوں اور دیگر لوگوں کو کیا
رہنمائی تھی؟“

”یقیناً یہ ہی سارے کام ہوتے ہیں۔ مجھے تو اس فیلڈ میں کوئی چانتا بھی نہیں تھا اور نہ میں اتنے لوگوں سے واقف تھی اور نہ ہی راتے دکھائی دیتے

تھے۔ میں نے تو کچھ بننے کا سفر ”زیر“ سے شروع کیا۔ ایک یقین تھا کہ میں کچھ کر سکتی ہوں اور کروں گی اور یہ فضل خدا سب کچھ ٹھیک ہوتا چلا گیا.....

میرا پہلا ڈرامہ سانوری تھا جو بہت مقبول ہوا۔

اور بیسٹ سوپ آف دی ایئر کا ایوارڈ بھی ملا، گزشتہ

ہے..... کیوں؟“

”جی۔ یہ بات بہت حد تک ٹھیک ہے کہ ہیروئین کو اور ہیرو کو بہت خوب صورت دکھایا جاتا ہے۔ ہیروئین اچھی نہیں ہوگی تو ناظر فوراً کہہ دے گا کہ ”یار یہ کیا ہے۔ فضول لڑکی لے لی۔ ہمارا ناظر خوب صورت دیکھنا چاہتا ہے اس میں اتنی پیچیدگی نہیں ہے کہ کسی بد صورت یا تھوڑی سی موٹی لڑکی ہیروئین کے طور پر برداشت کر سکے۔“

”کیا لکھتا آسان ہے..... اور لکھتے ہوئے کیا کیفیت ہوتی ہے؟“

”لکھنا ایک تخلیقی عمل ہے جو کہ ایک پروسس ہے۔ کبھی یہ آپ کو رلاتا ہے کبھی ہساتا ہے کیونکہ جو کچھ میں لکھ رہی ہوں تو محسوس کرتے سب کو بے وقوف لاکر رکھتے ہوں۔ مطلب جو آپ اسکرین پر دیکھتے ہیں وہ سب میں اپنے دماغ کی اسکرین پر دیکھ چکی ہوتی ہوں، تو مجھے لکھنے میں مزہ آتا ہے۔ ہاں کبھی کبھی بور بھی ہو جاتی ہوں کہ کچھ نیا لکھنے کو نہیں ملتا۔“

”کبھی ایسا ہوا کہ دل سے لکھی ہوئی تحریر مقبول نہ ہوئی ہو؟ اور دل سے نہ لکھی ہوئی تحریر مقبول ہوئی ہو..... اور پورا لکھ کر دیتے ہیں؟“

”میں نے ہمیشہ دل سے لکھا، جب سانوری چلا تھا تو میں ایک دن میں دو اقساط لکھتی تھی اور ساتھ ساتھ شوٹ بھی ہو رہا ہوتا تھا۔ اے پلس کہ ”میرا کیا قصو“ بھی پانچ اقساط کے بعد شوٹ پر چلا گیا تھا اور میں نے ساتھ ساتھ لکھا تھا۔ حسب بھی پانچ اقساط کے بعد شوٹ پر چلا گیا تھا اور اب ”وفا کر چلے“ بھی آن ایئر بھی ہے اور میں ساتھ ساتھ لکھ بھی رہی ہوں۔“

”کن موضوعات پہ لکھنا بہت اچھا لگتا ہے۔ کیا جینیل والوں کی ڈیمانڈ ہوتی ہے کہ مظلوم عورت؟“

”مجھے روٹینس، سوشل ایڈیٹوز، ایڈوکیٹ اور تھرٹلک جیسے موضوعات پہ لکھنا بہت اچھا لگتا ہے۔ جی بالکل

جینیل کی ڈیمانڈ ہے مظلوم عورت۔ دیکھیں دنیا میں یا تو حسن بکنا ہے یا آفسو بکتے ہیں اور میں ایک مزے کی بات بتاؤں کہ ”حسد“ ڈرامے کا جو پہلا سین تھا، اس میں ہیروئین بڑک ہے ہاتھوں میں ہندی لگا کر کھڑی ہے اور سڑک پار نہیں کر سکتی، ہیرو آکر اسے سڑک پار کر دیتا ہے، یہ سین کامیٹ کا تھا کہ ہمیں دکھانا ہے کہ وہ لڑکی کتنی dependent ہے کہ سڑک بھی خود سے کراس نہیں کر سکتی اور میرا یہ اعتراض تھا کہ ایسی لڑکی جو ”کواکویٹیشن“ میں پڑھ کر لو میرج کر چکی ہے۔ اتنی ڈرپوک کیسے ہو سکتی ہے کہ سڑک بھی خود سے پار نہ کر سکے۔ مگر جینیل نے اپنی مرضی کی اور وہ سین ڈالا۔“

”آج کل کے رائٹرز میں کس سے بہت متاثر ہیں؟“

”سب سے زیادہ تو میں صائمہ اکرم جو پوری سی ہی متاثر ہوں۔ پھر فائزہ افتخار ہیں۔ خلیل الرحمن قمر ہیں، لیکن ان جیسا لکھنے کی خواہش نہیں ہے، میں اپنے ہی اسٹائل سے لکھتی ہوں اور مجھے ڈرامے میں ڈھیر سارا ڈرامہ ڈالنا پسند ہے۔ صائمہ اکرم اور مصطفیٰ آفریدی کے ڈرامے میں نہیں کرتی۔“

”آپ کے مایا صاحب اور سسرالی فیما آپ کے ڈرامے پسند کرتی ہیں؟“

”دراصل میری شادی کسی پاکستانی بیک گراؤنڈ والے گھرانے میں نہیں ہوئی بلکہ مختلف پھر اور بیک گراؤنڈ میں ہوئی ہے جہاں میرے مایا سمیت کوئی بھی اردو سمجھنے بولنے والا نہیں ہے۔ میں ان اپنے مایا کو ساتھ بٹھا کر اپنا ڈرامہ دکھاتی ہوں اور ساتھ ساتھ انگلش میں انہیں سمجھا بھی رہی ہوتی ہوں کہ کون کیا کہہ رہا ہے..... ہیرو اور بھی شوق سے یونیٹ پر میرے ڈرامے فالو کرتا ہے اور پھر کال کر کے پوچھتا ہے کہ اس ڈرامے میں ہوا کیا ہے۔ ہاں میرے میکے اور محلے میں سب شوق سے میرے ڈرامے دیکھتے ہیں اور دل کھول کر سراہتے ہیں۔“

”ہوں گڈ..... مزاج کی کیسی ہیں آپ؟ لکھائی

گھر کو اسٹرپ کرتی ہے؟“

”میں مزاج کی نرم گرم ہی ہوں، سردی گرمی چلتی رہتی ہے اور یہ کچھ ٹین ہے۔ مصر ہے ویسے برداشت کا مادہ ہے۔ کچھ ہیں اگر کرنا چاہوں تو بڑی سے بڑی بات برداشت کر جاتی ہوں۔ وہ نہ چھوٹی سی بات کو لے کر موڈ آف ہو جاتا ہے..... لکھنے کا اثر ٹیلی ٹائم پر پڑتا ہے۔ اگر کوئی ہوتے ہیں۔ مگر صرف تین چار شخصوں کے لکھنے کی وجہ سے مایا کا موڈ آف ہو جاتا ہے، اس لیے فون اور لپ ٹاپ کو زیادہ ہاتھ نہیں لگاتی۔ سارا ٹائم بچوں اور مایا کے ساتھ گزارتا ہے..... اور میری ٹیلی میں اور کسی کو لکھنے کا شوق نہیں ہے۔“

”اور کیا کیا شوق ہیں آپ کو؟“

”مجھے میوزک دیکھنا پسند ہے۔ کھیلوں سے دور کی چیزیں دیکھنا نہیں۔ ہاں مارشل آرٹس کرنا پسند ہے۔ سونگ اور باسکٹ بال اینڈ آف چلتے ہیں..... مجھے آن لائن شاپنگ اور ڈائننگ رننگ کا گریز ہے۔ میں بازاروں کی خاک کھجی نہیں چھاتی۔ سب کچھ آن لائن آرڈر کرتی ہوں یا ایک مخصوص شاپنگ مال میں چلی جاتی ہوں۔“

”اور آخری میں کچھ کہنا چاہیں گی؟“

”آخر میں میرا یہی پیغام ہے کہ ہم قوم کے بجائے ایک جھوم بن چکے ہیں۔ جو ذہن کے بجائے جذبات سے سوچتا ہے، اب یہ جذبات چاہے مذہبی ہوں یا پرسنل، ہمارا دین اعتدال پسند ہے۔ ہمیں ہر چیز میں معتدل رہنے کا حکم ہے۔ اپنے رویوں اور جذبات میں اعتدال پسند اور توازن پیدا کریں، سوچ کو وسعت دیں، مطالعہ کو عادت بنائیں۔ دین میں جبر نہیں ہے اس لیے کسی پہ جبر مت کریں۔ تبدیلی اپنے اندر سے شروع کریں۔ زندگی میں ایک کول رہیں اور اسے پانے کے لیے محنت کریں..... کام کام اور صرف کام کے قول پہ عمل پیرا رہیں۔“

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے عابدہ احمد سے اجازت چاہی۔

☆

ہیونی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیر آئل

SOHNI HAIR OIL

- کرتے ہوئے بال کو روکتا ہے۔
- بے بال آگاتا ہے۔
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے
- یکساں ملتا ہے۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔



قیمت:- 150/- روپے

سوہنی ہیر آئل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ توڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے۔ ہذا ہیر آئل یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں کر سکتی ہیں یا تو خریدنا ہوگا یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں کر سکتی ہیں۔ ہذا ہیر آئل 150/- روپے ہے، دوسرے شہروں کے لیے ڈسٹری بیوٹر کے ذریعے دستیاب کر سکتے ہیں۔

- 2 بکٹوں کے لیے 400/- روپے
- 3 بکٹوں کے لیے 600/- روپے
- 6 بکٹوں کے لیے 1100/- روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچہ اور پیکنگ چارج شامل ہیں۔

منی آف بھجنے کے لیے ہمارا پتہ:

ہیونی بکس، 53- اورنگرہ مارکیٹ، کنڈھو رام پورہ، جٹاں روڈ، کراچی
 دمشق خریدنے والے حضرات سوہنی ہیونی آئل ان جیکبوں سے حاصل کریں
 ہیونی بکس، 53- اورنگرہ مارکیٹ، کنڈھو رام پورہ، جٹاں روڈ، کراچی
 کتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
 فون نمبر: 32735021



نادرہ خانگلوں



خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- از رو بازار کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com

سمانہ نقوی..... کراچی

خواتین ڈائجسٹ طالب علی کے زمانے سے پڑھ رہی ہوں۔ بہن سنی کے بعد ”کیسارو پانچ“ انشاء جی کے بارے میں پڑھا۔ انٹرویو میں عینہ مہد سے ملاقات بہت اچھی رہی۔ پلیئر آپ انٹرویو میں ان کا برون یا اشار بھی ضرور پوچھا کریں۔ ناول قسط وار میں ”چلتی جیسا پیاز“، ”رنگ ریز میسرے“، ”عفت سحر اور راحت جبین اچھا لکھ رہی ہیں۔“ ”شرگ“، ”چلی بیا کی حویلی“، ”دونوں مکمل ناول اچھے لگے۔ چلی بیا کی حویلی کافی رومانک تھا۔ ناول ”بندھن“ اچھا اور سبق آموز تھا۔ سیراگل نے بہت اچھی کوشش کی اور اینڈر ٹھیک رہا۔ افسانے ”زرخیز مٹی“ قرۃ العین خرم ہاشمی، صبا شوکت۔ ”سال نو کا تختہ“ حمیرا اشقیق سبق آموز تھے۔ ام ہانی ذرا مختلف تھا۔ ”بھولی ہوئی“ عندلیب شہانہ کی تحریر نے متاثر کیا۔ شیا کے

بارے میں تھی۔ ماضی کی خوب صورت اداکارہ۔ ہمارے والد بھی شریا کی فلمیں دیکھتے تھے۔ وہ بتاتے ہیں کہ شریا نے شاید شادی نہیں کی تھی اور ان کی ایک کوئی نانی ان کے ساتھ اسٹوڈیو آتی تھیں۔

باورچی خانہ میں گڑیا رانچیت نے اپنی نانی کو کسی کی بہت تعریف کی، بھی ان کی کو کسی کی ترکیب شیر کریں۔ بیوی کس تو ہے ہی اچھا۔

☆ سمانہ جی! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ کے نانا ٹھیک بتاتے ہیں۔ دراصل شریا اپنے ساتھی اداکار دیو آئندہ سے شادی کرنا چاہتی تھیں۔ ان کی نانی نے یہ شادی نہیں ہونے دی۔

دیو آئندہ نے کلپنا کارنک سے شادی کر لی اور شریا نے اس کے بعد شادی نہ کرنے کی قسم کھالی۔ انہوں نے عین مقبولیت کے عروج پر ہی دنیا چھوڑی اور ساری عمر تنہا گزاری۔

عینہ مہد کا اشار کیسری کارن (جدی) ہے۔
باجرہ عمران خان..... لاہور

”ہمارے نام“ میں ناہید اسلم کی صلیب (بہنا) آپ کو میرا تبصرہ اچھا لگا، جس پر مجھے حیرت ہوئی آپ کا تبصرہ ہمیشہ جان دار ہوتا ہے۔ بانی سب تبصروں کے تبصرے بھی ہم بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ تعارف بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ بہن سنی میں مدبر صاحب کی باتیں پڑھنا اور سننا اچھا لگتا ہے۔ اس بار سب دعاؤں کے لیے آئیں، نرم آئیں۔
نسیبہ بنت سراج لکھنؤ، جی کی شان میں خوب تحریر لکھی۔

”ہماری خشک آنکھوں میں جھانکنا کھل نہ بولا، پر کیا بتائیں، کیسارو پانچ۔

کرن کرن روٹی سے فیض یاب ہو کر ہم کہانیاں اور افسانوں کی دنیا میں گم ہو گئے۔ اس بار افسانوں سے زیادہ جان دار ناولز رہے۔ دونوں مکمل ناول بے حد خوب صورت انداز بیان سے تحریر کیے گئے۔ جان دار مکالمے اور بغیر جھول کے چوہینتر نے ہمارے اندر کے قاری کو خوب مطمئن کیا۔ شمیمہ فرخان کا ”شرگ“ زبردست رہا۔ ان کو خراج تحسین۔

سحر خان بھٹو کا مکمل ناول ”بوا سہیلی چلی بیا کی

”مٹی“ زبردست رہا۔ یقین مایہ عرش جی کو سردار بانو ایک کہہ ہے، اس بات کا اندازہ انجام تک نہ ہو سکا، ویسے آپ نے ناول کی تمام تحسینوں کو بہت اچھے سے سکھلا اور اہام تک پہنچایا۔

سیراگل کے ناول ”بندھن“ سے بے ساختہ اگہری اور افسری کی یاد تازہ ہو گئی۔ افسانے حسب سابق سادہ اور سبق آموز تھے۔

قرۃ العین خرم ہاشمی کا ”زرخیز مٹی“ موضوع پر اتنا مگر ٹیٹ منٹنی تھی۔ ہارون نے اپنی ماں فرخین کو مضبوط دلیل سے قائل کیا کہ ”جس گھر میں بزرگوں اور بڑوں کا احترام اور خدمت کی جاتی ہے، اس زمین کی مٹی میں اتنی زرخیزی ہوتی ہے کہ وہ آنے والی نسلاں کو سنوار دیتی ہے۔“

صبا شوکت کا ”ام ہانی“ بھی پسند آیا۔ عبدالہادی سکندر جیسے ہوشیار اور خود پسند انسان کو ام ہانی کا بہترین جواب تھا۔
حمیرا اشقیق کا ”سال نو کا تختہ“ بہت ہی کوئی ساتھی اور اخلاقی افسانہ ثابت ہوا۔

عندلیب شہانہ کا ”بھولی ہوئی ہوں داستان“ منفرد اور عام افسانوں سے جٹ کر تھا۔ حقیقت سے کہیں قریب تر مٹی تھا، اچھی کاوش۔ اس بار جاتے ہوئے کسی ناول اور افسانے میں تنقید کا پہلو نہ نکال سکی، چلو اگلی بار سنی۔

عینہ مہد آئی آپ سے مل کر بے حد خوش ہوئی، سنا ہے اس مینے آپ کی ساگرہ بھی سنی تھی۔ آپ کو ساگرہ کی بہت بہت مبارک۔ اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی مراد و صحت عطا فرمائے، آئیں ثم آئیں۔ گڑیا رانچیت آپ اپنے بچن میں خوب مسرور لگیں، آپ اور آپ کا گاؤں اور شہری طرز کا بچن میں خوب بھانجا۔ آپ کی سیدی اور خاں کر کے دل کو لٹی باتیں بھی ہمیں کافی رانچیتانہ۔ مٹی کافی رعب دار لگیں۔ آج پتا چلا کہ کوئی رانچیتو لکھا ہے، مٹی سی ہے، خوش رہے۔

☆ پیاری باجرہ! اتنا اچھا تبصرہ کیا آپ نے کہ دل خوش ہو گیا، بہت شکریہ۔

آپ کا افسانہ ڈیر انٹرسوٹ ہمیں موصول ہوا ہے، جو زبردست ہے۔ دیگر افسانے ابھی پڑھیں ہیں۔

حنا سکیم اعوان، گاؤں آفون ہانڈی تحصیل ضلع ہری پوری ہزار
اسنے ماہ کی غیر حاضری کی جی وجوہات ہیں، ایک یہ کہ کرسالہ دیر سے ملتا ہے، اسے پڑھ کر خط لکھنے تک تاریخ رواگئی سر پر آ جاتی ہے۔ دوسرا یہ کہ مایدولت پڑھائی میں مصروف رہے۔ ایم اے اسلامیات، آخری سمسٹر کے پرچے بھی اللہ کے فضل سے اچھے ہو گئے ہیں۔

جنوری کا آغاز ہے، سردی شدت سے پڑ رہی ہے۔ دور پہاڑوں پر برف کی سفید تہ بچھ گئی ہے۔ پچھلے سال جنوری میں ہمارے گاؤں اور آس پاس بھی برف باری کا چھوٹا سا سلسلہ چلا تھا۔

”بہن سنی“ پڑھ کر مدبر سے اتفاق کیا۔ انشاء جی کے بارے میں جب بیوی پر تار ہے تھے تو میں نے امی ابو کو روکنا تھا کہ شیعاع خواتین کے جو بانی ہیں، ان کے بھائی ہیں۔ اللہ انہیں خرقین رحمت کرے، آئیں۔ ”یہ سال بھی ادا اس رہا“ سروے میں قارئین کے جوابات اچھے لگے۔ شازبہ الطاف ہاشمی کا نام تبدیل تھا اور افسانے اور فہرست میں بھی ناموں کی گڑبڑ تھی۔ عینہ مہد سے ملاقات خوب جی۔ میرے ذہن میں عینہ مہد کی شخصیت کا جو خاکہ تھا یہ اس سے کافی مختلف (یعنی بڑی) نکلیں۔

ہماری ایک بہت پیاری رازجو ہمارے دل کے بے حد قریب ہیں ان کی لکھی پیاری ہی تحریر ”چلتی جیسا پیاز“ پڑھ کے بہت پیارا رہا ہے (بھئی راحت جبین پر)۔ زوہاریہ اور صائمہ انجانے میں بہت غلط کرنے جارہے ہیں۔ ”رنگ ریز میسرے“ عفت سحر کی تحریر پر بہت زرخیز

احسانیں کر رہی کر اس کے والد کو بھی مٹی کے جوڑ کا شہر دیکھنا چاہی تھا۔ ”شرگ“ شمیمہ کی اچھی تحریر ہے مگر مجھے پرنما کا علیشان کو قبول کر لینا ذرا اچھا نہیں لگا۔ یہ کیا بھی جب چاہا رد کر دیا، جب چاہا اپنا لیا۔ ”چلی بیا کی حویلی“ سحرش بھٹو کی تحریر پڑھ کر وہ بہت اچھا مگر پڑھ چکے ہی سی تھی۔ ”بندھن“ میں مہر کا مچھو اور چھو بھڑکی لیکن عام زندگی میں کچھ لڑکیاں شادی کے بعد مہر کو کرا دارا کر دیتی ہوئی نظر آ جاتی ہیں۔ افسانوں میں قرۃ العین خرم ہاشمی کا ”زرخیز مٹی“ اور حمیرا اشقیق کا ”سال نو کا تختہ“ بہترین افسانے تھے۔ نمرہ میری پسندیدہ ترین لکھنے والی ہیں۔ ان کی لکھی ہر تحریر سحر کن ہوتی ہے۔ خطوط میں بہنوں سے

ملاقات کر کے اچھا لگا۔ خاص کر عفت اقبال کراچی کے خط سے کسی پرانے زمانے کی کہانی کا منظر تازہ ہو گیا۔ گل ہما کے نام کو آپ نے نظم کہا بنادیا۔ ”خاتون کی ڈائری“ میں تینوں خواتین (خواتین کہنے پر معذرت) کا انتخاب اچھا لگا۔ کڑیا راجپوت مجھے آپ کا باورچی خانہ بہت پسند آیا۔ ہاں اس سے پہلے ریمانہ چوہدری اور فائزہ جی (آنکھیں) کا باورچی خانہ بے حد بھایا تھا۔ فائزہ آپ کا باورچی خانہ اس لیے بچا اچھا لگا کیونکہ یہ میرے باورچی خانہ سے ملتا جلتا ہے (میں بھی تو ضرور اسی طرحی ہوں)۔

ج: پیاری حنا! آپ نے کافی عرصہ بعد ہمیں خط لکھا، بہت خوش ہوئی۔ اسے لے دو فتنے نہ دیا کریں ہمیں تشویش ہونے لگتی ہے۔

زیر زمری افسانہ قرۃ العین خرم ہاشمی نے لکھا تھا سہواً شاز یہ الطاف ہاکی کا نام لگ گیا۔

اللہ تعالیٰ آپ کو امتحان میں اچھے نمبروں سے کامیاب دے، ہماری دعا میں آپ کے ساتھ ہیں۔

تبرہ بہت محبت ہے، بہت شکریہ۔

محمد امجد شیر حسین ڈنگہ

سال کا پہلا شمارہ جتنی جنوری 2020ء کا خواتین دس کولا۔ ناٹل تو خوب صورت تھا ہی پڑا دل کی جیہڑی تو بہت ہی خوب صورت۔ ”کبھی سنی“ مدیر نے لفظ لفظ سچ لکھا۔ کرن کرن روشنی ہمیشہ ہی فہور تے رہے گا۔ انٹرویو میں عزیزہ سید سے ملوا کر شائیں آپ نے دل ہی خوش کر دیا، بس اب نبیلہ عزیز، نرہ احمد، میراجید، ام مریم اور فرحت اشتیاق کو بھی پکڑ لائیں۔ یہ سال بھی اداں رہا۔ سب کے جوابات پسند آئے سوائے اپنے..... سلسلہ وار ناولز میں عالم تو ہے ہی زبردست ہے جتنی زبردست۔ راحت اور عفت نے جتنی اسے سچ میں جکڑ رکھا ہے، وہی گلدے ”چلی پیا کی حویلی“ از عرش بھگو نے ناول مجھے بے حد پسند آیا کیونکہ اس میں پٹری کا استعمال تھا۔ مجھے ایسی کہانیاں زیادہ پسند ہیں جس میں پٹری ہو۔ ”بندھن“ سمیرا عین کا کافی وقت بعد آئیں اور چھائیں۔ افسانے سارے ہی زبردست تھے۔ ”ہمارے نام“ سے سہا سہا سہا، فائزہ بھٹی، باجرہ عمران، ام العانم نے اظہار کیا۔ حوزہ یہ کسی ہو؟ پیاری آئی! میری ماحبت پیار ہیں ان کی خواہش ہے کہ میں بھی خواتین میں بطور رائٹر نام کاؤں، وہ درد و

کتنی رہتی ہیں کہ ایک بار پھر کوشش کرو پر مجھے معلوم نہیں کہ میں کر سکتی ہوں کہ نہیں.....

☆ پیاری نسیم! آپ کو پورا پورا جانی بہت پسند آیا۔ یہ جان کر بہت خوش ہوئی۔ آپ کی بہن کو پرچے میں کوئی تحریر ابھی نہیں لکھی اور آپ کو کوئی تحریر بھی نہیں لکھی، یہ افسانہ بھی خوب ہے۔

آپ کہانی ضرور لکھیں اگر اچھی ہوئی تو شائع نہ کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اچھی تحریروں کا تو ہمیں ہمیشہ انتظار رہتا ہے۔

مگل..... مردان

خط شائع نہ ہوا تو تھوڑی مایوسی ہوئی اور زیادہ دکھ ہوا، زیادہ دکھ کی وجہ بتاتی ہوں۔

پچھلے ماہ میری آنکھوں میں انگلیکھن ہوا تھا، آئی اسپیشلسٹ سے رجوع کیا تو میڈیسن کے ساتھ کچھ بھی پڑھنے سے سخت سے منع کیا اور ہم نے عملیہ پڑھنے کی طرح ڈاکٹر صاحب کی تاکید پر باندی سے منسلک کیا۔ کچھ بھی نہ پڑھا۔ صرف پیارے خواتین ڈائجسٹ کو پڑھا۔ آپ انگلیکھن کریں جس نام میں خط لکھ رہی تھی، آنکھوں سے منسلک پانی بہہ رہا تھا۔ مگر پروا کتنی تھی (کیونکہ آپ کو خط میں میرے آنکھوں میں آئے) ہا۔

میں نے اپنے چھوٹے سے صحن میں موسیٰ بیٹیاں لگا رکھی ہیں، اس موسم گرما میں اپنے گھر کی تو ریاں نہ صرف خود کشاں ہیں بلکہ باری باری سب میں بائیں بھی اور یقین چاہیے اتنی لذت بخشی میں کلا لوگ بار بار فرمائش کر کے منگواتے تھے۔

چوڑی مرغیں، ہرا دھنیا پودے، پتنگن یہ خالص میرے صحن کی پیداوار ہے۔ امرود اور ابلہ پودے اب ماشاء اللہ سے جڑ پکڑ چکے ہیں۔ انگریز بیل نے تو کچن کی بیرونی دیوار پر ڈھانچا پی ہے اور بیگنوں اور آم کے پودے ابھی ننھے ننھے ہیں۔

☆ پیاری گل! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ نے اتنی تکلف کے عالم میں ہمیں خط لکھا اور وہ شائع نہ ہوا لیکن ہم بھی کیا کریں۔ آپ کے خط ہمیں وقت پر نہیں ملتے جنوری کے سروے کے لیے لکھے آپ کے جواب بھی پرچہ پر لیس جانے کے بعد موصول ہوئے۔ اس لیے شائع نہ ہو سکے حالانکہ آپ نے بہت اچھے جواب لکھے

آپ کا پہلا سا آگن ہمیں بہت اچھا لگا۔ تازہ ہوا، ڈیری، دھنیا، پودے، ہری مرغیں سب کچھ میں دلچسپ۔ آسانی کے ساتھ ساتھ تازہ اور سحرے دار سی۔

خواتین ڈائجسٹ سے آپ کی محبت کی ہمارے دل میں بہت قدر ہے۔ تہہ دل سے شکریہ۔ اب اپریل کے ساتھ گھر میں قارئین سے سروے شامل ہوگا۔ آپ ہلکی ہلکی باتیں شامل ہو سکیں۔

فریح عزیز بیچ..... کندہ یارو

آج خط لکھ رہے تھے ایک قاری ماما شیر حسین ڈنگہ نے مجھ پر کیا ہے۔ انہوں نے اپنے خط میں لکھا، نرہ کے ناول ”حالم“ کے بارے میں کہ اگر یہ چوری چکاری والی وقت میں پیچھے جانے والی داستان کسی نئی رائٹر نے لکھی ہوئی تو آپ نے سو فیصد ریجیکٹ کر دی تھی۔ کہ بھلا ایسا کیاں ہوتا ہے؟ تو ماما صاحبہ کوئی اور آپ کی اس بات سے ابھری کہ کہہ نہ سکیں کہ میں ضرور کرتی ہوں۔ پرانی رائٹر بھی کچھ لکھ دیں، وہ (ایلا) (دارے) کے لیے شاہکار ہوتا ہے اور نئی رائٹر کوئی بہترین اسٹوری بھی لکھ دے تو وہ ان کے لیے بے کار ہوتی ہے جیسے کہ میری کہانی دو سال ہونے کو آئے ہیں مگر میری کہانی کا کچھ پتا نہیں کہ وہ چھپے ہوئی یا نہیں۔

☆ پیاری فریح! ہم جو کہانیاں شائع کرتے ہیں، وہ کلاسیک کی پسند نا پسند کو سامنے رکھ کر شائع کرتے ہیں۔ نرہ بھی تحریریں پسند کرنے والوں کا ایک بڑا حلقہ ہے۔ اور ان کا ناول عالم کی بہت پسند کیا جا رہا ہے۔

جہاں تک آپ کی کہانی کا تعلق ہے۔ ہمیں اس میں تاثر کی نظر آئی۔ آپ اسی کہانی کو دوبارہ لکھ کر لکھائیں۔ دوبارہ لکھیں گی تو یہ کہانی مزید بہتر ہو جائے گی۔

جینینا..... کراچی

نئے سال کا پہلا خواتین ڈائجسٹ ہاتھ میں آیا۔ بلکہ میک اپ اور خوب صورت جیہڑی کے ساتھ پیارا چہرہ آگے پڑے، پتا لکھا اور کھینچا ہوا دیکھنے لگے مگر افسوس کچھ نہیں، ایک بار پھر لائڈھی کے پوسٹ آفس والوں کے لیے دل سے آگے۔ اکتوبر 2017ء اس کے چند ماہ بعد دوسرا افسانہ ”ہوئے ہم جو رسوا“ میں افسانہ

”مہارانی“ کے نام سے بھیجا اور آئی دونوں پرچوں کا تبصرہ بھیج سکتے ہیں یا نہیں۔ سوچا تھا لکھنے کو ذریعہ معاش بنالوں۔ رجسٹری کا ڈاک خرچ بہت ہوتا ہے سو سب سے پہلے ان تمام بہنوں کا شکریہ جنہیں میرے چند الفاظ پسند آئے اور ان کے چہروں پر مسکراہٹ آنے سے میری محنت وصول ہوگی۔ الحمد للہ عزیزہ سید سے مل کر مزہ آیا۔ افسانے اچھے تھے۔ ”ام ہانی“ اور ”بھولی ہوئی داستان“ زیادہ اچھے رہے کڑیا راجپوت سے مل کر ان کا باورچی خانہ بھی دیکھ لیا۔ زبردست اپنی کڑھی کی ترکیب بھی دے دیتیں تو اور اچھا ہوتا۔ ”بندھن“ کا ایڈ بہت اچھا لگا۔ وہ بھی لکھنا اپنی ایڈ پراچھی لگتی ہیں۔

☆ جینینا! آپ کی دیگر کہانیاں تو ہمیں موصول نہیں ہوئیں۔ مہارانی موصول ہو چکی ہے۔ ابھی پڑھی نہیں گئی۔

ہمیں بے حد افسوس ہے کہ جنوری کے شمارے میں آپ شامل نہ ہو سکیں۔ پتا نہیں کیا وجہ ہے کہ خطوط اور دیگر ڈاک اب بہت تاخیر سے موصول ہو رہی ہے۔

آپ آپ لکھانے میں خواتین، کرن اور شعاع کے لیے خط اور دیگر سلسلوں کا انتخاب مجھواسکتی ہیں اور بذریعہ رجسٹری نہیں بلکہ آرچنٹ سہل سروس کے ذریعے بھیج سکتی ہیں۔ آرچنٹ سہل سروس کے ذریعے ڈاک جلد مل جاتی ہے۔ ہر سلسلے کے لیے علیحدہ کاغذ استعمال کریں۔

عاصمہ زبیر خان..... میانوالی

آپ نے پہلے میرا ساڑھ رضا کے ناول جمال زہرا (2018ء) میں شائع ہونے والا ناول پر تبصرہ شائع نہیں کیا، بہت بڑھا لکھا جامع تبصرہ تھا (جی ہاں)۔

جمال زہرا میں ساڑھ رضا نے فتنہ عورتوں کے تذکرے لکھا مگر میں جتنی ہوں فتنہ عورت کے گھر سے باہر نکل کر تاغمر سے ملاقاتیں تھا۔ میں ہمیشہ سے خواہش مند تھی کہ جب بھی لکھوں گی تو تمہیں اکرم سے دکھ کا اظہار کروں گی۔ تمہارا معجز ہمارا معجز تھا، جس کی شایگ کا تذکرہ عید کے سروے میں تھا۔ کچھ عرصہ بعد وہ نہیں رہا۔ شاز بہ چوہدری، فرحانہ ٹالک، آسیر زبانی، نو بہ جہانگیر چلی گئیں۔ اب ان کی پرانی کہانیاں ہی شامل کریں۔ میں معزز وصالوں سے باقاعدہ قاری ہوں۔ کچھ تحریریں اس آموز مصنفات کی جاسوسی کہانیاں لگتی ہیں۔ کچھ بار بار یا بہت

فروری 2020ء
کشمیر کی ایک جنگ



شعاع

فروری 2020

کشمیر شائع ہو گیا

”شرگ“ شمیمہ فرحان کامل ناول

”پلی پلکی حویلی“ سحر خان بیٹو کامل ناول

”بندھن“ سمیرا عثمان گل کاناوٹ

”حالم“ محمد احمد کاناوٹ اختیاری مراحل میں

”راحت“ جمیں اور عفت حطرطہ کے ناول

”قرۃ العین خرم ہاشمی، حمیرا شفیع، اُم ہانی، اور عندلیب شاہانہ کے افسانے

”آپ کی پسندیدہ مصنفہ ”عصیزہ سید“ سے ملاقات

”ماڈل اور فنکارہ ”عالیہ علی“ سے باتیں

”جب تجھ سے نانا جوڑا ہے“ قارئین کے تجربات

”بیارے نمی“ شمیمہ کی بیاری باتیں“ احادیث کا سلسلہ

”خدا آپ کے باتوں سے خوشبو آئے، تارن کے جھروکوں سے اور دیگر مستقل مستقل سلسلے شامل ہیں

شعاع ہر ماہ پوری محنت سے ترتیب دیتے ہیں لیکن آپ کے خطوں بتاتے ہیں کہ ہم اپنی محنت میں کتنے کامیاب ٹھہرے، ہمیں خط لکھنا نہ بھولیے گا۔

شعاع فروری 2020 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

پیغام محبت ان تک پہنچا رہے ہیں۔
فرزانہ کھل گئی مشکل پسندی کے باوجود ان کی
تحریریں پسند کی جاتی ہیں۔ ہم ان سے درخواست کریں
گے کہ انہی تحریروں کو کھوڑا سا واضح اور آسان انداز میں
لکھیں۔ لیکن یہ تو مائیں کہ ان کی تحریروں میں بہت کشش
اور جاذبیت ہے۔

نایاب جیلانی کے بھائی رہا ہو چکے ہیں اور شادی ان
کو رہا ہوئے، تین سال کا عرصہ بھی گزر چکا ہے۔ پرانی
تحریروں کی فرمائش ضرور پوری کریں گے، بس تھوڑا سا
انتظار۔

سیدہ بخاری اینڈ بخاری سسرز..... موضوع فاضل شاہ
کبیر والہ

کرن، خواتین شعاع سے تعارف تو بہت پرانا
ہے۔ بڑے مفتے مار کے پڑھے ہیں رسالے۔ دراصل
ہمارا اولڈ ٹیکنک جو رسالوں کی خریداری کرتا تھا، وہ شادی
شدہ ہو گیا ہے (مطلب آپایاں اور بھابیایاں) اب ان
کے شوہر لا تو دیتے ہیں، پر اپنی مرضی سے۔ شام کو لے
آؤں گا، صبح لے آؤں گا، اوہ بھول گیا اور کبھی قسمت
مارا یاد رہے بھی جائے تو ہم تک پہنچنے میں نہیں تو آدھے سے
زیادہ مہینہ گزر جاتا ہے۔ اس لیے دھان کی فصل جوں ہی
بکی اور ہمیں جیب خرابی ملی، ہم نے ساری چھوٹی چڑی
ضروریات پس پش ڈال کے سالانہ رسالے لکھوائے والی
کی اچھا کیا تا؟ آئی یہ فرزانہ کھل اچھا لگتی ہیں، بہت
لوگوں کو پسند ہیں لیکن مجھے ان کی کہانیاں بہت مشکل لگتی
ہیں، ایک ایک پیرے کو کچھ میں کئی دفعہ پڑھتی ہوں،
جیسے کوئی سبق یاد کیا جا رہا ہو اور ان سے کوئی آسان کہانی
نکھوایاں۔ لیکن ناز و دل ڈن۔ لیکن اوداس کے ساس
سر جیسے کردار بہت اچھے لگتے ہیں۔

آج کل ہر جگہ بس الگ الگ ٹکڑے ٹکڑے
ہیلے ہی پلان تیار ہوتے ہیں فوراً الگ ہوتا ہے۔ فرحین
چٹھی عورتیں بہت کم ہوتی ہیں۔ کچی بہت دکھ ہوتا ہے اس
سوچ پر۔ جس بے کو دیکھ کر ماں باپ جیتے تھے، وہ دونوں
کیا بھنوں شکل نہیں دکھاتے، ان والدین کے دل پر کیا
گزرتی ہوگی، کبھی سوچا؟

افسانہ یہ سن کے روگ (حتاشری) ساڑھ رضا کے
خالی آسمان کی یاد دلا گیا۔ گوجرہ والی مہناز آئی آپ نے

پرانی کہانیوں کا چرہ..... اس لیے میرا ذاتی خیال ہے کہ
ہر کس و ناکس مصنف بننے کے قابل نہیں ہوتا۔ مجھے خدشہ
ہے کہ اس طرح رسالہ بھیڑ چال کا شکار نہ ہو جائے جیسے
ڈراما کا کوئی معیار نہیں رہا۔ کیونکہ ہم فنڈائین رسالہ جیسے
خرچے ہیں، شوہر کو کھانسیں ہیں اور وقت نکال کر
رسالہ پڑھتے تو رسالہ میں کہیں کی نہیں ہوتی چاہیے۔

لکھنے کا شوق رکھنے والی قارئین آپ کے خط کی
بہروں بن جائے جیسے کہ کوثر خالدہ، ربیعاہ پوری بن سکتی
ہیں۔ باقی گڑا شاہ نسبت زہرا کہوڑ پکا۔ ٹویہ نور کشن
گڑھ، بیہ۔ انا پچھوال نہ کہاں غائب ہیں۔ عائشہ فیاض بھی
خط لکھا کرتی تھیں، میرا بیٹا لید اور ان کا بیٹا ولید ایک ہی
سال میں پیدا ہوا۔ تھوڑے رابہ، سعدیہ رشک کہاں غائب
ہیں۔ رضیہ مہدی بھی لکھتی تھیں، ماہا ملک فرحت اشتیاق،
دیگر وغیرہ۔ کبھی میں لکھنے کی بے انتہاست آپ مصنفین
کے لیے صفحہ صفحہ اور انجیل لکھ رہی ہوں۔ نایاب جیلانی
کہاں ہیں، ان کا بھائی رہا ہوا ضرور بتائیں۔ میں بہت
پشیمان ہوں کہ خوب صورت شادیوں کے احوال ہم تک
نہیں پہنچیں گے۔ نہ مسائل کے انبار کا سامنا کرنے والی
بہروں کی بہت اچھی بولیا وادی اماں کے متعلق ہم پڑھ
پائیں گے، آسہ زانی اللہ آپ کے درجات بلند کرے۔
آئینہ نسیم آج کی ٹرہ بخاری۔ ہم آپ کا حراج
ضرور پڑھنا چاہیں گے۔ شکر ہے راحت جمیں، فارخہ
جمیں، ارشدہ رفعت لوٹ آئیں۔ راحت جمیں بھول
پودوں کے احوال کے ساتھ اپنے بچوں کا حال بھی آپ
کے خط میں ضرور درود لکھیں، مہربانی۔ فرزانہ کھل کو پسند
کرنے والیوں کی ہمت کو داد۔ دماغ کی دینی بنادیتی
ہیں۔ دل کی دھڑکی انگارہ ہو جائے، دماغ پلٹا ہو جائے۔
نئے نگار ہو جائیں۔ چھوٹی لیر لیر ہو جائے، چھوڑتے ہم
بھی رسالوں میں کچھ نہیں۔ شاہین رشید بہت شکر ہے کہ

عصیزہ سید سے ملوا دیے۔ مصنفوں میں شے درد کی طرح
چھپی ہوئی تھی۔ شمیمہ عظمت کبھی بھی افسانہ لکھنے والی نہ تھیں
کیا مہا ناولی سے ہے۔ نصیرناز بہت بہترین ہمیشہ صحتی
رہے، نانی کے حاوروں کے ساتھ پھر بنگلہ دیش کی کہانی
ضرور لے آئیے گا۔

بیاری عاصمہ! آپ نے ہماری قارئین اور
مصنفین کو بڑی محبت سے نام بہ نام یاد کیا۔ ہم آپ کا

کرکرن

ماہنامہ کرکرن



دور

اداکار ”آغا مصطفیٰ“ سے شاہین رشید کی ملاقات۔ * ”ہوائیں رخ بدل گئیں“ نگہت مہدالہ کا سلسلہ وار ناول،
اداکار ”مریم نور“ کہتی ہیں ”میری بھی سنئے“، * ”ساگر کنارے“ ام طہر کے مکمل ناول کی آخری قسط،
”آزادی دہانے“ حماد حسین، اس ماہ مہمان ہیں، * ”پھر اسی راہ گزر پر“ منعم ملک کا مکمل ناول،
اس ماہ ”شہلا گل سحر“ کے ”مقابل ہے آئینہ“، * ”نازک آکھینے ہوں میں“ نظیر فاطمہ کا ناول،
”میرے ہم نفس میرے ہم نوا“ آسیہ مرزا کا سلسلہ وار ناول، * ”کچھ لئے ہم پر قرض تھے“ سدرہ حیات کے مکمل ناول کا
دوسرا اور آخری حصہ،

* فیض تازہ، زمین سرحد، عبادت شاہ، تمہینہ مشتاق اور عندلیب زہرا کے افسانے اور مستقل ناول،

”کرکرن کتاب“

اس ماہ پڑھیے خاص مضامین: یہ ہلکا سا میک اپ اور سنڈر سا روپ،
”ہندی کی رسم جدت کے ساتھ، کینو“ سردیوں کا بادشاہ، ”حسد“ جسے انسان خود پیتا ہے،
کچن اور آپ، کرن کا دستور خوان اور بہت کچھ،

فروری 2020ء کا شمارہ شائع ہو گیا

ایسا کیوں کہا کہ چھوٹے چھوٹے خط لکھا کریں۔ چھوٹے خط پڑھ کر تو مزہ ہی نہیں آتا تب تو سب سے پہلے پڑھتی خط ہوں اور وہ بھی درمیان میں سے چن چن کر، لمبے لمبے پھر چھوٹے۔ آپ کی بھی میں کراچی ہوئی تھی تو آپ پلیز مجھے دفتر میں خط پڑھنے کے لیے کہہ لیتے سارے خط پڑھتی کتنا مزہ آتا۔ آپ کو کتنا مزہ آتا ہوگا ناں۔ مجھے یہ پوچھنا تھا یہ دارالامان کیسے ہوتے ہیں اور ان کا ماحول وغیرہ کیسا ہوتا ہے اور یہ حالات اور تقانہ کیسا ہوتا ہے۔ مجھے ان کے بارے میں جاننے کا بہت پس ہے۔ پلیز کسی رائٹر سے ریسرچ کرو اگر اس ٹاپک پر تفصیلی ناول لکھوادیں۔ آپ کی میری چھوٹی بہن عاشرہ مجھے سے ناراض ہے، کہتی پچھلے خط میں تم نے میرا ذکر کیا ہے اور نہ میرا نام لکھا ہے اور آپ سے بھی خفا ہے آپ نے میرا شعر اور خط دونوں شائع کر دیے، اس کا صرف شعر تھا وہ شائع نہیں کیا۔ اسے اپنے بکرے سے بہت محبت ہے، بکرے کے خلاف ایک بات نہیں سن سکتی۔ آپ اس کا یا اس کے بکرے کا ذکر کر دیں۔ اس کا نام عاشرہ بکرے والی لکھنا ہے۔

☆ سیدہ بخاری اور بخاری سسز بہت دلچسپ اور مزے دار خط لکھا ہے۔ آپ نے اور خیالات بھی آپ کے بہت اچھے ہیں۔ بلاشبہ صبر و برداشت مشکل کام ہے لیکن اس کا اجر بھی بڑا ہے۔ پھر بڑھاپا، کمزوری اور بیماری تو سب کے لیے ہے لیکن تالی دونوں ہاتھوں سے جتنی ہے۔ بعض اوقات سسرال والے بھی بہت ناروا سلوک کرتے ہیں۔ سسرال والوں کو بھی آنے والی کا خیال رکھنا چاہیے۔ فرزانہ کھر لک آپ کا بیٹا پتھار ہے ہیں۔ عاشرہ بکرے والی کو ہمارا سلام پہنچادیں۔

ام انعام..... نواب شاہ
خواتین جنوری کی برقی بارش میں ملا۔ لائٹ نہیں تھی ٹیڈی کی روشنی میں عزیزہ سید کا انٹرویو پڑھا۔ آپ اندازہ کریں۔ میری عزیزہ سید سے محبت کا، میں اگر ان کو خط لکھوں تو کیا آپ ان تک پہنچا سکیں گی؟ کہنی نشی مدیر کے یہ الفاظ ”اچھا یا برا وقت چپا بھی ہو کر جاتا ہے لیکن ہمارے روئے ہمارے کردار کا مین کرتے ہیں۔“ سال کا حاصل لگے۔ کرن کرن روشنی بہت پیاری احادیث، سروے پڑھا۔ خود یہ افسوس ہوا سستی نہ کرتی تو میرے جوابات بھی شامل ہوتے۔ ہمیشہ تیرم خواب دیکھو اور یہ

بقیہ صفحہ نمبر 244

سٹیج سلاپ

اس گھر میں دو بھائی زیر اور سرد اپنی بیویوں کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ زیر اور ساجدہ کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا دانیال تھا۔ بیٹیوں کی شادی ہو چکی تھی جبکہ سرد اور شبنم کی دو بیٹیاں تھیں روشنائی اور زوہار یہ۔ روشنائی کی مگنی دانیال سے ہو چکی تھی۔ زوہار یہ پورے گھر کی لادائی میسر میں بندھ رہی تھی۔ پردوں میں رہنے والا ساجدہ، فائقہ اور ابراہیم کی اکلوتی اولاد تھا۔ زہی اور ساجدہ میں بچپن سے بہت دوستی تھی، دونوں لڑتے بھڑکتے بھی تھے۔ فائقہ کو زہی کا یوں چھت بھلا لگ کر اپنے گھر آنا اور ساجدہ سے بے تکلف ہونا برا لگتا تھا۔ ان کے خیال میں وہ اب بڑے ہو گئے تھے، اس لیے زہی کو خاص طور پر احتیاط کرنا چاہیے۔

پوائنٹ

پاکستانی یوں

کلام



فائقہ نے تلاوت کے بعد قرآن پاک رکھا ہی تھا کہ باہر مسلسل گھنٹی بجنے لگی۔
 ”خدا خیر کرے..... اس وقت کون آ گیا۔“ فائقہ نے دہل کر ابراہیم کو دیکھا۔
 ”میں دیکھتا ہوں۔“ وہ جوتا پہن کر باہر کی طرف بڑھ کر تو رہا فائقہ سے بھی نہیں گیا۔ ابھی برآمدے میں ہی
 فائقہ نے دانیال اور شمینہ کو بکلائے ہوئے اندر آئے۔
 ”کیا ہو گیا دانیال! آخر تو ہے تم اتنی جت۔“ حیران پریشان ابراہیم ان کے پیچھے تھے۔
 ”صائم کہاں ہے؟“ کیسا کھاجانے والا انداز تھا۔ فائقہ دہل سی گئیں۔
 ”کیا ہوا، صائم کا کیوں پوچھ رہے ہو؟“
 ”فائقہ! تمہیں خدا کا واسطہ ہے۔ بتا دو، ان دونوں کو کہاں چھپایا ہے۔“ شمینہ نے ہاتھ جوڑ دیے۔ ساری
 اراک تو بچی کے ساتھ رخصت ہوئی تھی۔
 ”کن دونوں کو؟“

”انجان مت بنیں۔“ دانیال چلایا۔ ”وہ دونوں گھر سے بھاگ گئے ہیں۔ خدا انہیں عارت کرے۔“
 ”بدو دعا میں مت دو۔“ فائقہ تڑپ اٹھیں۔ ”میں کیا پتا کس کے ساتھ بھاگی ہے۔ صائم کو کوئی دن
 ہوئے ہم اس کے تاتا کے گھر بھجوا چکے ہیں۔“

”مجھے آپ کی بات پر یقین نہیں.....“ دانیال پوچھتا رہا کہ وہ بڑھا..... اور ایک ایک کمرہ دیکھنے لگا۔ کسی
 نے اسے دھوکے کی کوشش نہیں کی..... شمینہ بیٹھ کر رونے لگیں۔ فائقہ نے ابراہیم کو دیکھا۔
 ”ابا ہی کو کال کر کے صائم کا پوچھو۔“ ابراہیم کے لہجے میں کئی خوشی بول رہے تھے۔ فائقہ کو فضا آ گیا۔
 ”آپ بھی حد کرتے ہیں۔ ان کی بیٹی کی گھنٹی بغیر کسی ڈسٹرنس کے ہو جائے۔ ہم نے صائم کو دوسرے
 شہر دھکا دے رکھا ہے اور آپ کہتے ہیں۔“
 ”جو کہا ہے، وہ کرو۔“ ابراہیم کے لہجے میں ہلکی سی سختی در آئی۔

فائقہ نے ہونٹ چباتے ہوئے موبائل تلاش اور ان کے پاس آ کر نمبر ملائے گئیں۔ دانیال گھر کو خالی پا کر
 ان کے پاس آ کھڑا ہوا۔ بند مٹی کھولتا، بند کڑا تھکا مضطرب تھا۔ صاف دکھائی دیتا تھا۔
 ”ابراہیم صاحب! یہ وقت پروے ڈالنے کا نہیں ہے۔ ہمارے گھر کی عزت داؤ پر لگی ہے۔ اگر کچھ پتا ہے تو
 پتہ بتا دیں۔“

”ابا جی السلام علیکم۔“ ابراہیم کی توجہ فائقہ کی طرف ہو گئی..... انہوں نے بس دانیال کے کندھے پر ہاتھ
 رکھا تھا۔
 ”میری صائم سے بات کروادیں۔“ فائقہ کے لہجے میں پورا یقین تھا۔ جیسے اب فون صائم کے ہاتھ میں
 جائے گا اور وہ اگلے لمحے اس کی آواز سن رہی ہوں گی۔ مگر ابا جی کی بات سن کر ان کی رنگت فق ہوئی۔ ان کی رنگت
 دیکھ کر ابراہیم کا دل دھک سے رہ گیا۔

”صائم تو کل ہی واپس آ گیا تھا۔“ انہوں نے مرے مرے لہجے میں بتایا۔
 یہ سن کر شمینہ نے مزید اونچی آواز میں رونا شروع کر دیا۔
 ”دیکھو! کیا کہہ رہا تھا! اتنا پارسا نہیں ہے آپ کا بیٹا کہ شرافت سے وہاں بیٹھا رہتا..... وہ آیا اور زہمی کو
 دغا دے رہا تھا۔“

”وہ پارسا نہیں تو کیا تمہاری زہمی پارسا ہے..... وہ کیوں بھاگی..... مٹی پچی ہے جو تانی کے لالچ میں
 لالہ چلی گئی۔“ فائقہ پھٹ پڑیں۔

صائم کا کالج کے دوستوں کی پارٹی میں زہمی کو لے جاتا ہے۔ جہاں ایک دوست زہمی سے فری ہوتا ہے پھر اس کا بیہوش
 لے کر زہمی سے بات کرتا ہے۔ زہمی صائم کی غلط فہمی میں شبیر سے بات کرتی ہے اور تجھے وصول کرتی ہے، پتا چلنے پر
 پریشان ہوتی ہے۔ صائم کا شبیر سے جھگڑا ہو جاتا ہے۔

زوار بارہ کے کہنے پر صائم اپنا گنا توڑ دیتا ہے۔ صائم اس سے معافی مانگتا ہے۔ زہمی اس کے لیے اپنی پاکستانی
 سے گنا خریدتی ہے۔ اور صائم کی بالکونی میں کارڈ کے ساتھ رکھ کر دیتی ہے۔ صائم جان لیتا ہے کہ یہ کس کا نقد ہے۔
 صائم اور زہمی چھت پر بارش میں جھپک رہے ہیں۔ فائقہ وہاں آ جاتی ہیں اور زہمی کا ہاتھ پکڑ کر اس کے گھر لے
 جاتی ہیں اور اس کے گھر والوں خاص طور پر شمینہ کو کھڑی گھر کی سنائی ہیں۔ دانیال بھی وہاں آ جاتا ہے۔ فائقہ دانیال کو کہتی
 ہیں کہ اپنے گھر کی عزت سنبھالو۔ دانیال کہتا ہے کہ رانی ہے تو پہاڑ بنتا ہے۔ شمینہ زوارہ کو زانے کی اونچ بچھا جاتی ہیں۔
 گھر پہنچنے پر صائم فائقہ سے بحث کرتا ہے۔ ابراہیم بھی فائقہ پر ناراض ہوتے ہیں۔ صائم زوارہ پر کہ گھر معافی
 مانگنے جاتا ہے مگر شینا سے سخت ست سا کر دروازہ بند کر دیتی ہیں۔

روشنائے کی شادی ہو رہی ہے زہمی اور اس سے کہ اس نے تو تمام پر وگرام صائم کے ساتھ تھائے تھے۔
 سب کے سونے کے بعد زہمی کھانا پلٹتے ہیں لے کر چپکے سے بالکونی میں جاتی ہے صائم وہاں موجود ہوتا ہے۔
 فائقہ بھی ان کے پیچھے آتی ہیں اور سچ کر کے دانیال کو اوپر بلاتی ہیں، دانیال دونوں کو آ کر پکڑ مارتا ہے اور زہمی کو لا کر
 روشنائے کے کمرے میں اس کے سامنے پھینکتا ہے۔

صائم گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ وہ اپنے دوست مراد کے گھر میں کہاں اسٹڈی کے بہانے رہتا ہے۔ اس کے والد کو
 پتا چل جاتا ہے۔ وہ مراد کا گھر چھوڑ دیتا ہے۔ ایک فون کال آتی ہے کہ صائم کو کوئی لگی ہے۔ وہ باٹھل جاتے ہیں تو پتا
 چلتا ہے کہ کوئی اس کے بازو کو چھو کر زری ہے، وہ اسے گھر لے آتے ہیں۔ زہمی کے لیے صائم کا رشتہ آتا ہے۔ وہ لوگ انکار
 کر دیتے ہیں۔ فائقہ کے اسرار پر زہمی کو بلایا جاتا ہے۔ وہ انکار کر دیتی ہے۔ صائم دیکھ کر جاتا ہے۔
 صائم فائقہ سے معافی مانگ کر کہتا ہے کہ وہ اب اپنی پرہیزی پر توجہ دے گا۔ لیکن کچھ ہی مہینے بعد وہ دونوں پھر ملنا شروع
 کر دیتے ہیں۔ جب فائقہ ان سے کہتی ہیں کہ وہ دونوں دو تین سال ایک دوسرے سے نہیں ملیں گے۔ پھر وہ ان کا ساتھ دیتی ہیں۔
 صائم ماں سے وعدہ کر لیتا ہے کہ وہ ان کی بات مان کر پرہیزی پر توجہ دے گا اور زوارہ سے لگے گا نہیں۔ ابراہیم
 صاحب کہتے ہیں کہ انٹرنیٹ کے اس دور میں ایسا کیسے ممکن ہے۔ زوارہ یہ کہ صائم کو فضا آتا ہے کہ اس نے ملائی جاتی
 کیوں مان لی۔ فائقہ فون پر بات کی اجازت دے دیتی ہیں۔

روشنائے اس بات پر بہت خوش ہوئی ہے کہ اب ان کے ملنے کا پابندی لگ گئی ہے اور صائم کا کمرہ خفیہ خفیہ کر دیا گیا ہے۔
 زوارہ پر ایک دن بس نظر بننا کہ صائم کے گھر پہنچنے کے بعد صائم کے گھر میں ہوتے ہیں۔
 روشنائے غصے میں دروازے کی کنڈی لگا دیتی ہے۔ صائم سے کہتی ہے کہ تھی تو دور دوری آپ کو لیے گا۔ شمینہ کو پتا چلتا ہے
 تو وہ دم بخود رہ جاتی ہیں۔ زہمی صائم سے مل کر واپس آتی ہے۔ دروازہ بند دیکھ کر کھنٹی بجاتی ہے۔ دروازہ پر زوارہ چہرہ لے
 باپ کو دیکھ کر شرم سے زمین میں گڑ جاتی ہے۔ وہ موبائل لے کر..... دیکھتے ہیں اور اندازہ لگا لیتے ہیں کہ وہ صائم سے
 کس حد تک رابطے میں ہے۔

گھر میں سب کو پتا چل جاتا ہے کہ صائم کا رشتہ زہمی کی مرضی سے آیا تھا۔ سرمد صاحب ابراہیم اور فائقہ کے پاس
 جاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم اتنی کم عمری میں اس کی شادی رشتہ نہیں کر سکتے۔ ان کے انکار پر وہ زوارہ پر کا رشتہ
 کر دیتے ہیں۔ صائم کو تاتا کے پاس دوسرے شہر بھیج دیا جاتا ہے۔

سرمد بھئی کے لیے کھانا لے کر کمرے میں جاتے ہیں۔ وہ پوچھتے ہیں کہ وہ باپ یا صائم میں سے کسے چنے گی۔
 وہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ وہ زہمی کی خوشی کا خیال کریں کہ اس کی شادی صائم سے ہی کریں گے۔ زہمی صائم سے رابطہ کے لیے اپنی مٹی
 بناتی ہے۔ دونوں بھاگ کر تاتا کے پاس لاہور جا کر کالج کا پر وگرام بناتے ہیں۔ زہمی اور صائم گھر چھوڑ دیتے ہیں۔

بچو تھی قسطنطین

”کھانے کی ضرورت نہیں ہے مراد بھائی.....“ زوہاریہ نے جلدی سے کہا۔ بھائی کا لفظ بھالے کی طرح

وہ بے چین ہو کر بیڈ کے کنارے آ بیٹھا۔

تب ہی اس کا موبائل ٹکٹا لگا۔ فائیک کی کال تھی۔

نہیں، وہ یہ کال نہیں رہی ہو کر لگا۔ پون بجی رات کے اس پہر وہ سو رہا ہے۔ خود کو دھوکا دینے کے لیے وہ بیڈ پر دراز ہو گیا۔ غرتیل وقتے وقتے سے ہوتی چلی گئی۔ اس نے جھنجھلا کر کال لی۔

”آئی! اس وقت خیر تھی۔“

”صائم کہاں ہے؟“ فائیک نے چھوٹے ہی پوچھا۔ وہ ایک لمبے کوٹڑ بڑا گیا۔

”گھر پر نہیں ہے؟“

”گھر پر ہوتا تو میں رات کے اس وقت اسے ڈھونڈنے کے لیے گھر میں کال کر رہی ہوتی وہ اور زواریہ۔۔۔۔۔“

انہوں نے گھر چھوڑ دیا ہے۔۔۔۔۔ تم اس کے دوست ہو کوئی اشارہ کوئی بات اس نے کچھ تو کہا ہوگا۔“

مراد نے بے چینی سے پیشانی سہلائی۔

اف، مشکل ہی مشکل تھی۔ وہ کس طرح التجا کر رہی تھیں۔

”صائم نے ہمیں بہت بری پھونشن میں پھنسا دیا ہے۔۔۔۔۔ اور زواریہ وہ جانتی ہی نہیں اس کے گھر پر کیا

قیامت ٹوٹی ہے۔“

”ک۔ کیا ہوا؟“ مراد کی آواز جھنسن گئی۔

”اس کے ابو ہا پہلا تر ہیں۔ نجانے ہارٹ اٹیک ہوا ہے یا۔“

انہوں نے جملہ ادھر اچھوڑ دیا۔ مراد نے بے بسی سے طلوع ہوتی صبح کو دیکھا۔ اس کی سوچوں کے

گرداب میں پھنسی رات کب بیتی کب اذان ہوئی، اسے کچھ نہیں سمجھی وہ سمجھ رہا تھا، فائیک نے اسے رات میں

کال کی مگر باہر دھند سے پاک روشن صبح تاریکی کی گود سے جنم لے رہی تھی۔ بہت بھیا بک پیچھا تھا۔ زواریہ

بڑ بڑا کر چائی کرسی پر بھولنا صائم بھی گھبرا کر اٹھا۔

”کیا ہوا؟“ زواریہ حواس باختہ سی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

”ک۔ کوئی دور ہاتھا۔“

”کوئی بھی نہیں ہے۔ زبھی میری طرف دیکھو یہاں صرف ہم ہیں۔“

”صائم، صائم گھر کال کرو۔“ زواریہ کی نظر نیچے پر رکھے صائم کے موبائل پر پڑی تو جھپٹ کر اس کی

طرف بڑھایا۔ صائم نے موبائل ہاتھ سے لے کر جب میں ڈال لیا۔

”میں تم سے کہہ رہی ہوں گھر کال کرو۔“

صائم نے پاس بیٹھ کر زبھی سے اس کا ہاتھ پکڑا۔

”ہم اس وقت گھر کال نہیں کر سکتے۔“

زواریہ نے بے بسی سے اسے دیکھ لیا۔

”آئی ہو پ وہاں سب ٹھیک ہوگا۔ پھر بھی پھر بھی اگر تمہارے دل میں کوئی ڈاؤٹ ہے تو ہم واپس جاسکتے

ہیں۔“

زواریہ کچھ لمحے اسے دیکھ گئی پھر نئی میں گردن ہلا دی۔

”نہیں میرے اندر کوئی ڈاؤٹ نہیں ہے۔“

”جہیں اب جانا چاہیے۔“ مراد کی آواز پر دونوں چوٹے صائم کھڑا ہو گیا۔ مراد کی آنکھیں سرخ اور

چہرے پر اضطراب تھا۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو وقت زیادہ ہو گیا ہے۔“

”سواری، ہاتھ نہیں کرو اسکوں گا۔ راستے میں کچھ لے لیں گے۔“

”کیا بات کر رہے ہو بار۔ تم آل ریڈی ہمارے لیے بہت کچھ کر چکے ہو۔۔۔۔۔ جھینکس یا تم نے دوستی کا حق ادا کر دیا۔“ صائم جذباتی ہو کر اس کے گلے آگیا۔

زواریہ نے اپنی جیکٹ پہنی اس کا لف لپیٹا۔

مراد خاموشی سے زواریہ کو دیکھ رہا تھا۔

کیا میں بتاؤں کہ اس کے قادر ہا پہلا تر ہیں۔ شاید یہ رک جائے۔

”کیا ہوا؟“ صائم نے اس کی بے وقوفی پر بری طرح محسوس کی۔

”کچھ نہیں، تم لوگ فریش ہو جاؤ۔ میں تم لوگوں کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔“ گھبرائی سانس لے کر

خود کو کپڑوں کرتے ہوئے وہ ہلکا سا مسکرایا۔

ہوسکتا ہے باپ کی بیماری کی خبر سن کر وہ رک جائے۔ مگر وہ اپنے گھر میں کوئی تماشا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تب

ہی اس نے انہیں اسٹیشن ڈراپ کرنے کے بعد فائیک کو کال کی تھی۔

☆☆☆

ہسپتال کے سرورکار میڈور میں کالی شال اوڑھے روٹانے اتنی حواس باختہ تھی کہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

وہ بیمار باپ کے لیے دعا مانگتے۔ زواریہ کی تلاش میں نکلے شوہر کی فکر کر رہے جس کی آنکھوں میں خون اترتا تھا۔ یا

فون کوٹھے ماں کی خبر یہ تو پوچھ لے جسے وہ عجیب سی حالت میں چھوڑ آئی تھی۔

ساجدہ ٹھینک لکھ پاس رک گئی تھیں۔ دانیال سرور کو ہسپتال چھوڑ کر فائیک کی کال پر جا چکا تھا اور تایا بابا، اس

نے جھمر جھری سی لگے دور سے آتے تایا ابو کو دیکھا تو دوسرا ہٹ کا احساس ہوا۔ ساری دودھ دھوپ زہیری

صاحب کر رہے تھے۔ وہ اس کی نہیں سی۔

”تایا ابو! ابو ٹھیک ہو جا میں گے نا۔۔۔۔۔“

”ہاں ان شاء اللہ۔۔۔۔۔“ وہ تھک کر کرسی پر بیٹھ گئے۔

”دانیال کی کال آئی؟“

”نہیں میں نے کی تو انہوں نے جھمک دیا۔“ روٹانے نے آنسو لیے اور پاس بیٹھ گئی۔

”اب مت کرنا کچھ پتا چلا تو بتا دے گا۔“ انہوں نے آنکھیں موند لیں۔

روٹانے کا دل چاہا ان کے کتے سے پرسر رکھ کر سارے آنسو بہا دے اور وہ نرمی سے اس کا سر تھپتھپے رہیں مگر

وہ ڈر گئی۔

اگر تایا ابو بھی رو پڑے تو۔۔۔۔۔

”ایک بار فون کر کے اپنی ماں کا پوچھ لو۔“ انہوں نے بند آنکھوں سے کہا تو وہ ہاتھ میں پکڑے موبائل

کو دیکھنے لگی۔

کیا پوچھتی جانتی تو تھی کہ ماں کی حالت کیا ہے۔

ساجدہ ٹھینک کو سنہٹا لے سنہٹا لے بار لگیں۔ ٹھینک کے اندر کا خوف اٹھا کر باہر آ رہا تھا۔ خود ہی سوال

کرتیں۔۔۔۔۔ اور جواب کا سوچ کر ہی ڈر جاتی تھیں۔

”ابھی لوگ سرور کی عیادت کو آئیں گے۔ روٹانے کا پوچھیں گے تو کہہ دوں گی باپ کے پاس ہسپتال میں

ہے۔ لیکن، لیکن اگر انہوں نے زواریہ کا پوچھ لیا تو میں کیا جواب دوں گی۔“

انہوں نے ڈر کر ساجدہ کا پلو پکڑ لیا۔

”ان کی لمبی زبانیں کیسے کانٹوں کی۔ یہ کام تو عزت دار لوگ کرتے ہیں اور ہماری عزت تو وہ اپنے ساتھ لے گئی..... بعض کا اشتہار لگا گئی ہے اب بتائیں آپ کس کو جواب دیں گے؟“

”وہ آ جائے گی۔“ ساجدہ نے لمبی لمبی اس کے تین سن کر ٹپکی دی۔

”نہیں آئے گی..... اور اللہ کرے کبھی نہ آئے۔“

”کما کما رہتی ہو.....“

”آپ اسب سے کہہ دیں۔ باپ ہسپتال گیا تھا۔ مگر میت زواریہ کی آئی ہے۔“ وہ بین بھول کر سفاکی سے گویا ہوئیں۔ ساجدہ دنگل نکلیں۔

”انشاء نہ کریں، کسی باتیں کرتی ہو۔ ناخن سے گوشت جدا ہوتا ہے۔ یہ ککھ جنی اولاد کو جیتے جاراجا ساکتا ہے..... نادانی کرگئی ہے۔ دانیال ڈھونڈنے گیا ہے۔ واپس لے آئے گا۔“

”دانیال سے کہیں واپس آ جائے۔“ شمیم نے سختی سے گال رگڑ کر آنسو صاف کیے اور کھڑی ہو گئیں۔

”مجھے اب زواریہ نہیں چاہیے۔ میں نہیں جانتی زواریہ کون ہے، میری صرف ایک ہی بیٹی ہے روشنائے.....“

”آج وہ لڑکی اپنی ماں کی دعاؤں سے بھی نکل گئی تھی۔“
☆☆☆

ٹرین کھڑی تھی اور اسٹیشن پر مخصوص گہرا گہبی ایسے عروج پر تھی۔ چائے ناشتے کی آوازیں..... اترتے چڑھتے مسافر، بچوں کا شور مچا رہا، بجے گھنٹے، وزن اٹھاتے قلعی..... وہ دونوں بھی ایک ڈبے میں مٹا رہے تھے۔ ذوق باری نے بیک بیک اتار کر کھینچ لیا۔
 ”میں کچھ کھانے کو لے آؤں۔“ صائم کو یاد آیا..... مراد نے کہا تھا ناشتہ راستے سے لے لیں گے۔ بعد میں مراد نے کہا نہ صائم کو خیال آیا۔

”میں مت جاؤ، تیار رہنے کے لیے۔“ اس نے گہرا کراس کا بازو پکڑ لیا۔ ”اگر ٹرین چل گئی۔“ اس نے بیٹھی اونٹنی اور لڑکے کی اونٹنی چادر اوڑھے بھاری بھرکم عورت نے دوپٹے سے اس کے سامنے اونٹنی تیار کی کوبیکھا، اپنی وضع قطع اور حال طبع سے دونوں خاصے امیر گھرانے کے لگ رہے تھے۔

”اے تھوڑی سی جلی..... میں آ جاؤں گا۔“
 ”اگر تم آ جا بھول گئے۔“ وہ ہر یہ جواس باخستہ ہوئی۔
 ”ہاں! میں کوئی بچہ ہوں۔“ صائم نے بھنجھا کر باز و چھڑا اور سامنے بیٹھی خاتون سے مخاطب ہوا۔
 ”آئی! چلیز تھوڑی دیر اس کا خیال رکھے گا۔ میں ابھی آتا ہوں۔“

”ہاں، ہاں! سب سے پہلے میں چاہتی تھی کہ وہ مجھے دیکھ لیں۔“

خاتون نے اپنی بچھ کر مطابقت کہا اور بھائی کا لفظ سن کر دونوں بی گھر کے بدرجہ ہوئے۔ تبھی ڈبے میں بھانت بھانت کی چیزیں پینچنے والے داخل ہو گئے تو صاحبہ نے ویزن سے کٹ اور اولڈالان خرید لیا۔

زوارہ نے اطمینان کا سانس لیا۔

جن رستوں کو قدم پہنچاتے تھے۔ وہ اب پیچھے رہ گئے تھے۔
اور اچھی راستوں پر وہ ایک قدم بھی صائم کی مرضی کے بغیر نہیں رکھ سکتی تھی۔

”ان کی لمبی زبانیں کیسے کاٹوں گی۔ یہ کام تو عزت دار لوگ کرتے ہیں اور ہماری عزت تو وہ اپنے ساتھ لے گئی..... بے عزتی کا اشتہار لگا رہی ہے اب بتائیں آپ کس کو جواب دیں گے؟“
 ”وہ آجائے گی۔“ ساجدہ نے بے بسی سے اس کے یئین کن کرکھلی دی۔
 ”نہیں آئے گی..... اور اللہ کرے بھی نہ آئے۔“
 ”کیا کہہ رہی ہو.....“

”گلتا ہے پہلی بار یمن میں ستر کر رہے ہو۔“ خاتون کی دلچسپی بڑھی اور انٹر ویو شروع ہو گیا۔
 ”جی۔۔۔۔۔“ ذوباریہ نے مختصر جواب دیا۔
 ”کہاں جا رہے ہو؟“
 ”ناتنا کے پاس۔“

”صائم میرا ایک.....“
صائم نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔
”کہاں رکھا؟“

”وہ.....“ زہبی نے دماغ پر زور ڈالا۔ ”ٹرین میں رہ گیا۔“
”حد کرتی ہو یار۔“ صائم نے جھنجھلا کر دونوں ہاتھ جھٹکے۔ ”شکر ہے، میں نے اپنا ایک تمہارے حوالے نہیں کر دیا تھا۔“

”اب کیا ہو گیا۔“
”کچھ نہیں۔“ اس کی اتری صورت دیکھ کر صائم کو ترس آ گیا۔ ”پانی پیو۔“

زوباریہ نے خاموشی سے بوتل منہ کو لگا لی۔
صائم نے اپنا موبائل نکال کر آن کیا۔ میسرز اور کالٹری جبرماتھی۔ آخری میسج فائنڈ کی طرف سے تھا جسے پڑھ کر صائم کے ہاتھوں کے قوتے اڑ گئے۔
”مجھے بھی پانی دو۔“ حلق میں کانٹے سے آگ آئے تھے۔ زوباریہ نے بوتل اس کی طرف بڑھائی۔ صائم نے دو گھونٹ لیے۔ اور ڈھکن لگا دیا۔

”اب کیا ہو گا۔ اگلی ٹرین کب آئے گی؟“

صائم خاموشی سے آ کر اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔

”یہاں کیوں بیٹھ گئے ہو۔ جانا نہیں ہے۔“

”کہاں؟“ صائم نے بے توجہی سے زمین پر لکیر کھینچی۔

”نانا کے پاس۔“ زوباریہ نے تعجب سے اسے دیکھا۔

”وہ ہمارا ان کے یہاں آ رہے ہیں۔ مائے بیخ کیا تھا۔“

زوباریہ نے پورا منہ کھول لیا۔

”کیا؟ صائم اب ہم کیا کریں گے۔“ مٹری آپ اپنے جا لے میں پھنس گئی تھی۔

”صائم! اب ہم کیا کریں؟“ زوباریہ نے اس کا کندھا بوج کر اپنا سوال دہرایا۔

”میں نہیں جانتا۔“ اس نے بے بسی سے دور کچے کچے مکانوں پر اترتی دھوپ کو دیکھا۔ دھوپ جس میں ابھی حدت تھی۔

☆☆☆

ثمینہ، سرمد صاحب کے بے جان ہاتھ پر بیٹھانی لکائے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ سرمد صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ڈاکٹر نے منع کیا تھا انہیں کسی قسم کا دفتی دباؤ نہیں دینا مگر وہ انہیں برسوں رکھل تو کیسے؟
”یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ میں اچھی ماں نہیں بن سکی۔ اس کی تربیت نہیں کر سکی۔ اچھے برے کی تمیز نہیں سکھا سکی۔“

”امی، بس کریں۔ اب خود کو کوٹنے کا کیا فائدہ۔ وہی بے عقل نکلی۔ اس سب میں آپ کی کیا غلطی۔“

روشنائے نے تکی دینا چاہی۔

”میری تو غلطی ہے۔ نہ اللہ کا حکم یاد رہا نہ معاشرے کے تقاضے۔ جو ان لڑکے کو کھلم کھلا اپنے گھر میں آنے چاہنے کی اجازت دی۔ لڑکی کو خود اس کے ساتھ بیچ دیتی تھی۔ ہاں سرمد صاحب افغان تو تھے ہونا چاہیے تھا۔“

ثمینہ بلک بلک کر رو رہی تھیں۔ ”گناہ کا تو میں تھی۔“

سرمد نے اذیت کے ساتھ آنکھیں موند لیں۔

روشنائے ہاشمل ثمینہ کو کمرے سے باہر لائی۔ جہاں زہیر صاحب کے پاس دانیال کھڑا تھا۔ ثمینہ کو بٹھا کر وہ ان کے پاس چلی آئی۔

”عزت و محرت کے معاملے تھانے میں حل نہیں ہوتے۔“

روشنائے کا دل دھک سے رہ گیا۔

”تو کیا کریں؟ میرے پاس کوئی اور آپشن ہے۔“ دانیال میڈا۔

”دانیال! اگلے سے کام لو۔“ انہوں نے بیٹے کو غصہ کرنے کی کوشش کی مگر دانیال کا ضبط جواب دے چکا تھا۔ اور اس کے تورا برا بیٹم نے بھی دیکھے تھے۔ تب ہی تو فون کر کے مرادی میں کر رہے تھے۔

”وہ اسے لے کر نانا کے پاس نہیں جاسکتا۔ فائدہ نہ اسے پہنچ کر دیا تھا۔ مگر مراد بیٹا وہ تم سے رابطہ ضرور کرے گا۔ اس سے کہو مجھ سے بات کرے۔ میں اس کا باپ ہوں دشمن نہیں۔ دانیال اس پر انگو کا الزام لگا رہا ہے۔ باں باپ کے دباؤ میں زوباریہ نے بھی یہی کہا تو وہ بہت بری طرح سے ہنسنے لگا۔“

”مگر زوباریہ ایسا کیوں کہے گی۔ وہ تو اس سے محبت کرتی ہے۔“ مراد ہلکایا۔

”تمہارے میں جائے محبت۔“ وہ پھٹ پڑے۔ ”دانیال اور پولیس سے پہلے میرا صائم تک پہنچنا ضروری ہے۔“

”جی، جی، اگلے! صائم سے رابطہ کی کوشش کرتا ہوں۔ آئی ہو پ وہ مجھ سے کاٹھیک ضرور کرے گا۔“

مگر صائم نے مراد کے رابطہ نہیں کیا تھا۔ اسے شک تھا کہ دانیال کو ان کے بارے میں مرادی نے بتایا تھا۔

☆☆☆

سادہ سا کمرہ اسلامی، تاریخی اور قانونی کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ کمرے میں فرشی نشست کا اہتمام تھا۔ اسکرے کی واحد کھلی کھڑکی سے دھوپ اندر آ رہی تھی۔ مگر سرمد دھوپ کی شدت کو کماتار ہی تھی۔

مولانا عبدالرحمن ایک موٹی کتاب کی ورق گردانی میں مصروف تھے۔

ان کے عین سامنے صائم اور زوباریہ کھجنتوں کے بل فرش پر بیٹھے، نئے طالب علموں کی طرح گھبرائے ہوئے تھے۔

گھبراہٹ میں انگلیاں مروڑتی زوباریہ نے کن انہیوں سے عبدالرحمن صاحب کو دیکھا۔ صائم اپنا مدعا بیان کر چکا تھا۔ انہوں نے سنایا نہیں۔ بس وہ مسلسل ورق گردانی کر رہے تھے۔ زوباریہ نے بے چینی سے سر پر موجود اسکارف کو مزید ٹھیک کیا۔

”سر۔“ صائم نے انہیں متوجہ کیا۔

”کھڑکی بند کر دو بیٹا۔ ہوا سرد ہے۔“ انہوں نے نرمی سے کہا تو صائم نے اٹھ کر کھڑکی بند کر دی۔ ہوا کا رستہ رک گیا تھا مگر کھڑکی کے شیشے دھوپ اور روشنی کو نہیں روک سکتے تھے۔

”میرے بارے میں کس نے بتایا؟“

”ایک دوست نے۔ اس نے آپ سے قرآن پاک پڑھا تھا۔“

”کون؟“ انہوں نے کتاب سے نظر اٹھا کر دونوں کو دیکھا۔

”نام نہیں بتا سکتا۔ اس سے وعدہ کیا ہے۔“ صائم تذبذب بھرے انداز میں بولا۔

مولانا صاحب مسکرائے اور کتاب میں نشانی لگا کر کتاب بند کر دی۔

”ماشاء اللہ! وعدہ بھانا آتا ہے۔ اچھی بات ہے۔“ پھر وہ زوہاریہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ ”جینی! آپ کا کیا نام ہے۔“

”زوہاریہ۔“

”پورا نام؟“

”زوہاریہ سرمد۔“

”ماشاء اللہ! پیارا نام ہے۔ سرمد صاحب کہاں ہیں۔“

”جی.....“ زوہاریہ ان کے اچانک سوال پر گڑبڑائی۔

”کچھ کر نے آئی ہیں۔ تو باپ، بھائی کوئی تو ساتھ ہوگا۔“

زوہاریہ نے گھبرا کر صائم کو دیکھا۔ اس نے کھٹکھٹا کر گلا صاف کیا۔

”سر! ہمارے پیرش راضی نہیں ہیں۔ اس لیے ہم یہاں آئے ہیں۔ میں عاقل و بالغ ہوں۔ اپنے بارے

میں فیصلہ کرنے کا حق رکھتا ہوں۔ ہمیں پورا حق ہے کہ ہم اپنی مرضی سے زندگی گزاریں۔“

”بالکل.....“ انہوں نے سنجیدگی سے سر ہلایا۔ صائم کے اندر طمانیت کا احساس جاگا تو اپنا موقف مزید

مضبوط کیا۔

”اس بات کی اجازت تو ہمارا مذہب بھی دیتا ہے۔“

”بالکل دیتا ہے۔ لڑکے اور لڑکی کی مرضی کے بغیر نکاح غلط ہے۔ مگر.....“ انہوں نے ہلکا سا وقفہ دیا۔

”مگر ولی کی اجازت بھی تو ضروری ہے۔“

”ولی.....“ زوہاریہ نے عجیب دہرایا۔

”جی جینی۔ آپ کا باپ بھائی یا کوئی بھی محرم رشتہ..... کنواری لڑکی کے نکاح کے لیے ولی کی اجازت

ضروری ہے۔ ہاں بیوہ یا مطلقہ کو اپنی مرضی کی اجازت ہے۔“ انہوں نے دھیمے لہجے میں سمجھایا۔

”وہ لوگ مان رہے ہوتے تو برا بھلا کیا تھی؟“ صائم جھنجھلایا۔

”تو انہیں مٹاؤ۔ مگر اس طرح گھر سے بھاگ کر والدین کی رضامندی کے بغیر نکاح کرنا ہرگز مناسب

نہیں۔ جبکہ ماں باپ کی ناراضی اللہ کی ناراضی ہے۔“ انہوں نے دونوں کے چروں پر پھیلی ناگواری کو بغور

جانچا۔

”صائم! گھر سے بھاگنے کا حوصلہ ہے تو گھر میں رہ کر اپنی بات منوانے کا حوصلہ بھی ہونا چاہیے۔ ابھی کم عمر

ہو۔ جا کر اپنی اپنی تعلیم پر توجہ دو۔ ایک وقت آئے گا۔ جب وہ لوگ تمہاری بات سنیں گے۔“

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

”اور جینی تم برداشت کرو گی۔ ساری زندگی تمہارے نام کے ساتھ گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کا کیلیں گے۔“

زوہاریہ کی نظریں جھک گئیں۔

”سر! آپ سمجھتے نہیں ہیں۔“ صائم جھنجھلایا۔

”اس کے گھر والے زبردستی اس کی لنگٹی کہیں اور کر رہے ہیں۔“

”بیٹا! تقدیر ہم نہیں لکھتے۔ تقدیر اللہ لکھتا ہے۔“ انہوں نے زہری کو دیکھا۔

”یہ اگر تمہارے نصیب میں لکھی ہے۔ تو اسے کوئی اور نہیں لے جا سکتا اور اگر تمہاری تقدیر میں تم دونوں کا

ساتھ نہیں تو گھر سے بھاگنا بھی بے فائدہ ہی ہوگا۔“

”ٹھیک ہے سر! آپ کا شکر ہے۔ ہم نے آپ کا بہت وقت ضائع کیا۔“

صائم ایک ہنسلے سے کھڑا ہوا۔ اس کے نو عمر چہرے پر ناگواری نمایاں تھی۔ زوہاریہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس

”زوہاریہ چلو.....“

زوہاریہ نے سر اٹھا کر عبدالرحمن صاحب کو دیکھا۔

ان کی شفقت بھری مسکراہٹ پر سرمد صاحب کی مسکراہٹ کا شائبہ ہوتا تھا۔ وہ ذرا سا آگے کو جھٹکے اور اپنا

انداز زہری کے سر پر رکھا۔

”چہرے بچو! اللہ تم دونوں کو سیدھا راستہ دکھائے۔ میرا رب تمہارا حامی و ناصر ہو۔“

وہ کسی بھاری سل کی طرح وہیں گر گئی تھی۔

☆☆☆

دو روپے لیے درختوں سے گرتے چٹوں کی آہٹیں۔

کائنات پر چھائی خزاں کی سرسراہٹیں۔

کولہار کی سرخ سڑک شام کے دھندلے میں ڈوبی کچھ اور سیاہ لگ رہی تھی۔

”اتنی دیر میں تو نکاح کا خطبہ تین بار پڑھا دیتے۔ جتنی دیر میں انہوں نے ہمیں لکچر دیا ہے۔“ صائم نے

جھنجھلا کر خشک چٹوں کو اپنے قدموں سے روندنا۔

”نکاح ہو جاتا تو دونوں اپنے اپنے گھر کی حدت بھری فضا میں بیٹھے گھر والوں کی گرما گرم سن رہے

ہوتے۔“

زوہاریہ کی مسلسل خاموشی پر صائم نے گردن موڑ کر دیکھا..... وہ گم صم، خاموش اسی اداس شام کا حصہ لگ

رہی تھی۔ صائم نے محسوس کیا۔ وہ ایک پاؤں دبا کر رکھ رہی تھی اور ایسا کرتے ہوئے ہلکی سی تکلیف کے آثار اس

کے چہرے پر آ جاتے۔

”کیا ہوا؟“ وہ فکر مند سی رک گیا۔

”کچھ نہیں۔“ زہری کی جھکی ہوئی نگاہوں نے بیٹھنے کے لیے جگہ تلاش کی۔ پھر وہیں فٹ پاتھ کے کنارے بیٹھ کر

اپنا چٹا تارٹاں لے لی۔ صائم نے دیکھا اس کے پاؤں کا انگوٹھا سوج رہا تھا۔

”یہ کیا ہوا ہے؟“ صائم نے بے اختیار اس کے پاؤں پر ہاتھ رکھا۔

”رہے دو۔“

”یار! دیکھنے تو دو۔“

”شاید کہیں بھاگتے ہوئے ٹھوکر لگ گئی۔“

”تو بہت سوئیگ ہو رہی ہے، تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ ہم کوئی میڈیسن لے لیتے۔“ صائم نے زہری

سے انگوٹھے کو بھلایا۔ زوہاریہ کے منہ سے سسکاری نکلی۔

”میں نہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔“ ایسا کہتے ہوئے اس کی آنکھیں لبالب پانیوں سے بھر آئیں۔

صائم دھکی سا ہو گیا۔

زہری کا اتر اچھرہ۔

مدھم رنگت۔

آنکھوں میں پھنور۔

”صائم! اپنے تانا کو کال کرو۔ وہ جہاں ہیں، ہم وہاں چلے جاتے ہیں اس طرح سڑکوں پر کب تک بیٹھیں

وہ ٹیکسی ڈرائیور کریم کی محبت میں اس بیٹی چھت والے کمرے میں داخل ہوئے، جہاں دو چار پائیاں تھیں۔ ایک طرف دو جستی ٹریک اوپر بچے رکھے تھے۔ جن پر بستر وال کا ڈھیر تھا۔ کمرے میں بندھی سی پرزنا کپڑے دھلے گندے اکٹھے لٹک رہے تھے۔ کمرے میں عجیب سیکن زدہ ہوا تھی۔ ایک لمبے لوگ ان کا دل الٹ جائے گا۔

”یہ..... یہ کمرہ ہے۔“
”ہاں جی بچی کمرہ ہے۔“ کریم نے ہاتھیں پھیلائیں کہ وہ انہیں یہاں لانے سے قائل ہی کر دیا۔ وصول کر چکا تھا۔
”بس بابو! عیش کرو۔ کوئی تمہیں ڈسٹرب نہیں کرے گا۔“ وہ بار بار دوبار یہ کہہ کر بلا وجہ معنی خیز انداز میں مسکرا رہا تھا۔

”لو کا پٹھا..... باسٹرڈ۔“ صائم نے دل ہی دل میں ہزاروں گالیاں دیں۔
”صائم میں یہاں نہیں رک سکتی۔“
”یہاں رات گزارنے کا تصور ہی وحشت انگیز تھا۔“
”بچو ہی بے رات سڑک پر تو نہیں گزار سکتے۔“ صائم دلی زبان میں بولا۔
”ہم کسی اچھی جگہ بھی جا سکتے ہیں۔ کیا تمہارے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں؟“ صائم کریم کی طرف مڑا۔
”ٹھیک ہے کریم بھائی آپ جاویں۔“
کریم مسکراتا ہر نکل گیا۔

”کیا مصیبت ہے؟“ زوہاریہ چار پائی پر بیٹھ کر رونے لگی۔ ”جب سے گھر سے نکلے ہیں یہ مصیبت ہی ملے پڑ گئی ہیں۔ کچھ بھی تو ٹھیک نہیں ہو رہا۔“
”زہیہ یار! میں بھی تو تمہارا ساتھ ہوں نا.....“
”میں نے زندگی میں بھی اتنی گھٹیا جگہ نہیں دیکھی۔“
صائم خاموشی سے اس کے پاس بیٹھ گیا۔
”اپنا سیل دو۔“
”کیا ہوا؟“

”فسرین نے بتایا نہیں۔ ابو ہاسٹل آئے ہیں۔ مجھے روشانی سے بات کرنی ہے۔“
صائم خاموشی سے سیل اس کے حوالے کر دیا۔ زہیہ نے بتانی سے آن کیا۔
روشانی کی آواز سن کر اس کا دل چاہوہ اڑا گھر واپس چلی جائے۔
”روشانی ابو کیسے ہیں؟“
روشانی نے بہت بے دھانی میں کال لی تھی۔ زوہاریہ کی آواز پر اسے کزنٹ سا لگا۔ اس نے ایک نظر باپ پر ڈالی اور باہر نکل آئی۔ یہ بھی نصیحت تھا کہ اس وقت روشانی کے سوا وہاں کوئی نہ تھا۔
”روشانی پلیز مجھے بتاؤ۔“

”کون بات کر رہا ہے؟“ دوسری طرف روشانی نے نہیں کوئی اچھی تھا۔ جو زوہاریہ کو جانتا تک نہیں تھا۔
”روشانی پلیز مجھے ابو۔“
صائم اٹھ کر دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ باہر کچے کچے صحن میں زرد سابلبل روشن تھا۔
”کیا ہم سے غلطی ہو گئی؟“

ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ کچھ تباہی کا احساس جاگنے لگا تھا۔
زندگی تین گھنٹے کی سووی نہیں۔ ایک صبحر ڈانٹ گزرنے والے کو احساس ہوا تھا۔
”ہمیں اس سے کیا؟ تم تو سارے گھر کو مار کر لگی ہو۔ اب پیچھے مڑ کر کیوں دیکھ رہی ہو۔ اب جاؤ اپنی مرضی کی زندگی گزار دو خوش رہو نہ ہو مگر ہم سے رابطہ کرنے کی ضرورت نہیں، تمہاری خود غرضی کا زہر ہم نے پچھلے کیا ہے۔“
”ہاں یاسرین۔ ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔“
”روشانی روشانی، میری بات تو سنو۔“

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ صائم نے پاس آ کر موبائل ہاتھ سے لیا۔ کال کٹ چکی تھی۔ اس نے یونہی گھر سے نکلے زہیہ کو اپنے ساتھ لانا چاہا۔ زہیہ نے غصے سے اسے خود سے دور کر دیا تھا۔
”میں بہت بری ہوں..... میری وجہ سے میرے ابو ہاسٹل پہنچے گئے گھر والے میرا نام سننا نہیں چاہتے۔“
”اگر میرے ابو کو کچھ ہو گیا تو میں خود کو کیسے معاف کروں گی۔“
”انہیں کچھ نہیں ہو گا زہیہ! تم رونا تو بند کرو۔“ صائم کو اس کا رونا تکلیف دے رہا تھا۔
”صائم! زہیہ نے بے قراری سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”ہم نے غلط کیا ہے۔“
”ایسا نہیں ہے۔“ اس نے زہیہ سے زیادہ خود کو دکھایا تھا۔
”ایسا ہی ہے۔“ بھی تو ہمارے ساتھ ہی غلط ہو رہا ہے۔ صائم! چلو گھر چلے ہیں۔“
”اس طرح کیسے جائیں گے۔ نکاح بھی تو نہیں ہوا۔“
”نکاح نہیں ہو گا اور ہم اسی طرح یہاں وہاں رلتے رہیں گے۔ پیسے ختم ہو جائیں گے۔ پھر کیا کریں گے؟“ وہ غصے میں آ گئی۔

”ہم کورٹ میرج کر لیں گے۔ ہم صبح ہوتے ہی ساری انفارمیشن۔“
”کوئی انفارمیشن نہیں ہے..... تمہارے پاس کوئی پلان نہیں ہے۔ نانا کے گھر جائیں گے۔ وہ بیٹے بیٹے دیکھا نکاح پڑھوائیں گے اور ہم واپس آ جائیں۔ واہ کیا پلان تھا تمہارا بنا سوچے کچھ مجھے ساتھ لے کر گھر سے نکل گئے۔ یہ بھی سوچا جا تم تو لو کے ہونٹ پاتھ پر رہ لو گے۔ کسی پارک میں سو جاؤ گے میں کیا کروں گی؟“ وہ پھر گرنے لگی۔

”ہاں تو تم نے سوچا تھا یہ سب۔“
”میں نے تو تم پر اعتبار کیا تھا۔“ زہیہ نے لڑنا چھوڑ کر پھر سے رونا شروع کر دیا۔
”اچھا بس کرو۔ خواہوا لڑے جاری ہوں۔ آئی پر اس صبح ہوتے ہی کچھ نہ کچھ کر لوں گا نہیں تو۔“
”نہیں تو۔“ زہیہ نے اپنا آنسوؤں بھر اچھروہ اٹھا کر دکھا۔
”گھر جا کر سب کے پیروں میں گر جائیں گے۔ تم بس مجھے اپنا آئی ڈی کارڈ دو۔“
”آئی ڈی کارڈ.....“
”ہاں اس کے بغیر کورٹ میرج کیسے ہوگی۔“ زہیہ ٹکر ٹکر اس کی شکل دیکھنے لگی۔
”اب کیا ہے؟“

”وہ تو..... وہ تو ابھی بنائی نہیں۔“
”کیا مطلب؟“ صائم شا کڑھا۔ ”تم نے مجھے بتایا کیا نہیں۔“
”تم نے کون سا پوچھا تھا اور مجھے کیا پتا تھا نکاح کے لیے آئی کارڈ اتنا ضروری ہوتا ہے۔“
”تم کیا ان پڑھ ہو۔ ہمیں اندازہ ہونا چاہیے۔“ اس نئی چوٹن نے اسے چکر کر رکھ دیا تھا۔

”اللہ کرے، تیری ٹانگ ٹوٹ جائے، کوڑی ہو کر بستر پر پڑے۔“ وہ چلانے لگی۔ ”جب پولیس آ کر دروازہ توڑے گی۔ تیری بیٹیوں کو بچھ کر سڑک پر کھڑا کرے گی تو پتا چلے گا۔“

”تیری زبان پر قانع کرے۔ جو مرضی کتنی رہے۔ یہ پیسے تو میں واپس کرنے والا نہیں۔“

”کریمے، عزت سب کی ساسی ہوئی ہے۔ بغیر نکاح کے پڑے گئے تو اور بھی برا ہوگا۔“ سیکینہ نے ذرا نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی۔

”اچھا.....“ کریم نے ذرا دیر کو غور کیا۔

”تو پھر ایک کام کرتے ہیں۔ دونوں کا نکاح کروا دیتے ہیں۔“

”کیا بات کرتے ہو؟“ سیکینہ ہکا بکا رہ گئی۔

”اور گلے ہاتھوں ہم بھی دوبارہ سے قبول ہے، قبول ہے پڑھ لیں گے۔ پرانی یادیں تازہ ہو جائیں گی۔ کیا؟“ کریمے کا غصے جھاک کی طرح بیٹھ گیا۔ ٹھوڑے سے پیسے خریدنے کی آس نے طبیعت بحال کر دی تھی۔

”پر اس سر۔“ سیکینہ نے اسے پیچھے دھکیلا۔ ”ہندوؤں والی باتیں انہیں کے ذرا موں میں دیکھی ہیں۔ یہ بار بار ہوتی شادیاں۔“

کریمے ہستے ہستے باہر نکل گیا۔

”صائم! اور دوبارہ یہ کتنی نہیں تھے۔“

”کہاں جا رہے ہو؟“ (کہیں پرندے اڑنے تو نہیں لگے)

”بھوک لگی تھی تو کھانا کھانے جا رہے ہیں۔“ صائم نے جواب دیا۔

”اس طرح باہر نکلتا ٹھیک نہیں۔ مسئلے والے سوال جواب کریں گے اور کسی نے تمہارے والی وارثوں کو اطلاع دے دی تو میں بھی پھنسنوں گا..... آپ اندر جاؤ۔“ اس نے نرمی کو اشارہ کیا۔ ”مجھے اس سے ضروری بات کرنی ہے۔ سیکینہ کھانا دے دے گی۔“

”بچھو نہیں ہے، سب بچوں نے کھا پی لیا۔“ سیکینہ نے اندر سے چٹا جواب دیا۔

”کوئی بات نہیں۔ ہم لے آتے ہیں۔“ کریم کے کہنے پر صائم نے دوبارہ یہ کو دیکھا۔

”تم کسی سے اندر نہ گھومو۔ میں ابھی آ جاؤں گا۔“ دوبارہ یہ جانا نہیں چاہتی تھی۔ کمرے سے ڈر لگنے لگا تھا۔ وہ وہیں کھڑی دونوں کو باہر جانا دیکھتی رہی۔ پھر خاموشی سے اندر آ کر بیٹھ گئی۔

☆☆☆

برگروا الاق برقرار رہی سے برگربنا رہا تھا..... فضا میں اٹھنے لگی اور ڈبل روٹی کی جھبک پھیلی تھی۔

کریم کی بات سن کر صائم گڑبڑا سا کیا۔

”کیسی باتیں کر رہے ہیں کریم بھائی۔“

”بھائی! مجھے کہتے ہو اور باتیں بھی چھپاتے ہو۔ جانتے ہو لڑکی بھگانا کتنا بڑا جرم ہے۔“ کریم نے صائم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آنکھوں میں جھانکا۔

”ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔“

”چار دن عیش والی محبت یا.....“

صائم نے غصے سے اس کا ہاتھ جھٹکا۔

”غصہ کرنے کی ضرورت نہیں، پولیس کے ہتھے چڑھ گئے تو بہت برے بھنوسو گے۔ آخر اس کے گھر والے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تو نہیں بیٹھے۔“

”اچھا ہم انہیں کہہ دیں گے آئی ڈی کارڈ بعد میں لے لیں۔“

”کیوں اسٹو پڈ باتیں کرتی ہو۔“ وہ چڑھ گیا۔

”اب کیا کریں گے؟“

”مجھے نہیں پتا۔“ وہ جا کر دوسری چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ایک اضطراب بھری خاموشی کمرے میں پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔ دماغ کے ٹھوڑے دوڑاتے دوڑاتے اسے بھوک محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے نرمی کو دیکھا۔ وہ یونی بیٹھی ہاتھوں کی انگلیاں مروڑے جا رہی تھی جیسے موسم کی بنی ہو۔

”بس کرو ٹوٹ جائیں گی۔“

”ذہنی نارسا رہی سے اسے دیکھا اور شغل جاری رکھا۔“

”میں کچھ کھانے کو لاتا ہوں۔“ وہ کھڑا ہوا..... نرمی اس سے زیادہ تیزی سے کھڑی ہوئی۔

”میں یہاں انکی نہیں بیٹھوں گی۔“

”یار! سمجھا کرو۔ میں ہر جگہ کہیں ساتھ لے کر نہیں جا سکتا۔ یہ علاقہ بھی ایسا نہیں ہے۔“ صائم نے نرمی سے سمجھانا چاہا۔

”نہیں میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ ورنہ تم بھی مت جاؤ۔“ نرمی ہٹ دھری سے بولی تو صائم کو ماننا پڑی۔

”اچھا ٹھیک ہے ریڈی ہو جاؤ۔“

”ہاں، ابھی شاور لے کر بیچ کرتی ہوں۔“ وہ بھاڑ کھانے کو دوڑی۔ صائم کھانا سا ہو گیا۔

”یار! روانی میں بول گیا تم تو ہر بات دل پر ہی لے بیٹی ہو۔“

☆☆☆

”دونوں گھر سے بھاگے ہیں۔“ دہلی پتلی سیکینہ نے پلنگ کے کنارے کھتے کو یا اعشاش کیا کیونکہ تھے

سہارے نیم دراز کریم اپنی جیب پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ لا پرواہی سے جواب دیا۔

”وہ تو نظری آ رہا ہے۔“

”ابھی نکاح نہیں ہوا۔“

”تو کرلیں کورٹ میرج۔“

”کھتے تے سوا.....“ سیکینہ نے غصے سے ہاتھ جھٹکا۔ ”لڑکی ابھی اٹھارہ کی نہیں ہوئی۔“

”تم سے کس نے کہا۔“ کریم چونکا۔

”سیکینہ کو سب پتا ہے۔“ سیکینہ نے فخر سے کہا۔

”چل رین دے آئی بڑی اللہ والی۔ دروازے سے کان لگا کر کھڑی ہوگی۔“

”میں کہہ رہی ہوں۔ پولیس کیس بن جائے گا۔“

کریم ایک جھگڑے سے اٹھ بیٹھا، جیب میں انگلیاں ڈال کر پانچ ہزار کا نوٹ سیکینہ کی آنکھوں کے سامنے

لہرایا۔

”ایک رات کا پانچ ہزار..... دیتا ہے کوئی ایک رات کے لیے۔“

نوٹ دیکھ کر ایک لمحے کو سیکینہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ کئی نا آسودہ خواہشیں اٹھوائی لے کر جا گئیں۔ مگر

دوسرے لمحے وہ ترن کر پڑی۔

”میرا گھر ہے کریمے، کوئی عیاشی کا اڈا نہیں۔ جو اسے رات کے حساب سے کرائے پر چڑھا رہا ہے۔“

سیکینہ کا جملہ ادھورا تھا کہ کریمے کی ٹانگ کمر پر پڑی۔ وہ گرتے گرتے پئی۔

”ہم نکاح کرنا چاہتے تھے مگر۔۔۔“

”میں مدد کر سکتا ہوں مگر کچھ پیسے لگیں گے۔“

”کریم بھائی! اگر یہ ہو جائے تو میں کھر پیچ کر آپ کو مزید پیسے بھجوا دوں گا۔ ابھی تو میرے پاس۔“ صائم نے جوش میں والٹ کھولا۔ ”میںی ہیں۔“

اور نوٹ دیکھ کر کریم کھڑے کھڑے اڑنے لگا۔ اس نے بے تکلفی سے والٹ ہاتھ میں لے کر سارے نوٹ نکال لیے اور خالی والٹ صائم کو تھما دیا۔ وہ کچھ حیران پریشان خالی والٹ کو دیکھ رہا تھا۔

”کیا ہو گیا۔ مولوی صاحب اور گواہوں کو دینے کے بعد جو جگہ گئے واپس کر دوں گا۔“

”وہ ذوباریہ کے پاس آئی ڈی کارڈ نہیں ہے۔“

”فکر نہ کرو۔ وہ خانہ خالی چھوڑ دیں گے۔ اصل چیز تو قبول ہے قبول ہے ہوتی اور تم دونوں کے دستخط۔۔۔۔۔“

فکر نہ کرو۔ سب کرلوں گا۔“ اس نے بات ادھوری چھوڑ کر ہانک لگائی بلکہ ایسا کرتا یہ پیسے پکڑا اور گھر بھجوا دینا۔ اس نے ہزار کا نوٹ دکا اندر کودیا۔ پھر باقی اپنی جیب میں ڈال کر صائم سے بولا۔

”چل شہزادے، تیری شادی کی تیاریاں کرتے ہیں۔“

☆☆☆

ہاتھ روم اتنا گندہ تھا کہ ذوباریہ کا اندر جاتے ہی دل مظاہر کیا کسی بچے کے گندے کپڑے بھی وہیں گول مول کر کے رکھے تھے۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھتی باہر بھاگی۔ سیکہ نے اسے دیکھ کر چھانی پیٹ لی۔

”ہائے میں مرگئی۔ گنجت کب سے اس کے ساتھ دھکے کھا رہی ہے۔“ دانش نیشن پر پانی پیکے چھینچا منہ پر مارتی ذوباریہ خود کو سنہیال کر مڑی۔

”یہ کام تو نکاح کے بعد کے ہوتے ہیں۔ تم لوگوں نے تو ہر حد ہی توڑ دی۔“

”کیا بولے جا رہی ہیں۔ اتنا گندہ والٹ روم سے آپ صفائی نہیں کرتیں۔“

ذوباریہ چھینچھائی تو سیکہ نے چھانک کر دانش روم کو دیکھا۔ سمجھ گئی پھر بھی بکڑ کر بولی۔

”اپنی عیاشیوں کے لیے کوئی گل ڈھونڈ لیتی۔ ہماری کنیا تو ایسی ہی ہے۔“

”آپ مجھ سے سیسی بائیں کر رہی ہیں۔“ ذوباریہ کتر اکرا اندر جانے لگی۔ سیکہ سامنے آگئی۔

”تو کیسی بائیں کروں؟ ایک بار اپنے ماں باپ کے بارے میں نہیں سوچا۔ تو یہ تو بے لکھی بکڑ دار اور بد چلن بیٹی کو تو پیدا ہوتے ہی مر جانا چاہیے۔“

”آپ میرے لیے اتنے بڑے الفاظ استعمال مت کریں۔“ غصے اور بے بسی کے احساس نے اسے اودھ موا کر دیا۔

”مجھے تو وہ لفظ نہیں مل رہے جو تیرے لیے استعمال کروں۔۔۔۔۔ جوانی سنہیالی نہیں جاتی تھی تو ماں باپ سے کہتی دو بول کسی کے ساتھ پڑھو اگر رخصت کرتے۔“

”آپ نہ جانے کیا سمجھ رہی ہیں۔ ہم نے بہت مجبور ہو کر یہ قدم اٹھایا ہے۔“

ذوباریہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ کیسے اس عورت سے جان چھڑائے۔ وہ اندر جانا چاہتی تھی۔ سیکہ نہ راستہ روکے کھڑی تھی۔

”ہونہر مجبوری، یہ آج کل کے لڑکے، جب محبت کرتے ہیں تو لگتا ہے۔ جان دینے لگے ہیں اور جب جان دینے کی باری آئے تو سب سے پہلے چھوڑ کر بھاگتے ہیں۔ بس دو چار دن دل بھلائے گا اور۔“

”وہ ایسا نہیں ہے۔“ ذوباریہ کے کانوں سے دھواں نکلنے لگا تھا۔

”کہا تو تیرے ماں باپ نے بھی یہی ہوگا کہ ہماری بیٹی ایسی نہیں ہے۔ ان کے منہ پر کالک مل آئی تا کسی کو نہ دکھانے کے قابل کہاں رہے ہوں گے۔ یہ تو کریم ہے جو بیویوں کے لالچ میں پڑ گیا۔ میں ہوتی تو منہ کالا کر کے کھر سے نکالتی۔“

وہ زمین پر تھوکتی اندر کمرے میں چلی گئی۔

سرد آستان کے کھڑی ذوباریہ کو لگا وہ زمین پر نہیں۔ اس کے منہ پر تھوک کر گئی ہے۔

☆☆☆

روشانے گھر کھانا لینے آئی تھی۔ ساجدہ کے پاس کالونی کی کچھ خواتین بیٹھی دیکھ کر سیدھا کچن میں گھس گئی۔ وہ کسی کا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ لوگ بیمار باپ سے زیادہ ذوباریہ کے قصے میں دلچسپی رکھتے تھے۔

کچھ دیر میں ساجدہ انہیں فارغ کر کے کچن میں آ گئیں۔

”ماں! تو میں نے بنادیا تھا۔“

”جی، ابو کے لیے سوپ اور دلیہ بنانا ہے۔“

”دانیال کی کوئی کال آئی؟“

”نہیں، ہسپتال بھی نہیں آئے۔۔۔۔۔“ آہ ہنسی سے کہہ کر وہ لیے کاڈ پکھولنے لگی۔

”الشاہ اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ پتا نہیں کہاں کہاں دھکے کھا رہا ہے۔“ وہ آہ بھر کے بیٹھ گئیں۔ روشانا شرمندہ ہی ہو گئی۔

”تم خودوں کر کے پوچھ لیتیں۔“

”کیا تھا۔ وہ ڈانٹنے لگ گئے کہ دوبارہ کال مت کرتا۔“

”اب واپس لا کر کیا کرے گا۔ ساری دنیا میں اشتہار تو لگ ہی گیا ہے۔ اب تو ایک ہی دعا ہے اللہ کرے نکاح کر لیا ہو۔ اور فارقتا ہے اپنے گھر رکھ لے۔“ روشانا کے اندر کسی سوال کھلانے لگے۔

”تو کیا لڑکی صرف اپنی حیا و وقار اور کردار کی وجہ سے ہماری ہوتی ہے۔ ورنہ تنکے سے بھی زیادہ ہلکی۔۔۔۔۔ اور لڑکا تانیال ہی وہ جو اس سارے عمل میں برابر کا شریک ہے وہ وہاں آ کر پھر سے زندگی شروع کر سکتا ہے اور لڑکی تانیال ہی الزام صرف لڑکی پر کیوں؟“

”جو جتنا قیمتی ہو۔ نقصان اسی کا زیادہ ہوتا ہے اور جس کا نقصان زیادہ ہو۔ محتاط بھی تو اسی کو ہونا پڑتا ہے۔ اللہ بخشے امارت کو کہا کرتے تھے۔ مرد تو مٹی کا برتن ہے۔ گر کر ٹوٹ جائے تو پھر سے تعمیر ہو جائے گا۔ مگر عورت۔۔۔۔۔ عورت تو بیش قیمت ہے۔ اس میں ذرا سی لکیر بھی آجائے تو قیمت کھودے گا۔۔۔۔۔ اور ٹوٹ کر بکھر جائے تو بھی بڑے گا؟ ہرگز نہیں۔“

”چھوڑو تانیال امی، یہ انصاف تو نہ ہوا۔“ نجمانے کیوں وہ بحث پر بحث کئے جا رہی تھی۔

”تو جا کر اللہ سے لڑو۔۔۔۔۔ جس نے مرد کو چار شادیوں کی اجازت دے دی۔ عورت کو نہیں دی حد ہو گئی۔ آج کی عورت کہتی ہے کہ مرد کو بے وفائی کی اجازت ہے تو اسے بھی ہونی چاہیے۔ بے وفائی کی اجازت نہ مرد کو ہے نہ عورت کو۔ تاجا بڑے تعلقات اللہ کی نظر میں مرد کے لیے جائز ہیں نہ عورت کے لیے۔۔۔۔۔ مگر بے وفائی کی مہر کس پر لگتی ہے؟ عورت پر کیونکہ یہ عورت پیدا کرتی ہے۔ مرد نہیں۔“

روشانے ڈر گئی۔ اس نے پہلی بار ساجدہ کو اسے غصے میں دیکھا تھا۔

”تم لوگوں کا بس چلے تو اس بات پر بھی اللہ سے۔۔۔۔۔ استغفر اللہ بحث شروع کر دو۔ جب کائنات بنی تھی تو

پہلے مرد کو کیوں بنایا۔
وہ بولتے بولتے ہاتھ پر آ پاپینہ صاف کیا۔
روشنانے نے نکل کر کہاں جا کھڑی ہوئی تھی۔

☆☆☆

”میری بات لکھ لے۔ یہ تجھے خراب کر کے چھوڑ دے گا۔ پھر کرے گا کسی شریف زادی سے شادی اس کی تو ہو جائے گی۔ تو کیا کرے گی ساری عمر گھر سے بھاگی ہوئی کھلائے گی۔“
جاتے جاتے سیکرہ جواز ہر اس کے کانوں میں گھول گئی تھی۔ وہ زواریہ کو نیلوٹل کر گیا تھا۔ روتے روتے وہ بے حال ہونے لگی اور اس کے آنسو سینے والا نہجائے کہاں تھا۔ پھر وہ خود ہی تھک کر چپ ہو گئی۔
نجانے کتنا وقت گزرا۔

پھر صائم تیزی سے اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سرخ دو پٹا تھا اور چہرہ جوش سے تہمتار تھا۔
”صائم.....“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ آنکھیں شدت کر رہے سرخ ہو رہی تھیں۔

”زہبی! روٹی رہی ہو.....“
”میں ڈر گئی تھی..... مجھے گھم واپس نہیں آؤ گے۔“

”پاکل ہو..... اتنی بے اعتباری۔“

”صائم..... اس کے لہجے میں کچھ تھا جس نے صائم کو چوکا دیا۔

”کیا بات ہے زہبی؟ دل میں کوئی بات، کوئی خدشہ ہے تو کہہ دو.....“

”مجھے واپس جانا ہے..... اس نے تو فیصلہ ہی سنایا۔ صائم ششدر سا رہ گیا۔

صائم ہنوز چپ تھا۔

زواریہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھنا چاہا تو نظر سرخ دو پٹے پر رک گئی۔ اس نے سوالیہ انداز میں صائم کو دیکھا۔

”ہاں! پھر کریم بھائی، مولوی صاحب اور گواہوں کے ساتھ آئے ہیں۔ ہم واپس چلے جاتے ہیں۔ مگر فیصلہ کرو“

نکاح کر کے جانا ہے یا نکاح کے بغیر۔“ صائم نے دو پٹے اس کے قریب رکھا اور باہر نکل گیا۔

زواریہ تذبذب کے ساتھ دو پٹے کو دیکھ گئی۔

☆☆☆

”ہاں! اچھے لگتا ہے میں نے انہیں دیکھا ہے۔“

نوٹی پھوٹی سڑک کے کنارے کھڑے اس شخص نے موبائل میں صائم کی تصویر دیکھ کر کہا تو دانیال کو لگا وہ

منزل کے قریب پہنچ گیا ہے۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے دوست کے بہنوئی اسے ایس آئی فیر وزشاہ نے بہت

راز داری سے وعدے کے ساتھ اپنے بندے دوڑا دیے تھے۔ نسرین نے جہاں انہیں دیکھا تھا وہ اور اس

پاس کے علاقے انہوں نے چند گھنٹوں میں چھان مارے تھے۔

”کہاں کہاں دیکھا تھا۔“ دانیال بے تاب ہوا۔

”میں کیوں بتاؤں۔ تم پولیس والے ہو۔“ وہ شخص مشکوک ہوا۔

”یہی سمجھ لو۔“ دانیال نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس شخص کا چہرہ چمکنے لگا تھا۔ اور آسان پر ہنسی بھی۔

☆☆☆

زواریہ نے قلم ہاتھ میں لیتے ہوئے بے حد بے یقینی اور حیرت سے سامنے پھیلے نکاح نامے کو دیکھا۔ پاس

صائم نے جوش سے مٹی بیچی۔ بس چند لمحوں کا فاصلہ تھا اور زواریہ ہمیشہ کے لیے اس کی ہونے جا رہی تھی۔
نامہ اپنے عاشق کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی تھی۔ نکاح کیا ہے یا ویسے ہی ساتھ رکھا ہوا ہے۔
زواریہ نے کلبلا تے خیال سے نظریں چرا کر پہلا سائن کیا۔
”ایسی بدکردار اور بدچلن بیٹی کو پیدا ہوتے ہی مرجانا چاہیے۔“
اس نے دوسرا پتھر کھا کر سائن کر دیے۔

”میں اس سے کیا؟ تم تو سارے گھر کو مار کر نکلی ہو۔ اب پیچھے مڑ کر کیوں دیکھ رہی ہو۔ اب جاؤ اپنی مرضی

کی زندگی گزارو۔ جوش ہونہر ہو گھر ہم سے رابطہ کرنے کی ضرورت نہیں۔“

زواریہ نے گھٹی ہوئی سانس نکالی اور آخری سائن کر دیا۔ باہر آسمان برسنے لگا تھا۔

کریم اپنے دوستوں کی دعوت پر گرجا جانے اور مٹھائی سے کرنے لگا۔

”فاتنی..... فاتی! ہمارا نکاح ہو گیا میری چھوٹی سی دلہن مائی پرس ہم ایک ہو گئے ہیں۔ اب کوئی ہمیں

الگ نہیں کر سکتا۔“ مارے خوشی کے صائم باکل ہونے لگا تھا۔

زواریہ خاموشی سے سرخ دو پٹے کی کناری ادھیڑتی رہی۔

صائم اس کے پاس بیٹھا۔

”مجھے خراب کر کے چھوڑ دے گا۔ پھر کرے گا کسی شریف زادی سے شادی۔“ زواریہ خود ہی سٹ گئی۔

”کیا ہوا؟ تم مجھے خوش نہیں لگ رہیں اور میرا دل چاہ رہا ہے۔ تمہارے ساتھ بارش میں ایک رو میٹنگ سا

ڈویٹ ہو جائے۔“

”صائم! تم مجھے چھوڑ تو نہیں دو گے۔“

صائم نے تعجب سے زہبی کے چہرے پر اڑتی ہوائیاں دیکھیں۔

کیا یہ میری قربت سے خائف ہے۔

وہ ذرا پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا۔

”ہاں.....“ زہبی کا دل دھک سے رہ گیا۔

”یہ سارے پاپڑ نہیں چھوڑنے کے لیے ہی تو پہلے ہیں۔ اتنی اسٹوڈنٹیاں کیوں کرتی ہو یا ر..... خوش

کیوں نہیں ہو..... اور مجھے دیکھو میں ہواؤں میں اڑ رہا ہوں۔ یہ سرورات برسی بارش، میں اور تم کیا ہمیں اس کے

علاوہ بھی کچھ چاہیے۔“

زواریہ نے سچن میں کھلتی بارش کو دیکھا۔

ختم مٹی کی خوشبو کو محسوس کرنا چاہا۔

مگر اس کی ساری حیات برف ہو گئی تھیں۔

”پتا نہیں عجیب بے یقینی سی ہے۔“

”یقین کر لو مائی لو..... اب تم زواریہ صائم ہو۔“

صائم نے اسے خٹھٹے ہاتھ زواریہ کے گالوں پر رکھے۔

زواریہ نے جگر جھری سی لی۔

”سردی ہو رہی ہے..... میں دروازہ بند کر دوں۔“ صائم کھڑا ہوا۔

”نہیں۔“ زواریہ بے اختیار بولی۔

”زہبی! تم مجھ سے گھبرائی ہو؟“

زہبی ہونٹ کاٹنے لگی۔ صائم کو ہنسی آ گئی۔

”صائم نکاح ہو گیا ہے۔ چلو تمہارے گھر چلتے ہیں۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔ صائم کی آنکھوں میں شرارت اور وہ پاس آیا۔ زہبی پیچھے ہٹ گئی۔ مگر صائم نے اسے زیادہ دور جانے نہیں دیا تھا۔

”تمہیں نکاح سے پہلے ڈرنا چاہیے تھا مسز۔“

زوہاریہ نے اسے زور سے دھکا دیا۔

”میں نے کہا۔ تمہارے گھر چلتے ہیں۔“

”تو بے تم نے نکاح ہوتے ہی پیٹر بدل لیا۔“ وہ ناراض ہو کر دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ پانی کی آواز سے بھگنے لگی تھی۔

”اے ابر کرم آج اتنا برس

”اتنا برس کہ ہم جانتیں“

وہ شرارت سے کلکٹانے لگا۔

زہبی ہنسنے لگی۔

”اب بارش میں کیوں بیگ رہے ہو۔“

”تو کیا کروں؟ تم تو کمرے میں بھی رکے نہیں دے رہیں۔“ دونوں ہاتھ پشت پر باندھ کر اس دروازے سے نکل گئی۔

جب ہی کمرے کا اکلوتا بلب بجھ گیا۔

”یہ..... یہ کیا ہوا۔“ وہ بوکھلائی۔

”لائٹ چمکی تھی ہے میری جان۔“

☆☆☆

”ابراہیم، گھر میں بیٹھے کیا کر رہے ہیں۔“ فائقہ چڑھ گئی۔

”تو کیا کروں؟“ ابراہیم نے غصے سے فائقہ کو دیکھا۔ سارے دن کی خواری کے بعد وہ اب گھرا آئے تھے۔

”موسم اتنا خراب ہے چائیں کہاں بھنگ رہا ہوگا۔“

”اسے بھنگ ہی لینے دو۔“

فائقہ چڑ کر روشانے کا نمبر ملانے لگی۔ مگر دوسری طرف بھی کوئی خبر نہ تھی۔

”پلیز روشانے..... جیسے ہی اطلاع ملے ضرور بتانا دو انیاں غصے میں ہے جذباتی ہے کوئی غلط فہم نہ اٹھا لے۔“

”جی، میں بتا دوں گی۔“ روشانے نے فون بند کیا۔ وہ سر دھو کر سوپ پلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر انہوں نے ہیشکل دوہی پیچ لیے تھے۔

سرمد کی آنکھوں میں سوالیہ نشان تھا۔

روشانے نے لٹی میں گرولن ملا دی۔

انہوں نے باپوی سے آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

”میں گھر کیسے جاؤں صائم۔ وہ تو مجھ سے ہر رشتہ ختم کر چکے ہیں۔“ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ دونوں چار پائی براس پاس بیٹھے تھے۔

بھی بھئی بھئی چمکتی تو اندازہ ہوتا کہ بارش کا پانی کمرے کے فرش تک آنے لگا تھا۔

”گھر نہیں جاؤ گی۔ میرے ساتھ جاؤ گی باقی جو ہو گا کل کر فیس کریں گے۔ تمہیں تمہا نہیں چھوڑوں گا زہبی۔“

”ایک دم اندر آ تھا۔“

”ارے ڈر کے صائم کے ساتھ جا لگی۔“

”مردوں ابھی کے ابھی یہاں سے نکلے۔“

”اباؤ؟“ صائم گھبرا کر کھڑا ہوا۔

”وہ لوگ تمہیں ڈھونڈتے ہوئے چوک تک پہنچ گئے ہیں..... یہاں تک بھی پہنچ جائیں گے۔ جلدی کرو۔“

”کریم! اکی بارش میں ہم کہاں جائیں گے۔“

”سوچو..... اگر پولیس یہاں آئی تو کہاں جائیں گے۔ نکلو نہ اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی پھنساؤ گے۔“

”صائم کو پکڑ کر باہر کی طرف دھکیلا۔“ وہ تو شکر ہے۔ مجھے کسی نے کال کر دی۔“

صائم نے مڑ کر زوہاریہ کے خوف زدہ چہرے کو دیکھنے کی کوشش کی مگر اندھیرا تھا۔

”آؤ زہبی۔“ ان کے پاس سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے زہبی کا ہاتھ پکڑا اور گھر سے نکل گیا۔

سر پر برسات آسمان۔

پانی سے بھری نیم پتہ گھاں۔

بارش اور وہ بھی سرد لپاں کی۔

فائقہ نے ثابت کیا تھا۔ وقت ابھی بھی ان کے لیے نامہ بیان ہے۔

بھانسنے دوڑتے ہوئے جب قدم..... بجانے وہ کہاں سے کہاں نکل گئے۔

سردی سے دونوں کے دانت جتنے لگے تھے۔

”میں اور نہیں بھاگ سکتی.....“

صائم نے ادھر ادھر دیکھا اور اسے لے کر ایک دکان کے شیفڈ تلے آ گیا۔

وہ گھر کا کنب رہی تھی اور صائم کے پاس اسے محفوظ رکھنے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ وہ خود ہی اس کا پھلتا بن گیا۔

”دوبارہ نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔“

بارش صائم پر برس رہی تھی۔ شیفڈ انہیں ڈھانپنے میں ناکام تھا۔

”ہم کیوں بھاگ رہے ہیں۔“

”تم نے سنا نہیں وہاں پولیس آ گئی تھی۔“

”ہمارے پاس نکاح نامہ ہے۔“

نکاح نامہ چیٹ کی اندرونی جیب میں تھا۔

”یہ سوال وہ بعد میں کریں گے۔ پہلے مار مار کر میری ہڈیاں توڑیں گے کہ لڑکی کو بھگایا کیوں؟“

”ہم کھر چلتے ہیں۔“

”گھر ہی جائیں گے۔ پہلے کسی سے رابطہ تو کر لیں۔“

”اگر رابطہ نہ ہوا تو یو پی سڑکوں پر خوار ہوں گے.....“

صائم کے جواب دینے سے پہلے ہی گاڑی کی تیز لائٹ ان پر پڑ گئی۔

(بقیہ آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

پہلے پرغمال



”وہ کس قدر بدل گئی تھی۔ میری تو حیرت ہی نہیں ختم ہو رہی..... ایسا لگتا تھا میں کسی انجان بالکل مختلف انسان سے ملا ہوں..... کہاں وہ پہلے سا گھمنڈ، خود پر گمان کہاں وہ اپنی بات منوانے کا جنون اور کہاں اب..... ہا ہا..... اب تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے کسی جلتی آگ پر ڈھیر سارا پانی ڈال دیا ہو..... بس ابھی بھی دھواں سا تو اٹھتا محسوس ہے، جس سے ہلکی سی آج بھی آتی ہے مگر پھر بھی وہ لپکتا، وہ بھڑکتا..... سب ختم.....“

جی بات تو یہ ہے کہ جب میں نے اسے گاڑی سے باہر نکالا تو میں تو اس کی حالت دیکھ کر ڈر گیا تھا۔ شرار نے فکر بھی اسی کی سائز پر براری تھی اور اتفاق سے وہ پیچھے آگھ بند کے سوری بھی لہذا وہ خود کو سنیاں بھی نہیں مٹکی۔ کہہ دیک کا شیشہ ٹوٹ کر اس کے ہاتھوں، گردن اور پتا نہیں کہاں کہاں چھتا تھا، جس سے اس کا چہرہ، ہاتھ، کندھے سب لہلہا ہوا ہو گئے تھے مگر وہ..... وہ تو ایسی پرسکون اور خاموش تھی، جیسے اسے کوئی تکلف ہی نہ ہوئی ہو.....

شکر ہے کہ فوراً ہی ایک مہربان انسان نے ہمیں لفٹ دے کر ہسپتال پہنچا دیا، جہاں ایمر جیسی تک پہنچتے پہنچتے وہ اسی خاموشی سے بے ہوش بھی ہو گئی اور میں..... میں تو بہت ڈر گیا تھا..... پہلے جیسے اسے کھویا تھا۔ دوبارہ کھونے کے خیال سے میرا تو سانس ہی بند ہو گیا تھا۔ بس کیا بتاؤں..... میں کس قدر پریشان ہو گیا تھا اور اس ایک خیال کے بعد ہی مجھے شدت سے خود پر غصہ آیا تھا۔ میں یہ کیا بے وقوفی کرتا رہا ہوں، میں تو شاید واپس ہی اس کے لیے آتا تھا مگر یہاں آ کر مجھے پتا نہیں کیوں اس کو سزا دینے کا شوق

ہو گیا اور میں پاگلوں کی طرح پتا نہیں کیا کیا کرتا چلا گیا شاید صرف اسے دکھانے، اسے جلانے کے لیے وہ پہلے والی ہوئی تو کب کا مجھ پر باقاعدہ قاتلانہ حملہ کر چکی ہوئی مگر اب وہ.....

وہ اس قدر بدل گئی ہے۔ اس قدم خاموش ہو چکی ہے، جیسے اس نے سب کچھ خاموشی سے سہہ لینے کی قسم کھائی ہوئی ہو۔ جہاں پہلے اس کی پاپٹ چلتی زبان مجھے پہنچتی تھی ویسے ہی اس کی خاموشی میں بھی اگک قسم کی کش محسوس کی میں نے..... جیسے وہ کچھ کہہ رہی ہو..... مجھے مخاطب کر کے سب ہی کچھ تو بتا رہی ہو، بس میں خود ہی انجان بننا چھڑتا رہا یا پھر انجان بننے کی کوشش کرتا رہا..... مگر اب..... اب برداشت نہیں ہوتا مجھ سے.....“

سعد کب سے بول رہا تھا اور رضوان..... بہش کی طرح بولنے دے رہا تھا۔ دوستی کوئی بہت پرانی نہیں، یہی کوئی پانچ چھ سال کا ساتھ ہوگا۔ امریکہ کے مصروف ترین شہر نیویارک میں دونوں ایک ہی آفس میں کام کر رہے تھے اور ہم وطن بھی تھے، جس کی وجہ سے دونوں بہت جلد مل مل گئے۔

رضوان نیویارک میں اپنی نئی نوکری کی ہوا کے ہوا چندرہ بیس سال پہلے آیا تھا لہذا سعد سے کہیں زیادہ وہ نیویارک سے واقف تھا اور سعد کو اس نے کراہ کا فلیٹ لینے اور پھر نیویارک میں پاؤں جمانے میں مدد کی تھی۔ اس کے علاوہ رضوان کی بیوی ایک ملٹری عورت تھی۔ اسے تیس کرنے کا شوق تھا اور کوئی ہم زبان نہ ملتا تھا سعد کی صورت اسے بھی ایک چھوٹا بھائی مل گیا تھا اور اکثر ویک اینڈ سعد، رضوان کے گھر پر گزارتا تھا۔

پاکستان میں سعد اور رضوان کے گھر والوں میں

ہی تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ چند ہفتوں پہلے رضوان اپنی سالی کی شادی میں شرکت کرنے کراچی جانے لگا تو سعد کو اس کے بغیر نیویارک میں اکیلے رہنے کے خیال سے کوفت ہونے لگی۔ ادھر سعد کی والدہ بھی اپنے اکلے کو پانچ چھ سالوں سے نہ دیکھنے کے باعث دنگی اور ہی نہیں لہذا دونوں دوستوں نے ایک ساتھ ہی

چھٹیاں لے کر کراچی جانے کا پلان بنالیا تھا..... دسمبر کا مہینہ اور کراچی کی ہلکی سرسبزیوں میں ہر طرف شادی بیاہ اور طرح طرح کی محفلوں کا عروج تھا۔ جہاں رضوان اپنی سالی کی شادی کے ہنگاموں میں مصروف تھا تو سعد بھی اپنے گھر والوں کے ساتھ مختلف تقریبات میں آ جا رہا تھا۔ مردوں دوست دو

چار دنوں کے وقفے سے ضرور مل رہے تھے۔ سعد ہمیشہ کی طرح رضوان کو اپنی حالیہ مصروفیت کے بارے میں بتاتا رہتا تھا۔

چند سالوں میں رضوان نے سعد کو خود سے اس قدر مانوس کر لیا تھا کہ اب سعد اس کے ساتھ دل کی ہر بات کہہ لیتا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی کہ سعد کو کچھ دار، بردبار اور عمر میں دس سال بڑے رضوان میں وہ تمام خوبیاں دکھائی دے گی جنہیں جو ایک انسان کو بھر دوسا منہ بناتی ہیں۔ رضوان کی خاموش اور سادہ طبیعت نے بھی سعد کو مانوس نہیں کیا، وہ جب بھی رضوان سے ملتا اسی طرح اپنے دل کی بات کرتا۔ اسی طرح بے ٹکناں بولتا حالانکہ سعد کی کم گوئی کا اس کے گھر والوں کو گلہ ہی رہتا مگر رضوان کے سامنے اس کی زبان کھل جاتی اور ابھی بھی چند ہی منٹوں کی علیک سلیک کے بعد سعد نے اپنی تمام باتیں رضوان کے گوش گزار کر دی تھیں۔

”اور ہم اس وقت روہینہ جلال کی بات کر رہے ہیں؟ ہے ناں؟“

رضوان نے سعد کو سانس لینے کے لیے رکتے دیکھ کر اپنا حصہ ڈالا۔ سعد نے جیسے چونک کر رضوان کو فور سے دیکھا اور بے اختیار اپنے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

”ہاں تو اور کیا؟“ سعد کا سوال پر سوال سن کر رضوان مسکرا گیا۔

”کیونکہ آج کل تم بہت زیادہ سارہ میں کھلے ملے ہوئے ہو تو میں سمجھا شاید باتیں بھی اسی کی ہی کر رہے ہو گے کیونکہ حادثے کے وقت بھی تو وہ ساتھ ہی ناں؟“

سعد کی حیرت ابھی تک برقرار تھی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ رضوان جان گیا ہے کہ وہ روہینہ عرف روہی کے بارے میں بات کر رہا ہے مگر اس نے جان بوجھ کر سعد کی توجہ سارہ کی طرف کروائی اور ایسا رضوان نے کسی طرف اشارہ کرنے کے لیے ہی کیا ہے مگر وہ کیا بات ہے جس کا احساس ابھی تک سعد کو بھی نہیں ہوا اور رضوان جو سارہ سے شاید ایک باہری

ملا ہوگا، اسے ہو گیا تھا۔

سعد نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ وہ اس وقت صرف اور صرف روہی کی بات کرنا چاہتا تھا، بس اسے ہی سوچنا چاہتا تھا۔ رضوان کی رائے، روہی کی شخصیت کے کسی پہلو پر ہلکے پھلکے انداز میں توجہ دلانا اور بس۔ وہ چاہتا تھا رضوان سعد کو مطمئن دلانے کے روہی ہی اس کے لیے مناسب ہے۔ روہی ہی اس کا مستقبل ہے اور سعد کا فیصلہ سو فیصد درست ہے۔ ایسے میں سارہ کی بات سچ میں آ جانیے سعد کو عجیب بے چینی بلکہ بے قراری محسوس ہوئی تھی مگر وہ رضوان کو سمجھتا تھا اور چاہتا تھا کہ رضوان نے اگر یہ بات شروع کی ہے تو وہ خود ہی سعد کو روہی کو پس منظر میں ڈال کر سارہ کو سامنے لانے کی وجہ بھی بتا دے۔

”بات یہ ہے کہ آج کل تم ہر محفل میں سارہ کے ساتھ نظر آتے ہو۔ اس کے ارد گرد اس کا خیال کرتے ہوئے۔ ایسے میں اگر تم کسی سے بھی بغیر تمہید ناندھے کسی ”لڑکی“ کے بارے میں بات کرنا شروع کر دے گی جگہ جگہ جی ہوگا، وہ یہی سمجھے گا کہ تم سارہ کے علاوے میں بات کر رہے ہو، کیا سمجھے؟“ آخر کار رضوان نے زیر لب مسکراتے ہوئے وجہ بتائی۔

”ہمم۔۔۔ ہم۔۔۔ مگر میرا سارہ کے ساتھ ہونے کا مطلب تو میرے خیال میں سب کی ہی سمجھ میں آ رہا ہوگا۔ وہ تو میں سارہ کا خیال صرف اس لیے کر رہا ہوں کہ وہ میری وجہ سے اس حال کو پہنچی۔ اس کو میری وجہ سے آج کل بیساکھی کے ساتھ ہر جگہ جانا پڑتا ہے اور ایسے میں کسی محفل میں اسے اس طرح کوئی گھر مجھے شدید احساس جرم ہوتا ہے اور میں ایسے ہی کہن کا خیال رکھتا ہوں۔۔۔ اپنا فرض سمجھ کر۔۔۔“ سعد اب تک ایک کراچی صفائی دینے لگا تو رضوان نے سچ میں لٹو کا۔

”تمہارے دلائل اپنی جگہ، مگر دیکھنے والے تمہارے احساس جرم کو نہیں دیکھ رہے۔ بس یہ دیکھ رہے ہیں کہ تم آج کل سارہ پر محدود ہر بیان ہو۔ رضوان نے اپنے دھیمے انداز میں اچھے ہوئے دھاکے کو سلجھنا شروع کیا۔

”جب کہ تمہاری ہی زبانی میں نے جانتا تھا کہ اس کا زہی میں جس کو تم چلا رہے تھے اور جس۔۔۔ حادثے کے باعث سارہ کی ٹانگ میں چوٹ آئی، اس کا زہی میں صرف سارہ نہیں، روہی بھی موجود تھی۔۔۔ ابھی تم روہی کے بارے میں بے ٹکناں بول رہے ہو مگر حیرت ہے کہ ایک بار بھی تم نے روہی کی طبیعت کے بارے میں اس سے ملاقات نہیں کی۔ تم صرف سنی سنائی پر دھیان دے بیٹھے ہو، اسی پر اطمینان سے ہو کہ تمہاری والدہ تمہیں اشاروں میں سمجھا دیتی ہیں کہ روہی اب بہتر ہے۔ تم نے مجھے بتایا کہ سارہ اور روہی کی تکالیف میں زمین آسمان کا فرق تھا جس کا ثبوت یہ ہے کہ سارہ اس حادثے کے دوسرے ہی دن سے ہر جگہ دیکھی جا رہی ہے مگر بیساکھی کے ساتھ جب کہ حادثے کے بعد سے روہی منظر سے مکمل غائب ہے۔۔۔ شاید اسے اس طرح محفلوں میں یا پھر شادی عیاد میں خود کو لاغر، کمزور یا پھر لنگراتے دکھانے کا شوق نہیں۔ یا یوں کہو کہ وہ جنہیں اس شرمندگی سے بچا رہی ہے جس شرمندگی کو سارہ پہنچنے پر چندہ دنوں سے تم پر مسلط کیے ہوئے ہے؟ دوسری اہم بات یہ کہ احساس جرم تمہارا صرف سارہ کے لیے ہی کیوں اٹھ کر سامنے آ رہا ہے۔ کیا ابھی تک تم نے روہی کے گھر جا کر اس کی عیادت کی؟ اسے ایک بار بھی بتایا کہ تم شرمندہ ہو کہ تمہاری گاڑی میں تمہاری ڈرائیونگ کی بدلت روہی کو یہ سب سہا پڑا؟“ رضوان کی بات پر سعد بڑا گراہ گیا تھا اور اس کے چہرے پر یہ ہوا یاں اڑنے لگیں۔

”بات یہ ہے کہ روہی ایک باہری مجھ سے کہیں تو میں اس سے معذرت کر لیتا۔۔۔ پھر گھر۔۔۔ گھر۔۔۔ میں یہ توجہ ہے کہ اس کے گھر والے۔۔۔ وہ۔۔۔“

سعد نے ایک بار پھر وجہ بیان کرنے کی کوشش کی تو میں اس سے معذرت کر لیتا۔۔۔ پھر گھر۔۔۔ گھر۔۔۔ میں یہ توجہ ہے کہ اس کے گھر والے۔۔۔ وہ۔۔۔“

میرے دوست۔۔۔ روہی کے گھر جانے پر تو آپ کو صرف اس کے گھر والوں سے ملنے میں قیامت محسوس ہو رہی ہے اور یہاں محفل میں سارہ کے ارد گرد پھرنے سے تو آپ پوری کی پوری سوسائٹی کو سارہ پر اپنا مہر بیان ہونا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ آپ بھی یہ بات اچھی طرح سمجھ رہے ہیں کہ سارہ کو اس طرح کی تکلیف نہیں کہ وہ ابھی تک بیساکھی استعمال کرتی رہے کیونکہ حادثے کا تمام تر زور گاڑی کے پھٹنے جسے کی طرف تھا، جہاں صرف روہی موجود تھی۔۔۔ آگے بیٹھے ہونے کے باعث جہاں ہمیں معمولی خراشیں آتی ہیں، اسی طرح سارہ کو کبھی معمولی سی چوٹ لگی ہوئی اور اس بات کی تصدیق ہسپتال پہنچ کر بھی ہو گئی تھی۔۔۔ پھر بھی آپ جہاں انسان سارہ کی اس ڈرامے بازی میں مکمل اس کا ساتھ دے رہے ہیں اور یہ ڈراما بازی تمام لوگ یہاں تک کہ سارہ کے گھر والے بھی دیکھ رہے ہیں اور تا صرف دیکھ رہے ہیں بلکہ ایک طرح سے اپنی رضا مندی بھی دے چکے ہیں۔ تب ہی ابھی تک آپ دونوں میں سے کسی کو بھی تشویشی اشارے نہیں ملے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اب تک تو آپ دونوں ایک ساتھ اس قدر مشہور و معروف ہو چکے ہوں گے کہ کارڈ چھپوانے کی دیر نہ گئی ہے۔“

رضوان کی باتوں نے ایک دم بحث کا رخ موڑ کر رکھ دیا تھا۔ سعد کو اب جا کر احساس ہو رہا تھا کہ وہ کس قدر احمق ہیں دکھاتا رہا ہے۔ ایک طرف سارہ اور اس کے گھر والوں کو امید دینا اور دوسری طرف جہاں یہ سب باتیں گھر بیٹھے رضوان تک پہنچ رہی ہیں تو کیا روہی کو پتا نہیں چل رہا ہوگا؟

رضوان تو خیر رشتہ داروں میں سے نہیں مگر روہی کے گھر والے تو ہر اس محفل میں موجود ہوتے ہیں، جہاں سارہ اور سعد پائے جاتے ہیں۔ آخر کو سارہ روہی کی چھوٹی زاد بہن ہے۔ دونوں کے خاندان والے آئے دن ملتے ہوں گے، انہوں نے روہی کو سعد اور سارہ کے متعلق کیا کیا نہیں کہا ہوگا۔ اس نے خیالوں میں ہی روہی کی دونوں شادی

شده بہنوں کو روٹی پر طنز مارتے دیکھا۔ وہ جانتا تھا اصل میں وہ روٹی کے گھر اسی لیے نہیں گیا کیونکہ وہ ان لوگوں سے واقف تھا۔ تنگ مزاجی اور بات بے بات طبیعت کی برہی روٹی کے گھر والوں میں بدرجہ اتم موجود تھی۔

☆☆☆

روہینہ جلال سے اس کی دوستی کانچے سے شروع ہو کر یونیورسٹی کے آخری سال تک چلی گئی اور وہ اس دوران کئی بار روٹی کے گھر گیا تھا۔ کئی بار وہ لوگ روٹی سمیت سعد کے گھر آئے تھے۔ دونوں خاندانوں میں حیثیت، اختیار اور ذہانت کا فرق بہت واضح تھا۔ سعد کے گھر والے متوسط طبقے کے فراخ دل اور فراخ ذہن لوگ تھے۔ سعد کے والدین نے اپنے بیٹے تینوں بچوں کی تربیت پڑھے لکھے ماحول میں کی تھی اور کیونکہ روٹی کے ہاں پیسے کی ریل چل اور خاندانی نوابی کا بہت زعم تھا۔

اس کے گھر میں لڑکیوں کی پڑھائی لکھائی پر کوئی روک نہ تھی مگر گھر کا ماحول ایسا تھا کہ روٹی کی دونوں بہنوں کی کم عمری میں شادیاں کر دی گئی تھیں۔ گھر کا ماحول کچھ اس وجہ سے بھی ڈسٹرب تھا کہ روٹی کے بچپن میں ہی اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا جبکہ والد بھی زیادہ تر بینک میں رہتے اور کم ہی بچیوں سے بات چیت کرتے، جس کے باعث روٹی کو دہری تنہائی کا احساس رہتا۔ بھائی کوئی تھا نہیں، گھر اس کی چھوٹی چھوٹی کی اجارہ داری تھی۔ روہینہ دونوں بہنوں کی طرح اپنے گھر کی ہونے کے بجائے آگے پڑھ کر ڈگری لینا چاہتی تھی۔ شاید اسی تنہائی، اکیلے پن اور نواب زادی ہونے کے باعث روٹی کے مزاج میں کھنڈ، ضد اور بلا کی خورسری تھی مگر اسے سعد اور اس کے گھر جانا جیسا لگتا تھا۔ اسے سعد کے والدین کا اپنے بچوں کے ساتھ دوستانہ ماحول، بہت بھانا اور وہ اکثر جذباتی ہو کر سعد کو بتاتی کہ وہ بھی اپنے بچوں کو ایسا ہی رکھے گی اور ایسے ہی ان کے ساتھ دوستی کرے گی کہ پھر باہران کو کسی بھی امر سے غیر سے دوستی

نہیں کرنی پڑے گی۔ وہ اپنے بچوں کی ہم راز بن رہی تھی۔

اکثر اوقات سعد دیکھتا کہ روہینہ کلاس میں کتاب یا پیچر نوٹ کرنے کے لیے اپنا رجسٹر کھول رہی ہے اور اس میں اس کی مرحومہ والدہ کی تصویر موجود ہے۔ وہ جب بھی روٹی کو اپنے دے ہوئے نوٹس واپس لیتا یا پھر اس سے کوئی کتاب چند دنوں کے لیے لیتا تو احتیاطاً ایک بار صفحے الٹ پلٹ کر تصویر دھونڈ لیتا جو اکثر مل جاتی۔

روٹی کے لیے سب سے پسندیدہ موضوع اس کی والدہ تھیں۔ وہ اکثر کہتی کہ دنیا جتنی بے کار اپنے بچے کے ساتھ کچھ برائیاں کر سکتی مگر ایک ماں جب اپنے بچے کے ساتھ برا کرتی ہے تو وہ بس اتنا ہی کہہ کر مرنے والی ہے۔ یہ سوچے بغیر کہ بن ماں کے بچے کی زندگی تو ایسی ڈرائنگ بک جیسی ہوتی ہے جس میں ہر طرح کے پھول، پودے، مشہور کارٹون ہیرو تک کہ سب کے چرند پرند تو بنے ہوئے ہوں مگر یہ رنگ اور پچھلے..... پچھلے عزم میں کتنے گراؤ ہے کہ اسے دنیا اتنی خالی، پچھلی اور بدمعاش کیوں ہے؟

☆☆☆

ایسا کئی بار ہوا کہ روٹی خند میں نظر آتی۔ ایک عجیب سی بے حسی اس کی شخصیت پر چھا جاتی، جس کی زیادہ تر وجہ روٹی کی چھوٹی چھوٹی ہونیس۔ اسے ایسے میں روٹی کا موڈ اچھا کرنے کی کوشش کرتا۔ زیادہ تر اس کا موڈ دو چار دن کی سختی کے بعد خود ہی بحال ہو جاتا جس کے بعد سعد کی باری آتی۔ وہ خوب مزاح دکھاتا۔

اتنے عرصے ساتھ رہنے سے سعد کو روٹی کی چھوٹی چھوٹی کے اس کے خاندان پر اجارہ داری اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا۔ بقول روٹی کے اس کی والدہ کے انتقال کے بعد اس کی چھوٹی چھوٹی نے کمال چالاکی سے اسے اس کی بڑی بہنوں، گھر، کاروبار یہاں تک کہ اس کے والد کو بھی پریشان بنایا تھا۔

اور اس بات پر اپنی پھوپھی سے ناراض رہتی کہ وہ اس کی بڑی بہنوں کی طرح اسے آگے بڑھنے دیتی ہیں۔

وہ اکثر کہتی کہ اس کی پھوپھی ہمیشہ اپنی مرضی اس کے متعلق ہر جگہ اور خاص طور سے روٹی کے والد سے بات کرتی رہتی ہیں۔ جیسا کہ انہوں نے روٹی بہنوں کے سلسلے میں کیا کہ اپنی ہی طرف سے کسی بھی آئے ہوئے رشتے کو اپنے بھائی کے سامنے یہ کہہ کر منظور کروایا کہ ان کی بیٹی کی بھی یہی مرضی ہے۔ یہ رشتے کے بارے میں اس کی بہنوں کو خبر بھی نہ تھی پھر اس کی بہنوں کو کوئی فرق اس لیے بھی نہیں پڑا کیونکہ وہ خود بھی یہی چاہتی تھیں کہ اس اکیلے پن سے ان پر..... جب کہ روٹی اپنی ذات کے لیے ایسا نہیں ہونے دیتی۔

وہ اپنے فیصلے خود ہی لیتی تھی اور اس کا موڈ اسی بات پر اکثر خراب ہوتا کہ پھوپھی نے اپنی ہی طرف سے روٹی کی ذات کے لیے کوئی فیصلہ صادر کر دیا تھا۔ وہ جھجھکا کر اس بات پر حسرت کا اظہار کرتی کہ اگر اس کے والد سعد کے والدین کی طرح اپنی بچیوں کے لیے خود بات کیوں نہیں کر سکتے؟ کیا بچوں اور باپ کے درمیان اس قدر دوری ہونی چاہیے جبکہ بیچ میں ایک نیا انسان کی ماں کا وجود بھی موجود نہ ہو؟ روٹی کی اس طرح کی گفت و گو زندگی پر سعد کے والدین کو بھی اذیت دیتا۔ خاص طور سے سعد کی والدہ روٹی کو بہت پیار کرتی تھیں اور روٹی بھی ان کا احترام کرتی۔

سب کچھ تو اچھا ہی جا رہا تھا کہ یونیورسٹی کا پہلا سال آ گیا۔ سب کو اپنے مستقبل کی فکر تھی۔ روٹی ڈگری لینے کے اب تک کے سفر میں کافی تھک گئی تھی۔ جس کی وجہ سے سعد اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کی والدہ نے ہر سمسٹر میں سعد کی حوصلہ داری کی اور آگے بڑھنے اور اچھا رزلٹ دکھانے پر اس کی مدد کی۔ روٹی نے گھر میں ہر سمسٹر کے شروع ہونے پر روٹی کو ایک نئی طرح کی باقاعدہ جنگ کے لیے تیار کر دیا تھا۔ اس کی پھوپھی بالا ہی بالا اس

کے والد سے کہہ کر کہیں نہ کہیں روٹی کے رشتے کی بات بڑھا دیتی تھیں۔

اور پھر خاندان والے کیا کہیں گے کہ رشتہ بھیج کر کر گئے یا پھر رشتہ منظور کر کے کیسے میاں جاسکتا ہے؟ جیسے دلائل دے کر روٹی کو شادی کرنے پر مجبور کر دیں۔ آئے دن روٹی اپنے محاذ پر ڈٹی نظر آتی۔ پوری کلاس میں وہ "یرغمال" کے نام سے مشہور تھی۔ دونوں کی زندگیوں کی مشکلات بھی کس قدر مختلف تھیں، جہاں سعد پڑھائی کے دوران خوش و خرم رہتا تو روٹی پریشان اور اب سعد ڈگری حاصل کر لینے کے بعد نوکری حاصل کرنے کے لیے پریشان تھا تو روٹی آخر کار ڈگری یافتہ ہونے کی خوشی میں سرشار تھی۔

☆☆☆

اس کے جانے سے پہلے سعد کے والدین نے روٹی کے گھر والوں کو اپنے گھر دعوت دی تھی، جس میں اشاروں میں سعد کی والدہ نے روٹی کے متعلق اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی کر دیا تھا جس کو تنبیہ کی سے صرف روٹی نے ہی لیا تھا۔ سعد کے امر کے پیشینہ ہی ایک طرف وہ نئی جگہ غیر ملک میں اپنے پاؤں جمانے میں مصروف تھا تو دوسری طرف اسے اپنے دوستوں کے ذریعے روٹی کے متعلق مختلف خبریں ملتی رہتیں۔ سعد کی تقریباً روز ہی روٹی سے واپس آئے۔ روٹی نے سعد کی غیر موجودگی میں روٹی سعد کے گھر بھی آئی جاتی تھی مگر ان تمام خبروں کے متعلق سعد نے بھی روٹی سے تصدیق نہیں کی بلکہ اس نے سائرہ سے بات کرنی شروع کر دی تھی۔

سائرہ، روٹی کی بڑی پھوپھی کی بیٹی تھی اور ان دونوں سے ایک سال جونیئر تھی۔ اکثر اوقات وہ روٹی سے ملنے کلاس میں آ جاتی جس کی وجہ بڑی پھوپھی کا چھوٹی پھوپھی کے لیے کوئی پیغام ہوتا۔ روٹی اور سائرہ کی کم ہی بات تھی۔ سعد نے بات اچھی طرح جانتا تھا اور جان بوجھ کر سائرہ سے بات کرتا رہا تھا۔ مگر بات چیتی تو وہ نہیں کرتی تھی لہذا ایک دن روٹی نے سعد کو

باقاعدہ فون کر کے سائرہ اور سعد کے آپس میں اس قدر گھٹنے ملنے پر اپنے تحفظات کا اظہار کیا تھا اور سعد نے اپنی بی بی بے دوشی میں اس سے سچ پوچھنے کے بجائے یہ کہہ کر غصہ دلایا تھا کہ سعد جس سے چاہے دوستی کرے اور روہی کے پاس سعد کو روکنے کا فی الحال کوئی حق نہیں ہے، جس کے بعد سے روہی نے سعد سے بات کرنی بند کر دی تھی اور سعد چاہہ کر بھی روہی کو مانتا نہیں رہا تھا۔

اپنی کسی بات پر اتنے برسوں کا بار نہ چلا گیا تھا اور سرزمین کی حق سعد کی نظر میں روہی ہی تھی۔ اسے اپنی کسی بھی بات پر کوئی شرمندگی نہیں ہوتی تھی۔ اس وقت تک جب تک کہ اس نے تمام باتیں رضوان کو نہیں بتائی تھیں..... رضوان نے اسے سمجھا یا تھا کہ سعد کو جب کے روہی والی ایپ پر مرسٹری تو اسے بھی روہی کے متعلق ملنے والی خبروں پر اسی سے بات کرنی چاہیے تھی جبکہ وہ روہی کے گھر والوں کو بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ حیرت تو اس بات پر بھی کہ روہی اسی باقاعدگی سے سعد کے گھر آ جانا کر رہی تھی، جیسے وہ سعد کی والدہ کے اشارے کیے گئے وعدے پر ابھی تک اعتماد کیے بیٹھی ہو۔

سعد بھی ایک طرح سے مطمئن ہو گیا تھا اور سوچتا تھا کہ ملنے پر ہی اپنی بے دوشی کا کھل کر اظہار کر کے روہی کو منالے گا۔ امریکہ سے واپسی پر رضوان نے سعد کو سمجھا یا تھا کہ وقت ضائع کیے بغیر سعد اپنے والدین کے ہمراہ روہی کے گھر چلا جائے مگر کراچی پہنچنے کے دوسرے روز ہی ایک کلاس فیلو کی شادی میں جب پہلی بار سعد، سائرہ اور روہی اکٹھے ہوئے تو تمام تر گوشوں کے باوجود سعد روہی سے کھل کر بات نہ کر سکا۔ دوسری طرف سائرہ، سعد سے سائے کی طرح چٹ گئی اور یہی وجہ تھی کہ واپسی پر جب سعد نے موقع دیکھ کر روہی کو اپنی گاڑی میں گھر چھوڑنے کا کہا تو اس سے پہلے کہ روہی کوئی جواب دیتی، سائرہ نے دونوں کی طرف سے ہائی بھری اور بعد میں سعد کو معلوم ہوا کہ اب روہی کے گھر پر چھوٹی

چھوٹی بھی کے ساتھ ساتھ بڑی چھوٹی بھی مع عیال رہنے لگی ہیں۔

اسی وقت فون کر کے گھر سے آنے والی گاڑی منع کر دیا گیا اور سائرہ نے فون پر ہی اپنی والدہ کو اطلاع دے دی۔ سعد کے ساتھ ہی آ جاتا رہا۔ روہی کی خاموشی سعد کو بہت کھل رہی تھی۔ ایسی بالکل نہیں تھی، خاص طور سے پہلے بھی سائرہ سعد کے ساتھ بہت زیادہ شوخ ہوئے لگتی تو اسے بری طرح جھڑک دیتی مگر اب تو جیسے روہی کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ سعد روہی سے زیادہ سائرہ سے دلچسپی رکھتا ہے۔ واپسی کے سفر پر سعد کی گاڑی کو سائے سے ایک تیز رفتار ڈرائیور نے نگرانی جس کے نتیجے میں روہی کو تین چار دن ہسپتال میں رہنا پڑا جبکہ سائرہ اور سعد کو معمولی مرہم بنی کر کے فارغ کر دیا گیا تھا۔

سعد کی والدہ کی باروہی کی عبادت کرنے اور اس کے گھر جا چکی تھیں مگر سعد ہمت کر کے بھی ساتھ نہیں گیا تھا اور اب ایک نئے قسم کا کھیل شروع ہو گیا تھا کہ اچانک سعد کے گھر والوں کو ان کی طرف سے شادی بیاہ، ویسے اور حقیقی کی دعوتیں ملنے لگی تھیں جس میں سائرہ اور اس کے گھر والے بھی موجود ہوتے۔ نتیجہ یہ کہ اب سعد اور سائرہ ایک ساتھ دیکھے جانے لگے تھے۔

”جب کسی مضبوط انسان سے اس کے روہی فیصلے پر بات کرو اور وہ جواب میں ہاں یاں کہہ کر بات نمٹا دے تو ہمیں اس کی ہاں یاں پر یقین کر پڑتا ہے۔ یہ ایک طرح سے ہم سے اس مضبوط انسان کا مطالبہ ہوتا ہے کہ چاہے اس کے خلاف کتنی بھی چال گونیاں نہیں، صرف اس کی ہاں یاں پر یقین رکھیں۔ اگر تم اتنا بھی نہیں کر سکتے تو پھر کیا فائدہ اتنے دنوں کی دوستی اور ساتھ کا؟“

رضوان نے سعد کی لمبی خاموشی کے بعد آخر کار کہنا شروع کیا..... سعد نے پہلو بدل کر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا چاہا تو رضوان نے ساتھ کے اشارے سے

روک دیا۔

”تمہاری احساس کمتری تمہیں بہانہ بنا رہی ہے۔ تم نے کہہ کر روہی اس قدر مضبوط انسان ہے کہ اسے یا تمہاری والدہ کے کیسے گئے وعدے پر اس سے ہی کسی مگر ہر عاز پر ڈٹی رہے گی۔ تم سے روہی کو بھی نہیں کرے گی۔ تم یہ بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ تم نے اگر روہی سے ان افواہوں کے خلاف میں پوچھا تو روہی صاف انکار کر دے گی۔ میں تمہارے پاس چارہ اس کی ”نہ“ پر صرف انکار کرتا تھا مگر تم سے اتنا ہی نہ ہو سکا۔ تمہیں اس سے حیرت تھی کہ روہی جیسی لڑکی بھلا تم جیسے لڑکے کے ساتھ اتنا عرصہ یہ سب کچھ کیوں سمجھے گی.....

الہام اپنے احساس کمتری میں ان افواہوں کو یقین میں بدلنے کے لیے جت گئے مگر یہ یاد رکھو کہ سائرہ دوستی کرنے پھر اس کے ساتھ کھونٹے بھرنے تک کے تمام عرصے میں تم نے روہی کو نہیں بلکہ صرف خود کو دیکھا کیا ہے.....“

رضوان جانتا تھا کہ اس کی خت باتیں سعد کو دبا دلا سکتی ہیں مگر اسے حیرت ہوئی جب سعد غصے میں آنے کے بجائے صوفے میں دھنسا پڑا۔ رضوان نے اپنے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ ”کیوں کہ روہی کی بات پسند کی کہ وہ اپنی غلطی کا پڑے جانے والے سیدھے دلائل دینے کے بجائے اپنی غلطی پر شرمندگی کا اظہار کر دیتا تھا۔“

”تو اب مجھے کیا کرنا چاہیے، میں تو واقعی پھنس گیا ہوں؟“ سعد شرمندگی سے بولا۔

”تمہارے پاس اب ایک یہی چل بچا ہے کہ ہمارے والد اپنے والدین کو روہی کے گھر لے جاؤ اور ان کے ہاں پر سائرہ بھی رہتی ہے تو تمہارے والدین کو چاہیے کہ روہی کے والد سے بات بڑھاتے ہوئے صاف گفتگوں میں روہی سے تمہارے رشتے کی بات کریں اور.....“

رضوان ابھی بات کر رہی رہا تھا کہ سعد جلدی پھول پڑا۔

”مگر یہ سب کچھ سننے اور دیکھنے کے بعد کیا روہی چاہے گی کہ میں اپنے والدین کو اس کے گھر لے کر پہنچوں اور..... اور اس نے انکار کر دیا تو.....؟“

سعد نے جتنی بھی رضوان مسکرا دیا تھا۔ ”جہاں تک میں اس لڑکی کو سمجھا ہوں، وہ ایسا نہیں کرے گی۔ وہ تمہاری طرح کسی ستانی پر یقین کرنے اور اس کی وجہ سے اپنے فیصلے بدلنے کی غلطیاں نہیں کرتی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اب تک انتظار ہی کر رہی ہے۔ اس بات کا کہ تمہیں اپنا وعدہ وفا کرنے کا خیال آئے اور اس بات کا بھی کہ تم اپنے وعدے سے کھل کر کرتے ہو۔ دونوں صورتوں میں وہ جب تک باقاعدہ کوئی اعلان نہیں سن لے گی، اس عاز پر ڈٹی رہے گی۔ جس عاز پر تم اسے کھڑا کر کے گئے تھے۔ یوں سمجھو کہ تم کو نہیں چھوڑے گی، جب تک کہ تم اسے نہیں چھوڑ دیتے۔ کچھ لوگ آزاد ہو کر بھی دوسروں کی سوچ اور نظریوں کے غلام ہوتے ہیں، ان کی اپنی عقل پر بھی ہوش دھواں کے دروازے نہیں کھلتے۔ وہ اپنے لیے فیصلے کرتے ہوئے ہمیشہ دوسروں کی رائے نہیں بلکہ ان کے فیصلے مانگتے ہیں جبکہ کچھ لوگ پرغمال ہو کر بھی آزاد روح ہوتے ہیں۔ ان کا دماغ کسی کی باتوں میں آ کر بہکتا ہے اور نہ ہی وہ اپنی ذات کے متعلق اپنے کیے فیصلوں پر کبھی دوسروں کی باتوں میں آ کر رو و بدل کرتے ہیں..... سمجھے کہ نہیں؟“

سعد کے خاموشی سے اٹھ کھڑے ہوئے پر رضوان نے گرم جوشی سے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ”پرغمال وہ نہیں تم ہو اور تم جیسے پرغمال کو روہی جیسے آزاد ہی ٹھیک کر سکتے ہیں۔ لہذا قسمت بخیر، میرے دوست!“



گرمی تھی تو کسی مگر دوس نہیں تھا، ہوا بھی اوردی خوش گوار تھی، پھر بھی سرنگ پارک کے ایک اور ذیلی سڑک پہ آتے آتے اس کا چہرہ دینے میں تر ہونے لگا تھا جسے وہ بار بار پر لٹو لٹو سے تہہ پتہ ہی کی تلاش بلوچینز کی جیب میں فیزار ادا کی طور پہ ہاتھ گھسیڑتے ہوئے نہیں لے خود کو ملاطمت کی کد اس خطے میں آکر اسے لباس کا درست انتخاب کرنا چاہیے۔

لعینہ ناز سلطان

لجھوں کی خُصا

پاکستانی

ڈاک



ایسے ہی گرم سورج اور گرم موسم کی تنہا کرتی تھی۔ تو آج جب یہ تنہا پوری ہوئی تو اسے یہ بھی بری لگ رہی تھی۔

”میرے فریڈ زٹھک کہتے ہیں کہ گیت! تم کسی حال میں خوش نہیں رہتی ہو اور ڈیڈ کہتے تھے کہ تم بہت نازک حراز ہو، برداشت نہیں ہے تم میں۔“ ایک بعد ایک قدم اٹھاتے ہوئے وہ دوسروں کے تبصروں کو آئینہ بنا کر اس میں اپنا آپ دکھ کر رہی تھی۔ ”اس لاک میں کون سا گھر ہوگا؟ جس کا گیت ڈارک براؤن ہو اور اس کی دائیں دیوار سے باہر بوگن ویلیا کی تیل اپنے کاسنی پھولوں کے ساتھ لٹک رہی ہو اور بائیں دیوار پر اوپر پھکیں تو آم کے درخت کی شاخیں نظر آئیں گی، تھوڑی سی باہر آتی ہوئی، زیادہ تر اندر۔“

بچپن سے اب تک اس نے اتنی بار یہ نقشہ نہ تھا کہ جزئیات سمیت اسے حفظ ہو گیا تھا۔ ویسے اس کے پاس لکھا ہوا پتا بھی تھا۔ اس نے ایک بار پھر جب سے لفافہ نکال کر اس پر لکھا نام اور پتا پڑھا۔ مگر یہاں آ کر اسے معلوم ہوا کہ اس شہر کے اکثر گھروں پر نیم پلیٹ لگانے کا رواج نہیں اور نہ ہی گھر نمبر لکھنے کا پوش علاقوں کے سوا، محض نام اور پتے سے کسی کو ڈھونڈنا ایک مہم کے برابر ہے۔ تو آج گیت نے یہ بہم تقریباً سر کر لی ڈالی۔ اس کے حساب سے، بلکہ ساری علامتوں کے حساب سے گھر اسی لین پر ہونا چاہیے۔ وہ دس گیارہ سال کا بچہ تھا۔ گیندا چھٹا ہوا جا رہا تھا۔ گیت نے اسے روکا۔

”سٹرپٹ ریاست احمد کا ہوم؟ وڈیو؟“ گیت اردو سمجھ سکتی تھی تھوڑی بہت، اور بول لیتی تھی گڑبڑ سے لائق، وہ سوالیہ نظروں سے بچے کو دیکھ رہی تھی جس نے چند لمحوں اس کے بتائے نام پر غور کر کے نفی میں سر ہلادیا۔

”کوئی ڈونٹ ٹومس.....؟“

”کیا بات ہے؟“ سناوے سے رنگ کا ایک

لمبا اور دبلا پتلا نوجوان سامنے گھر کا گیت کھول کر آ گیا تھا، گیت نے پھر وہی دہرایا جو بچے سے کہا تھا۔

”تم کون ہو ان کی؟“ لڑکھے نے انگریزی میں سہارا لیا سوال پوچھنے کے لیے۔

”کیا یہ بتانا ضروری ہے؟“ گیت ناگواری سے اسے دیکھا۔

”کیا ضروری ہے کہ اگر کوئی کسی کو ڈھونڈ رہا ہو تو اس کا کچھ لگتا بھی ہو؟ وہ جھٹ ڈاک بھی تو ہو سکتا ہے یا پیغام رساں، جس کے ذمے مکتوب الیہ کو تحفہ کتو پہنچانا ہوا یا کوئی پیغام اور بس۔“

گیت نے دل میں سوچا پھر وہ اس نوجوان کی طرف متوجہ ہوئی جو شاید کچھ کہہ رہا تھا۔

”یہ..... یہ گھر۔“ اس نے اسی گیت کی طرف اشارہ کیا جہاں سے وہ نکلا تھا۔

”یہ..... گیت نے اچنبھے سے پہلے گھر پھر اس نوجوان کو دیکھا۔“ مجھے بتایا گیا تھا یہی مکان ہے۔“

احاطے میں آم کا درخت ہے اور.....

”اور باہر سے نظر آنے والی بوگن ویلیا کی شاخیں اور احاطے میں اندر امرود، سیٹھ اور.....“

کے درخت تھے، کہیاں ہیں جن میں ہر ادھنیا پودینہ ہری مرچیں لگی ہوئی تھیں۔“

نوجوان نے اس کی بات کاٹ کر کہا تھا، گیت نے ایک نظر اسے دیکھا جس کی سیاہ آنکھیں بھی اس کی زبان کی طرح پوٹی ہوئی تھیں۔

”اچھے کہ بغیر کھلے گیت سے اندر داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے نوجوان، پھر گیت اس کی رہنمائی میں چلی ہوئی ایک چھوٹا سا بڑا نام سن، ایک بڑا آدمہ اور دو کمرے گھر کے تیسرے کمرے میں پہنچی، چھوٹی سہری پراکھ ٹھیف سادہ جو سکر اسٹاڈ تھا۔ آٹھ سٹ سن کر ان کا اور آٹھ کھیں دروازے کی طرف گھوم گئیں۔

”کون ہے؟“ ناکانی روشنی میں انہوں نے اپنے پوتے کے پہلو میں کھڑی لڑکی کو دیکھنے بلکہ پہنچانے کی کوشش کی اور ناکام رہے۔

”الہ پول میں موجود ماریہ احمد نے آپ کے ایک لدا اور ایک منج دیا تھا۔“ گیت نے اپنا لدا لے کر بغیر، کسی تمہید کے بغیر اور بیٹھے بغیر، پہلے وہ الفاظ ادا کیے جنہیں کب سے ذہن میں لایا تھا۔

”کیا..... کیا کیا ماریہ نے؟“ ان کے کمزور اور دھمکی آم کی دہری کرٹ دوڑ گیا تھا۔ وہ بیٹھے کی طرف اشارہ کرتے لگے، نوجوان نے آگے بڑھ کر انہیں مارا۔ گیت دو قدم آگے بڑھ آئی، ان کی اونچے والی سہری کے ذرا تر پھیلے۔

”انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر ان کی موت سے سامنے ہو اور وہ مرے وقت کلمہ شہادت میں تو..... میں یہ بات آپ کو بتا دوں تو ڈیڑا لدا اس حال میں نہیں جانی کہ آپ کون ہیں مگر ایک

ہم نام بتانے کی اخلاقی ذمہ داری میں نے پوری کر لی ہے۔ ماریہ احمد نے مرے..... سے پہلے کلمہ شہادت کا حاشا قمر کے کچھ الفاظ ہی کے سامنے ادا کیے تھے اور یہ خط.....

گیت سے اپنی انگریزی نظموں کی آمیزش والی دہری پھولی اردو میں بات کرتے ہوئے اپنے کندھوں پر لایا ایک اتارا اور اس میں سے ایک لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

”وہ مرنے؟“ کمزور چہرے پر، دو بڑی بڑی آنکھوں میں دکھ اور کرب کا سمندر نکال کر ایک ہی اٹل آیا۔

”دوا پہلے۔“ گیت نے ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”اور تم، تم کون ہو؟“ انہیں یہ خیال اب آیا

”میں ان کی بیٹی ہوں۔“ ڈیڈ نے اس کا نام گیتا

تھا اور میری نے بیٹی آرا پھر دونوں نے سچ کی راہ

ال کر اسے گیت نام دے دیا۔ لڑکی نے بغیر کسی

تائید کے، سیاٹ لہجے میں انہیں بتایا تھا۔ اسنے

وہ بڑی حد تک غیر جذباتی اور حقیقت پسند لڑکی

تھی مگر اسے بعد میں اعتلاہ ہوا کہ وہ غلط تھی۔ دیار مغرب کے اکثر افراد کی طرح.....

تو اس وقت جو کہانی گیت کی آمد سے شروع ہوئی ہے۔ وہ کہانی دراصل بہت برسوں اور دو فلسوں پہلے شروع ہوئی تھی وہ جو شاعر نے کہا ہے ناکہ.....

وقت کرتا ہے پرورش برسوں

حادثہ اک دم نہیں ہوتا

تو گیتا سبکی آراء عرف گیت کا وجود اس کی آمد

ایک اچانک حادثہ نہیں تھی، اس کے پیچھے ایک طویل کہانی ہے۔

اور اس کہانی سے ایک اور شاعر کی یہ بات بھی کچھ کچھ سمجھ میں آئے گی کہ لمحوں کی خطا کے بعد صدیاں کیسے سزا پایا کرتی ہیں۔

☆☆☆

”اس لڑکے کی کوئی کل سیدی نہیں ہے۔“

ریاست احمد کی والدہ، اس کے بارے میں پختہ رائے رکھتی تھیں اور اظہار بھی کرتی تھیں، جسے وہ ایک زوردار بیٹی میں اڑایا کرتا تھا۔ سن 75ء میں

تھا۔ وحید مراد کا ہینر اسٹائل ابھی مقبول تھا۔ ریاست اپنی گھنے بالوں کو اسی انداز سے ترشوا

کرب آئینے کے سامنے کھڑا تھا۔ ماتھے پر آدھے

ادب و صحافت کی طرف سے جہن کے لیے عرب سوسائٹی

افشاں آفریدی

بہارِ بے

قیمت 400/- روپے

32735021 فون نمبر

بال ترچہ انداز میں مگر کرنا چاہزہ لیتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ وہ اگر وحید مرادی کی طرح نہیں تو اس سے کچھ کم بھی نہیں تھا۔ اس کی سانولی رنگت میں ہلاکی جا بیزت تھی اور کھڑے نقوش میں بے حد کشش اپنے دراز قد کے ساتھ وہ محفل میں نمایاں ہی نظر آتا تھا۔

بی کام کے بعد نوکری اچھی مل گئی تھی۔ اس زمانے میں اپنی پرہیزی پر عموماً اچھی نوکری مل ہی جاتی تھی۔ اور سرکاری نوکری بھی ملنا کوئی جوئے شیر نکالنے کے مترادف نہیں تھا، تو ایک اچھی نوکری کے بعد گھر میں شادی بیاہ کی باتیں ہونے لگی تھیں، اگرچہ محلے کی ایک حسینہ پر ریاست علی کا دل آیا ہوا تھا، مگر ان کا کوہ ایک آنکھ نہ بھائی، گوری رنگت کو انہوں نے بیکہ شہپر اور یاد اور گداز بدن کو موٹاے کی علامت، پھر ان کا خاندان الگ، برادری الگ اور بھی نہ جانے کیا کیا اعتراضات کھڑے کر کے کہ انہوں نے اتنی اونچی اور مضبوط دیوار بنالی کہ بے چارہ ریاست یہ دیوار پھلانگ ہی نہ سکا اور خاموشی سے خال کی بنی کو بیاہ کر لے آیا۔

جو اس کی طرح تھی، سانولی، پرکشش اور جامہ زیب، اس نے ریاست احمد کو پہلے سال بیٹے کا تحفہ دیا اور گھر بھر کی لاڈلی بیوی بن گئی اور تھوڑی سی قدر ریاست احمد بھی کرنے لگا تھا۔ بیٹا کھٹنوں کھٹنوں چلنے لگا تھا جب ریاست احمد کی کاوشیں بار آور ہوئیں یا قسمت مہراں ہوئی یا پھر شاید دونوں ہی عوامل ہوں، اس کے لندن جانے کی راہ ہموار ہوئی، وہاں موجود اس کے کزن اور بڑے بھائی کی سی حیثیت رکھنے والے اعظم بھائی نے بھی اس کی خاصی مدد کی تھی پھر ان وقتوں میں دیار مغرب میں جانا، رہنا بستا اتنا مشکل نہیں تھا اور یہ دروازہ زور پکڑ رہا تھا۔

ریاست علی کی بیوی اور والدہ کو کچھ تحفظات تھے مگر حاجی آسودگی کے خواب ان تحفظات پر غالب آ گئے۔ یوں وہ لندن آ گیا۔ اعظم بھائی کے پاس، جہاں وہ لاٹری میں کام کرتے تھے، اپنے ساتھ اسے بھی لگا لیا۔ ایک فاسیولار ہوٹل کی لاٹری میں

صبح سے رات تک کام کر کے وہ ایک گھنٹہ سڑک اپنے ٹھکانے آ جاتے، جہاں ایک مکان کے خانے میں ان دونوں سیت جا رہا کستانی تھا اور تین ہی بنگلی تھے۔ ایک آئرش لڑکا بھی تھا جو اس کے دفتر میں نوکری کرتا تھا۔

اس کی ڈیوٹی تب شروع ہوتی تھی جب بھائی کے باقی سارے مین اپنی اپنی نوکریاں نکال بھٹکا کر واپس آتے تھے، الٹا سیدھا کچھ بھی کھا کر پیٹ بھرتے اور بے سادہ ہو کر اپنے اپنے محلے پہ پڑ جاتے تاکہ صبح وقت پر بیدار ہو سکیں۔

ایک مہینہ جیسے تھے ریاست علی نے نکال پڑیوں کا گودا اور خون جمادینے والی سردی میں روزانہ علی آج اٹھ کر خود کو گرم کپڑوں، جرابوں، جوتوں، دستانوں اور ٹوپے میں ملفوف کر کے اعظم بھائی کے ساتھ نکل جاتا۔

ڈبل ڈیکر بس کی ایک گھنٹی کی سواری کے ہوئے پہنچتا، وہاں مشتق کرتا اور پھر رات میں وہاں ہوتی تو گرم اور تازہ روٹیاں چھوڑنے والے کھانے بگھاری دالیں، بھنی ہوئی بزیانیں، دھبے، پودینے، خوشبو والی چٹنیاں، پلاؤ، کباب، کوٹھے، قوسے، پاکستان اور گھر والوں کے ساتھ ساتھ یہ ڈالنے اسے بے طرح یاد آتے تھے، بالکل انڈینز اور بنگالیوں کی طرح جو اپنی تھالی سال ڈوسا، پوری ترکاری اور دھولکی چاول، پھلی چاول کی یادیں آہیں بھرتے تھے اور چاول بھی کون سے؟ جو اب کسی کھانے والے ریاست احمد کے محلے سے بھی نہیں اترتے مگر اس وقت تو سب ایک دوسرے غم بانیٹے میں ہی گھر رہتے تھے۔

یہی بے پناہ محنت و مشقت، گھری دوری، اپنی پسند کے کھانوں سے محرومی، ایک ریاست کے صبر کا بیانا نہ بلکہ سارے بیاناے لہو ہو گئے۔ ٹوسٹ میٹھن لگا کر اناؤس کھا کر اور پی پی کرک سب کڑا کر آتا۔

”اعظم بھائی، کوئی ایسی جگہ دکھیں کہ رہنے

”جہاں بچن کی سہولت ہو۔“

”میاں، بچن کی سہولت تو یہاں بھی مل سکتی ہے، اس پلانڈر خرچ کرنے پڑیں گے۔“

”تو کر لیں گے، خدا کی قسم اب تو اس انڈے تو اس انڈے میں، پتھر تو اسے اٹکائیاں آنے لگی ہیں۔“

”زبان کے ذائقوں میں پڑو گے تو گھر کیا گھر کے صاحبزادے؟“ انہوں نے اقتصادی مسئلہ اٹھایا۔

”یہ قربانی آپ ہی دے سکتے ہیں اعظم بھائی! میں نہیں کہ بھوکا رہ کر اور ذہل روٹی کھا کر پلانڈر بچا کر گھر میں آؤں اور وہاں وہ لوگ تو رے بریانی کے حوالے اڑائیں۔“ ریاست احمد ترخ ترخ کیا۔

دیے اس نے کوئی اتنی غلط بات بھی نہیں کہی تھی اسے تو ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ ہر دو تین سال بعد آٹھ دالے اعظم بھائی جو خاندان بھر کے لیے مخالف لاتے ہیں وہاں دھ کر بے دریغ نوٹ خرچ کرتے ہیں اور جن کا ایک ہی پاؤ سنگ سوسائٹی میں نیا لگا کر زیر تعمیر ہے، جن کی بیوی بچوں کا رہن سہن پہننا اور دھائی اسٹائل پورے خاندان اور محلے میں قابل رشک ہے۔ وہ اعظم بھائی کی قاعدت، جزیری، کفایت گھاری بلکہ فاقہ کشی کی مرہون منت ہے۔

ریاست احمد تو اسے فاقہ کشی ہی کہا کرتا تھا۔ تو ریاست ایسی زندگی گزارنے، ایسی قاعدت اختیار کرنے اور ایسی قربانی دینے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ اس کے مقاصد غرائم اور خواب و خواہشات واضح تھے۔ وہ زندگی بہتر بنانے سنوارنے یہاں آیا تھا، صرف اپنی فیملی کی نہیں بلکہ اپنی بھی، یہاں تقریباً خوشی اور آسودگی کے بہت ذرائع تھے، وہ ان سے بے خبر، اور دورہ کر زندگی گزارنے کا قائل نہ تھا۔ تو جب ان کے ساتھ رہنے والے دو پاکستانیوں کو برصغیر کا ایک فیکٹری میں نوکری کا موقع ملا تو ریاست احمد بھی ان کے ساتھ ہو گیا۔ یہاں اجرت زیادہ تھی۔ چھ افراد لے رہے تھے لیے جو دو کمروں کا چھوٹا سا فلیٹ لیا ہوا تھا اس میں ایک ننھا سا سنا جھنچھن تھا۔ چھٹی کے دن

سب مل جل کر وہ کھانے بنا لیتے جنہیں کھانے کو یہاں ترس گئے تھے۔ اگر یہ سچ ہے کہ بھرے پیٹ کی آسودگی انسان کی نگاہیں کشادہ کر دیتی ہے تو ریاست کی آنکھیں کھل گئی تھیں، کشادہ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی تھیں، ساتھ کام کرنے والی ایک دو گوریوں اور پاس پڑوس کی ایک دو بڑے بڑے بھیموں سے عمارت کے مطابق سلام دعا ہونے لگی تھی اور شناسانی پہلے بے تکلفی پھر بے خودی کی حد میں پہنچ گئی۔

☆☆☆

اسٹیلیا سارا دن ریاست کے ساتھ اور دیگر دو کرز کے ساتھ کام کرتی تھی، وہاں سے واپس آنے کے بعد بھی اسے اور ریاست دونوں کو ایک دوسرے کو دیکھنے، ملنے اور بات کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ دونوں کے رہائشی مقامات میں کم از کم پون گھنٹے کا فاصلہ تھا۔ ویک اینڈز پر فاصلہ گھٹ جاتا۔

اسٹیلیا کی گھری رنگت سنہری آنکھیں اور سنہرے ہی بال ریاست کو اس کی پہلی محبت کی یاد دلا دیتے، خستہ و شادیدانک دل کے نہاں خانے میں کہیں چھپائے یا سجائے بیٹھا تھا۔

اسٹیلیا مغربی نوکری تھی مگر اس کے اطوار اس کے خیالات، اس کے خواب سب مشرقی ہی تھے، وہی گھر، وہی درجہ اور محسوس سا بچہ والی تھوڑی، جس پر وہ یقین رکھتی تھی یا پھر مشرق و مغرب کی باتیں ہیں، دنیا کی ہر نوکری ہر عورت شاید اس تھوڑی یقین رکھتی ہو تو اسٹیلیا کو یہ سانولی رنگت، بے قد والا پرکشش ریاست بہت بھا گیا تھا، جواب بھی آئینے میں اپنا آپ دیکھ کر خود کو ملتی دیتا تھا کہ اگر وہ وحید مرادی سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں اور کم از کم ندیم چنار پرکشش تو ہے ہی، تو اس کا یہ خیال اور خوش فہمی کچھ غلط بھی نہیں تھی۔

اسٹیلیا اس کی سانولی رنگت، گہری آنکھوں اور اس کی لچھے دار باتوں میں ڈوبتی ہی جا رہی تھی اور ریاست اس کی سیدی سنہری زلفوں میں الجھتا ہی جا رہا تھا۔ معاملہ چھپتا چلا گیا۔

دونوں کے درمیان قربت گہری ہو رہی تھی

اور الفت کا دیا بھر پور روانی کے ساتھ بننے لگا تھا اور ایک دن جب ریاست کے شانوں پر سر رکھی اسٹیلا نے فرمائش کی کہ.....

”آؤ ہم دونوں شادی کر لیں۔“ تو اچانک اسی لمحے ریاست کو یاد آیا کہ وہ پاکستان سے آیا ہوا ایک محنت کش مزدور ہے جس کی ایک بیوی اور ایک بچہ بھی ہے۔ مگر لمحہ وہ ایسا بندھا لپکتا تھا کہ ریاست اس وقت ساری دنیا کو بھی فراموش کرنے کو تیار تھا تو بیوی پر کیا شے تھے؟

اسٹیلا جب اسے بتاتی کہ ریاست سے ایک چل بھی دور رہنا اس کے لیے کتنا سہان روح ہے تو اسے بھی اپنے جذبات ایسے ہی محسوس ہوتے، اسٹیلا سے دور رہنا اس کے لیے ناقابل برداشت ہو رہا تھا۔ دونوں کو ایک دوسرے کی پاہت، ایک دوسرے کے ساتھ اور قربت کی خواہش نے بے چل کر رکھا تھا۔ سرد ممالک میں رہنا آسان تو نہیں ہوتا، آگ، گرمائش، حرارت، ان کی موجودگی ہی زندگی کو کچھ آسان کر سکتی ہے محبت یا شادی طلب۔ دونوں کچھ بھی تھا مگر آگ نے بھڑک کر ماحول نرم گرم کر دیا تھا، جس میں رہنے بسنے کے لیے دونوں بے قرار تھے۔

اسٹیلا نے سارے تحفظات ختم کر دیے تھے، سارے سوالوں کے جواب دے کر ساری راہیں ہموار کر دی تھیں، وہ کلہ بڑھ کر مسلمان ہونے کو تیار تھی۔ معاشی میدان میں وہ ریاست کا ہاتھ بٹانے کو تیار تھی پھر وہ بڑے خلوص اور ترقی دہی سے اس سانولے بیا کی محبت میں جتا ہو گئی تھی اس کے والدہاں، پین، لگاؤ، یگانگت اور اعتراف الفت نے ریاست کو چاروں شانے جیت کر دیا تھا۔

آئی بہار کی ایک سبز گلابی سی شام، اسلامک سینٹر میں اسٹیلا نے کلمہ پڑھا اور سارہ بن کر ریاست کی زندگی میں مکمل طور پر داخل ہو گئی۔ دونوں نے مل کر ایک چھوٹا سا فلیٹ کرائے پر لیا تھا جس کا ایڈولس ریاست نے دیا تھا اور فرخیر سارہ نے خرید کر ڈالا تھا۔ اس نے دیواروں پر پینٹنگز اور کارٹس پنگلڈ ان سجائے،

نہی مٹی سی بالنگی میں چر نیم، ہولی ہو سک اور ڈبڑی کے پھولوں کے چھوٹے چھوٹے سے گلے رکھے تھے۔ ایک انڈور پلانٹ اس نے بیڈروم میں بھی رکھا تھا۔ اسے پھولوں کا بہت شوق تھا۔

ایک ہفتے کا بپتی مون بھی مٹا آئے کہ چشیاں اتنے ہی دنوں کی ملی گئیں۔ سارہ کچھ دل گرفتہ تھی۔ اس کے خوابوں میں اتنا مختصر سا ماہ عمل نہیں تھا۔ ”ہم دونوں اپنی چھوٹی سی جنت میں روزنی مون مناسکتے ہیں کہیں اور جانا ضروری نہیں بس ایک دوسرے کا ساتھ ضروری ہے۔“

ریاست نے اس کی سنہری آنکھوں میں چمکتے ہوئے کہا تھا اور وہ بہل گئی تھی۔ اور ریاست بھی اس سنہرے ہی مون سے بہلا ہوا تھا تب ہی فوش اینڈ چپس، سوپ، برگر فریج، فرایڈ اور سینڈویچز کھا کھا کر کٹا پائیں تھا۔

☆☆☆

پھر ایک روز اعظم بھائی آ گئے اسے تلاش کرتے ہوئے۔ ان تک اطلاع پہنچ چکی تھی کہ اس نے کیا کارنامہ انجام دے دیا ہے۔

”واہ ماں! بڑی بھری دکھائی تم نے، جو کام ہم آٹھ سال میں نہیں کر سکتے تھے دو سال میں ہی کر لیا؟“ اعظم بھائی بڑے زندہ دل اور ہنس کھانسان تھے۔ ”ضرورت تھی اعظم بھائی اب ہر کوئی آپ کی طرح سادہ سادہ تو نہیں ہوتا نا؟“ ریاست نے ان کے آگے کو لڈر تک اور چپس کی پیکیٹ رکھی۔

سارہ پہلو ہائے کر کے اور معذرت کر کے گئی تھی۔ ہفتے بھر کی دوسری چھٹی کے دن ہی خریدے تھے۔ دے تو دونوں ساتھ جاتے تھے مگر اس وقت سارہ اسٹیلا ہی چلی گئی، ریاست گھر پر ہی ٹھہر گیا مہمان کی خاطر داری کے لیے۔

”اعظم بھائی! ذرا خیال رکھیے گا، گھر تک بات نہ پہنچے۔“ ریاست جتنی لچھے میں ان سے مخاطب تھا۔ ”ہم تو خیر تمہارا راز رکھ لیں گے مگر یہ بتاؤ، یہاں اور وہاں، دونوں کو کتنے کیسے کرو گے؟“

”اللہ بڑا رحیم اور رازق ہے اعظم بھائی!“ ریاست مسکرا کر اطمینان اور آسودگی بھری مسکراہٹ۔ ”سارہ کی بھی ایک کالے اور پشیمانی کے انتخاب پر اس سے ناراض نہیں گھرا ب مان گئی ہیں شاید اپنی تنہائی اور بیماری سے گھبرا گئی ہیں یا بپتی کی محبت، کوئی بھی وجہ ہو، ہمارے لیے بہت آسانی کر دی ہے انہوں نے، بیٹی دادا کو اپنے گھر رکھنے پر تیار ہیں کرائے سے جان چھوٹ جائے گی میری اور قیصری میں بھی میری ترنی ہو گئی ہے، شیشن آپرٹ کرنا ٹیکہ لیا ہے۔ اجرت بڑھ گئی ہے۔ یہاں کے اخراجات تو ہم دونوں مل کر منیج کر لیتے ہیں۔ پاکستان چھیننے کے لیے ٹھیک ٹھاک بچت ہو جاتی ہے۔ سارہ کو بتا دیا تھا میں نے کہ مجھ پڑے داریاں ہیں ایک ٹھیک ٹھیک کی، گھر پیسہ بچنا ضروری ہے۔“ ریاست نے تفصیل سے بتایا۔

”پوچھا میں اس نے تمہاری بپتی کے بارے میں؟“ ”بیوی اور بچے کے علاوہ بانی سبج بتایا ہے۔“ ”آگے کے بارے میں کیا سوچا ہے؟“ اعظم بھائی چپس کھاتے ہوئے اور سوال کرتے جا رہے تھے۔ ”آگے کے بارے میں سوچنے والا آدمی ہوتا تو یہاں تک کیسے آتا؟ لندن آنے کا فیصلہ جس میں ایک لمحے میں کیا تھا، یہ فیصلہ بھی لمحے کا کھیل ہے جو وقت گزر رہا ہے خوب ہے۔ مستقبل کی بات مستقبل میں دیکھی جائے گی۔“ ریاست نے لا پرواہی سے ہاتھ ہلا کر گویا کسی اڑانی اور اپنی زندگی کا فلسفہ بیان کیا۔

”کلمہ پڑھا کر نکاح کیا ہے؟“ ”بالکل۔“ ”اے رنگ میں ڈھالنا، اس کے رنگ میں نہ رنگ جانا۔“ اعظم نے اٹھتے ہوئے اسے نصیحت کی۔ ”ارے، کہاں چلے، بیٹھے، کھانا کھا کر جائے گا۔“ ریاست نے بعد اصرار انہیں روکا۔ انہوں نے یہاں تک بیٹھنے میں ریاست کا بہت ساتھ دیا تھا اور وہ احسان فراموش تو نہیں تھا۔

سارہ گروسی لے کر آ گئی تھی اور ریاست اسے اپنی سیلر بنا کر اعظم بھائی کے لیے خصوصی کچوان بنا رہا تھا۔ خالص دیسی کچوان بخنی پلاؤ اور تو رمد اس نے با آسانی تیار کر لیا تھا۔ یہاں آنے کے بعد اب کو کنگ میں اتنی مہارت تو ہو چکی تھی۔ کچان روست اور فرنی فٹ سارہ کے لیے کوئی مشکل نہیں تھا۔ بس مرغی ماسالے ریاست کے مشورے سے ڈالے تھے۔

کھانا تیار کر کے سارہ ہوا دھو کر تیار ہوئی، ابھی ٹیبل لگانے میں کچھ وقت تھا۔ اعظم بھائی ٹی دی دیکھ رہے تھے، چری ٹوکس کی کامیڈی اب انہیں سمجھ آنے لگی تھی، کامیڈی اب سمجھ میں آجائے تو کسی بھی آجانی ہے۔

ریاست بیڈروم میں چلا گیا، یہ دیکھنے کے سارہ کی تیاری کہاں تک پہنچی۔ وہ آئینے کے سامنے بیٹھی زلفیں سنوار رہی تھی۔ ریاست کو دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور کھوم گئی۔ ”کیسی لگ رہی ہوں؟“ ریاست نے اسے غور سے دیکھا اور آج اس لمحے نہ جانے کیوں، اس کی نگاہیں ایک روایتی مسلمان اور پاکستانی کی نگاہ بن گئیں اسی سارہ کی پھولدار فرار کا گلا آگے پیچھے سے انتہائی کشادہ لگ رہا تھا اور کیڑے ہونے پر اس کی سنہری پنڈلیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔

”کوئی اور ڈریس نہیں ہے پہننے کے لیے؟“ اس وقت تو وہ بھی کہہ نہ سکا اور سارہ جوابی تعریف سننے کی تنہی اور عادی ہو گئی تھی، جہان رہ گئی۔ ”اس میں کیا برائی ہے؟“ ”گلا بہت بڑا ہے اور نیچے سے دیکھو فراک بہت چھوٹی ہے اعظم بھائی میرے کزن ہیں ہمارے ہاں ایسے پہناوے نہیں ملتے۔“ ”مجھے تو ٹھیک لگ رہا ہے لیکن تم کہتے ہو تو، چلو میں دوسرا دیکھ لیتی ہوں۔“

سارہ کو اگرچہ ریاست کے اعتراض پر اعتراض تھا اور لباس بدلنے میں ہچکچاہٹ کہ اپنی مرضی اور پسند کا لباس پہننا اس کا حق ہے، اس کی تربیت اور معاشرے کا رواج تو یہی تھا مگر پھر اس کے دل میں موجود ڈھیروں ڈھیر محبت کا دریا یکایک اٹل پڑا اور

اس کے اعتراض اور چونکا ہٹ کو بھالے گیا۔ اس نے الماری سے دوسرا جوڑا نکال لیا۔ اسکرٹ کی لمبائی اس کے ٹخنوں تک تھی اور بلاؤز بھی پوری آستینوں اور بند لگے کا تھا۔ مگر جب تک اس نے ٹیبل سجائی، سب نے مل کر کھانا کھایا، پھر دونوں نے مل کر برتن اٹھائے، ٹیبل صاف کی، کافی بنا کر سرو کی اور برتن دھوئے اور جب دروازے پر اُٹھ کر بھائی کو خدا حافظ کہا اس تمام وقت میں ریاست ایک مستقبل بے چینی اور اچھن کا شکار رہا۔

”بھئی، تمہاری یہ شرٹ بہت ہلکی ہے، آئندہ نہ پہننا اسے۔“ بالآخر اس نے اپنے دل و دماغ میں چھپا کا ٹھکانا ہی دیا۔
”مگر ڈرائنگ نہیں تو یہ ڈریس بہت پسند تھا کتنی تعریف کی تھی تم نے۔“ سارہ کو اس کی بات کچھ نہ سمجھ میں نہ آئی اور نہ پسند۔

”سمجھا کر بے بی! اب تم مسلم وین ہو، لباس کے معاملے میں احتیاج کرو۔“ ریاست نے اس کے شانوں کے گرد بازو دراز کیے اپنے انداز سے سمجھایا۔

☆☆☆

دونوں اب اس گھر میں شفٹ ہو گئے جو ریاست کی سربراہی اور سارہ کا میکے۔ ٹھیک ٹھاک گھر تھا، چار بیڈ روم کا گھر کرائے سے تو جان چھوٹ گئی، بڑی بیوی دھنسی ہوئی آنکھوں اور خاکستری بالوں کے ساتھ درشت لہجہ اور کرخت مزاج رکھتی تھیں۔

جوڑوں کی تکلیف نے ڈبل چیز پینچا دیا تھا مزاج میں کچھ نی پٹاری کے سبب بھی تھی۔ سارہ انہیں با آسانی پینڈل کر بیٹھتی تھیں۔

ریاست چھٹی والے دن ان کو ڈبل چیز سیت پارک لے جاتا تھا۔ سارہ نے بتایا تھا کہ می کے بینک اکاؤنٹ میں ایک خلیفہ رقم موجود ہے مگر وہ ظاہر نہیں کرتی ہیں۔

☆☆☆

سارہ امید سے ہوئی تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا اور ریاست نہ جانے کیا سوچ کر کم سم ہو گیا مگر

خیر اس نے بہت جلد اپنی اس کیفیت سے چھٹکارا حاصل کیا اور سارہ کے ساتھ ساتھ اسی کی طرح خوش نظر آئے اور رہنے کی کوشش کرنے لگا۔

بہنی بڑی پیاری تھی۔ سارہ کی طرح سنہری رنگت اور ریاست کی طرح سیاہ آنکھوں والے پرکشش نقوش، اخراجات میں اب ڈے کیئر کا خرچہ بھی بڑھ گیا تھا۔ سارہ پہلے دلی زبان میں، پھر واضح الفاظ میں ریاست سے مطالبہ کرنے کی سعی کر وہ کچھ ذمہ داریاں اب اور اٹھائے، سارہ کے لیے سب کچھ تیج کرنا مشکل ہوتا جا رہا تھا، ریاست نے کچھ ڈے داریاں اٹھائیں مگر یوں پیسے اوٹ کے منہ میں زیرہ، پھر اس کی آئے دن کی تنقید اور اعتراضات۔

”تم اسکارف کیوں نہیں پہنتی ہو؟“ چھٹی کے دن وہ پھر سارہ سے الجھ پڑا، وہ ماریہ کے لیے کچھ شاپنگ کرنے جا رہی تھی۔

”کیوں بہنوں؟“ اس نے پلٹ کر ناگوار ی سے اپنے شوہر کو دیکھا۔

جب سے ماریہ کی پیدائش ہوئی تھی وہ کچھ زیادہ ہی بولنے لگا تھا۔ خصوصاً اس کے لباس پر، کئی بھاری جانے والی اس کی سگریٹ نوشی پر، پارٹیز میں گید رہنے میں دوستوں کے ساتھ سارہ کی بے تکلفی پر ریاست کا اس طرح ٹوکانا، تنقید کرنا اور اسے مضبوط پوچھنا سارہ کو برا لگتا تھا۔ اس کے خیال میں یہ اس کی شخصی آزادی سلب کرنے کے مترادف تھا۔

”تم مسلمان ہو اپنے لباس سے تمہیں ایک مسلمان خاتون نظر آنا چاہیے۔“ ریاست کو اس کی ہٹ دھرمی بھی بری لگتی تھی۔

”بہت سی مسلمان خواتین کو میں نے انتہائی بے ہودہ آؤٹ فٹس میں دیکھا ہے۔“
”میں ان کی بات نہیں کر رہا، تمہاری بات کر رہا ہوں، ماریہ جو کچھ دیکھے گی تم سے ہی دیکھے گی۔ ناں بننے کے بعد عورت کو بہت محتاط ہونا چاہیے۔“

”کیا سارا اسلام بس لباس میں ہی چھپا ہے؟ اور باقی داوے۔ پھر صرف ماں سے نہیں، ماں اور

اب دونوں سے بیکھتا ہے۔“

سارہ کھٹ کھٹ کرتی باہر چلی گئی۔ وہ ریاست سے محبت کرتی تھی۔ اس محبت میں کی نہیں تھی مگر جب وہ سارہ پر اپنی مرضی ٹھونسنے کی کوشش کرتا، اپنے اکامالات اس پر مسلط کرنے کی زبردستی کرتا تو وہ پھر اُسے سے اکھڑ جاتی۔

وہ کوئی شتر بہا نہیں تھی، ریاست کی خواہش پر اس نے مسجد جا کر نماز اور قرآن پڑھنا سیکھا تھا۔ مگر وہ باقاعدگی سے نہیں پڑھتی تھی مگر بھی بھار پڑھ ہی لیتی تھی۔ خود ریاست کون سا نماز قرآن کا پابند تھا۔ جمعہ کے چھ مسجد جانے والوں میں سے تھا۔ وہ پورک نہیں کھاتی تھی، ڈریک کرتا چھوڑ دیا تھا۔ بس بھی بھار سموگنگ کر لیتی تھی۔ جو اخلاقی خوبیاں

اسلام میں پسندیدہ ہیں، وہ اس میں پہلے ہی سے مہو تھیں جو اس مغربی معاشرے کی دین میں۔ مکہ پڑھنے سے پہلے بھی وہ بیچ بولی تھی، صفائی پسندی جو نصف ایمان ہے، اس نے بھی جو کہ فریب سے کام نہیں لیا، اپنی روزی کمانے کے لیے اس نے محنت اور وقت کے درست استعمال کا راستہ اختیار کیا۔ زیادہ آسودگی اور دولت کے لیے کوئی غلط طریقہ اور نا جائز حربہ استعمال نہیں کیا۔

ان سب کے بعد بس لباس پر آکر ان کی بحث ایک جاتی تھی تو سارہ کو برا لگتا تھا اور بھی وہ دھمی ہو جاتی تھی۔

”محبت کا یہ مطلب تو نہیں کہ ایک انسان دوسرے انسان کو اپنے اشاروں پر چلنے والا غلام بنالے، میں اس کی مرضی سے انھوں بیٹھوں، کھاؤں اور پھڑوں؟“ سارہ سوچتی اور آزدہ ہو جاتی۔

دراصل دونوں کے بیچ اس معاملے میں تھیوٹن بہت تھا۔ بہنی کی پیدائش کے بعد سے ریاست کچھ حساس ہو گیا تھا۔ اسے ہر دم بہنی کے مستقبل کے متعلق غدشات ستاتے رہتے سارہ کے لائف اسٹائل میں وہ بہنی کے مستقبل کی تصویر دیکھتا اور پریشان ہو جاتا۔ اپنی بیوی کو وہ ایک اچھی مسلمان عورت بنانے

کے لیے پلکان ہو رہا تھا۔ سارہ ان کو ششون کو ریاست کی زبردستی اور اس کی مرضی سمجھ کر گریزاں ہوئی اور شخص آزادی کا راگ الاپتی کیونکہ ریاست نے بھی ڈھنگ سے اور پیار سے اسے سمجھایا ہی نہ تھا کہ یہ اس کی مرضی ہے یا اللہ کی؟

ریاست کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ عقیدے اور عمل کا بیج انسان کے اندر سے پھوٹتا ہے اسے باہر سے کسی کے دل و دماغ پر مسلط نہیں کیا جاسکتا۔ مٹی کے اوپر ڈنڈے سے ڈنڈے پر بھی سالوں تک ایسے ہی پڑا رہے گا اس میں سے کوئل نہیں پھوٹ سکتی، ریاست احمد مٹی کے اوپر پڑے بیج کا پودا اور پھر درخت بننے کا منتہی تھا۔

یہ کیسے ہو سکتا تھا قدرت اور فطرت کے اصول اٹل ہیں۔ اپنے طریقے پر چلتے ہیں انسان کی مرضی اور خواہشوں پر نہیں، وہ وقت کے ساتھ ساتھ سارہ ترن رہی تھی، ریاست کلم رہا تھا، دونوں کے درمیان دیراڑ بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی، بیچ میں ماریہ پس رہی تھی۔

ریاست اپنی بیٹی کو قرآن اور نماز سیکھنے کے لیے قریبی مسجد بھیج رہا تھا۔ چھٹی کے دن اسے لے کر بیٹھ جاتا اور اسے وہ ساری اخلاقیات سکھاتا اور بتا رہا تھا جو پاکستانی معاشرے میں رائج تھیں۔ سارہ بھی خاموشی اختیار کرتی، یہی بول پڑتی۔

”یہ اچھی بہت چھوٹی ہے، اس پر اتنی سختیاں مت کرو۔“

”بیڑوں سے تو بہتر ہے میری بیٹی، کم سے کم میری بات سن لیتی ہے، مان لیتی ہے۔“ ریاست علی اب بھی بھار طفر کرنے لگا تھا۔

”تم بہت بدل گئے ہو۔“ سارہ نے اسے شکایتی نظروں سے دیکھا۔

حالانکہ ریاست علی اب نہیں بدلا تھا، وہ تو شروع سے ہی ایسا تھا۔ ہاں بس کچھ عرصے کے لیے اس نے خود پہ مصنوعی نقاب سا لگایا ہوا تھا۔ ابورییح کاری اب اتنی جا رہی تھی۔ مگر سارہ کی آنکھوں پر اب بھی

الفت کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ بس تھوڑی سی سرخ ہو گئی تھی، ادھمکی آکھ سے ایسا کچھ نظر آ جاتا جو اسے ناگوار گزرتا تو اظہار کر دیتی۔ کبھی اپنے بھولے بسرے خوابوں کو دل میں رقصاں دیکھتی تو ریاست کی کوئی خرابی، خرابی نہ لگتی، اس میں کوئی برائی نظر نہ آتی، وہ اچھا لگنے لگتا اور بھی یہ خواب سہو ہوا اے اس میں ہونے تو خود بھی دل گرفتہ ہو جاتی، جب ایک آکھ چوٹی لگی جس میں شب درود گزر رہے تھے۔

☆☆☆

مارہ کی دسویں سالگرہ تھی، وہ رین، غبارے، دیگر آرائشی اشیاء آس پاس پھیلائے سنگ رم سجانے میں مگن تھے جہاں تک لگتا تھا۔ ریاست پٹی برتھ ڈے لکھے غبارے پھیلا پھیلا کر ایک طرف رکھ رہا تھا، ماریہ جیکلین رین سے پھول بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”میری بھی ہوتیں تو کتنا خوش ہوتیں، ماریہ کو کتنا چاہتی تیں، اتنا کہ اپنی آدھی جمع پونجی نوای کے نام کر گئی تیں۔“ کافی نے گرا انداز میں اسے ہر خوشی اور شرم کے موقع پر بھی یاد دہلا رہی تھی۔

”کام کرنے والے مزدور کے لیے کافی۔“ اس نے کافی کا ریاست کی طرف بڑھایا۔

”اور میری بیٹی بھی تو سخت کر رہی ہے اس کے لیے؟“ ریاست نے گرم گرم خوشبودار بھگ اڑائی کافی کا گھبہاں میں تھام لیا اور اسے میز پر رکھا۔

”میری نہیں ہماری۔“ سارہ نے سچ کرتے ہوئے چاکلیٹ والا تھہ بلند کیا۔ ”ہماری بیٹی کے لیے چاکلیٹ، اس نے اعلان کیا۔ عین اسی وقت اطلاعی گھنٹی بجی اور لگے ہی لمحے وہ غبارہ زوردار آواز کے ساتھ پھٹا جو ریاست پھیلا رہا تھا۔ بیٹوں کی بیک وقت بہت زور سے ہنسی لگی تھی، سب سے زیادہ ماریہ تھی جو ہنس ہنس کر دوہری ہو رہی تھی۔

”تم لگا غبارہ پھاڑو، میں دیکھتی ہوں، کون ہے، ماریہ کی سیلیاں تو وقت سے پہلے نہیں آئیں؟“ کیا وقت دیا تھا تم نے انہیں؟“ سارہ بیک

وقت ہنستے اور بولتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازہ کھولا اور ٹھٹکی گئی۔

یقیناً کوئی ایشیائی بی تھا، ریاست کی طرح سائلا سلوتا، لسا دپلا پتلا سانو جوان، چہرے پہ کچھ گھبراہٹ اور کچھ محسن۔

”ریاست احمد نہیں رہتے ہیں؟“ دہی لہجے میں اس کی انگریزی بڑی شستہ تھی اس نے جیب سے ایک تصویر بھی نکال کر سارہ کے سامنے کی۔

”اوہ یقیناً، ریاست نہیں رہتا ہے اور آپ؟“ اسٹیل کا جواب سن کر نوادہ کے چہرے کی گھبراہٹ اور محسن یکدم ہی غائب ہو گئی، وہ مسکرا دیا۔

”دو گھنٹے سے ریاست بھائی کا گھر ڈھونڈ رہا ہوں، سارے گھر ایک جیسے لگتے ہیں۔ بانی داوے میرا نام منصور ہے وہ میرے کزن بھی ہیں اور بہنوئی بھی، کیا وہ موجود ہیں؟ میں ان سے ملنے آیا ہوں۔“ وہ خاموش ہو کر منظر گاہوں سے پردہ کدکھ رہا تھا جسے وہ ریاست کی لینڈ لیڈی سمجھتا تھا اور سارہ اس کے فقرے پہ انک بنی تھی۔

”کون ہوتا اس کے؟ کزن اور؟“

”میری بہن کے شوہر ہیں وہ۔“ منصور نے وضاحت کے ساتھ بتایا۔

”کب ہوئی شادی؟“ سارہ یکدم ہی بہت تیز آندھی کی زد میں آئی تھی۔

”برطانیہ آنے سے پہلے ہوئی تھی، ایک بیٹا چھوڑ کر آئے تھے، اب ماشاء اللہ چار بچے ہیں۔“

منصور نے تو سنا تھا کہ بڑے بہت روکھے اور سرد مزاج ہوتے ہیں۔ بلا ضرورت اور بلا وجہ بات کرتے ہیں نہ سوال، مگر اس لینڈ لیڈی کا مہربان لہجہ اور نرم روئے اسے فریاد بولنے پر اکسارہا تھا۔ وہ کندھے پہ پڑا اپنا بیگ سیدھا کر کے لگا تھا اس نے سارہ کا دھواں دھواں چہرہ دیکھا ہی نہیں، ہاں ریاست کی آواز ضرور سنی۔

”کیا بات ہے، جی، کون ہے دروازے پہ؟“

وہ دوا گھڑ کر اندر سے یہاں آ رہا تھا۔

”تمہارا کزن اور سالا۔“ سارہ سامنے سے ہٹ گئی، ریاست اور منصور کے مقابل، کوئی آڑ نہیں رہی، دونوں ایک دوسرے کے سامنے تھے۔

حیران پریشان منصور، جو ریاست کے بے لکھ انداز مخاطب پہ گڑ بڑایا ہوا تھا۔ ریاست احمد کے سر پہ تو آسان ٹوٹ پڑا منصور کو یوں اچانک اپنے گھر میں دیکھ کر، گنگ کڑا، آنکھیں پھاڑے وہ منصور کو دیکھ رہا تھا جیسے اس کے سامنے کوئی بیجوت کھڑا ہو۔

”ڈیڈ ایو دیکھیں، میں نے پھول بنالیا، خوب صورت ہے نا؟“ ماریہ اندر سے دوڑتی ہوئی آ کر ریاست کے پاس کھڑی ہوئی، رین سے بنایا ہوا پھول اس نے باپ کی طرف بڑھایا۔

”خاندان آؤ مارے!“ سارہ ماریہ کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئی۔

”یہ سب کیا لڑائی ریاست بھائی؟“ ریاست احمد کے حلق سے تو کوئی کواڑ نکلی نہیں، ناچار منصور کو ہی پابل کرنی پڑی، جو ریاست کی شادی کے وقت بمشکل نو، دس سال کا تھا۔ ذہن اور نصیب دونوں تیز تھے، اس کا رشب تو لندن پڑھنے آ گیا۔ بہن نے کچھ سوچا تیں شوہر کے لیے دی تھیں اور اپنی اور بچوں کی تازہ ترین تصاویر بھی۔ سر پر انز دینے کے چکر میں لندن سے برمنگھم ایک طویل سفر کر کے آیا اور ریاست کا گھر بھی ڈھونڈ لیا اور اب یہاں بھو چوکا کھڑا تھا۔

”اوہ آؤ، یہاں سب جھگڑا ہوں۔“ منصور کو لے کر وہ باہر آ گیا۔

ش اینڈ جیس کا آرڈر دے کر ریاست نے جو کہانی اسے سنائی۔ اس کا لب لباب یہی تھا کہ اس نے جو کچھ بھی کیا وہ ایک بھجوری تھی۔ یہاں کی شہریت حاصل کرنے کے لیے زندگی میں بہتیں اور آسانیاں حاصل کرنے کے لیے پیسہ میرن ضروری ہے۔

”مگر اس کاغذی شادی میں ایک جسم جیسی جاتی بیٹی کسے آگئی؟“ وہ اس سوال کا جواب نہ دے سکا، نہ کوئی وضاحت کر سکا۔

”منصور خدا کے واسطے پاکستان میں کسی سے کچھ نہ کہتا۔“ ریاست حد درجہ پوکھلایا ہوا تھا، ایک بے بس نظر اس نے ٹھنڈے ہونے ش اینڈ جیس پر ڈالی جنہیں منصور نے چھوٹا تک تھا۔

”کسی کون ریاست بھائی؟ وہ میری آپا ہیں۔“ منصور تو بلبلاتا تھا۔

☆☆☆

غباروں، رین کے پھولوں اور چمک دار آرائشی چیزوں سے سنگ رم سجا ہوا تھا۔ ایک بے لگی موم بتی سارہ نے جلائی، ماریہ نے پھونک مار کر موم بتی بجھائی۔ اس کے دوستوں نے سارہ اور ریاست نے تالیاں بجا کر پٹی پر تھوڑے کا گیت گایا۔

ایک اور ڈنر کھا کر سارے مہمان رخصت ہو گئے، ماریہ نے سب کے دیے ہوئے تحائف کھولے، باپ کی دی ہوئی ڈول اور ڈول ہاؤس پر وہ فوراً فریفت ہوئی۔ ماں نے پزل، کم دیا تھا وہ بھی ماریہ کو بہت اچھا لگا۔ گڑیا کو پہلو میں لٹائے وہ سو گئی جب سارہ ریاست سے مخاطب ہوئی۔

”اپنا سامان نکال کر رکھ لو کل اس گھر میں یا گھر کے آس پاس کہیں نظر نہ آؤ۔“

اتنی سفاکی اور اجنبیت اس کی آنکھوں میں، چہرے پہ، لفظوں میں اور لہجے میں بھی کہ ریاست کی ساری چرب زبانی اور خود اعتمادی مٹی بن کر رہنے لگی۔

”میری ساری دنیا، کل کائنات تو تم دونوں ہو۔“ بڑی مشکل سے اس نے بولنے کی ہمت کی۔

”تم تمہارے کچھ نہیں ہیں ریاست اندھاری دنیا نہ کائنات، ہم دونوں علامت ہیں بے دقتی کی، اس اندھے اعتبار کی، جو مجھ سے سرزد ہوئے، میں اب مزید انحقوں کی جنت میں نہیں رہ سکتی۔“

حالانکہ اس نے تہیہ کیا تھا اس سے بالکل بھی بات نہ کرنے کا، ہوائے گھر سے نکلنے کا حکم دینے کے اور اس نے جسم ارادہ کیا تھا کہ اتنے بڑے دھوکے باز اور عیار شخص کی طرف دیکھے گی بھی نہیں، پھر بھی دہی لہجے میں وہ بولتی چلی گئی، اس عیار اور مکار انسان کی

آنکھوں میں دیکھتے ہوئے، جن سے اسے محبت ہوئی تھی۔

”تمہیں اپنی ضرورتیں پوری کرنی تھیں، تم رنج کھہہ دیتے جھہہ سے، ہو سکتا ہے میں یوں بھی رہتی تمہارے ساتھ، پھر میں خواب نہیں دیتی، نہ خوابوں کی ساتھ اسے گھر اور زندگی کو جانی، تم نے دنیا کا سب سے بڑا حکم کیا ہے مجھ پر۔“

سارہ کے آنسو اندر ہی اندر گر رہے تھے، اس کے دل میں، خون میں شامل ہو رہے تھے۔ رگ رگ میں پیوست ہو رہے تھے، بڑی بہادری سے اس نے ان آنسوؤں کو باہر آنے سے روکا ہوا تھا۔ ورنہ وہ کمزور پڑ جاتی اس شخص کے آگے، جو اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے اس سے معافی مانگ رہا تھا۔

روہا تھا، رازدار تھا وہ سارہ سے سوال کر رہا تھا کہ وہ اتنی سنگ دل کیسے ہو سکتی ہے؟

”تم محبت کرتی ہو مجھ سے۔“ ریاست اپنی محبت کا نہیں بلکہ سارہ کو خود اسی کی محبت کا واسطہ دے رہا تھا۔

”مگر تم نے تو کبھی نہیں کی؟“ سارہ کی زخم مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھہری۔

”میں نے تم سے ہمیشہ محبت کی ہے سارہ! میں جچ بولنے سے ڈرتا تھا کہ میں تم مجھے چھوڑ نہ دو، میری محبت تھی جو جچ کہنے سے ڈرتی رہی۔“ ریاست جی بی بی کریمہ جانے والے گھر کو ریزہ ریزہ سینے کی کوشش کر رہا تھا مگر بری طرح تا کام ہو رہا تھا۔

”دنیا کی سب سے بڑی حقیقت یہی ہے، میں اور تم، ہماری بی بی، ہمارا گھر، ہماری محبت۔“ ریاست جلدی جلدی شکستہ لہجے کو سینے کے جتن کر رہا تھا۔

”اور ایک بیوی اور چار بچے، وہ کیا ہیں؟ وہم، خواب یا خیال؟“ سارہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور کھڑی ہوئی۔

”تم ایسا نہیں کر سکتیں تم میری بیوی ہو، ماریہ میری بی بی ہے۔“ وہ اک دم ہی حلق کے بل چلاوا۔

”آہستہ بولو، ماریہ سوری ہے اٹھ جائے گی اور

تمہارے پاس کل دو پہر تک کا وقت ہے ورنہ مجھے مجبوراً پولیس کی مدد لینا پڑے گی۔“

☆☆☆

بھاگا بھاگا وہ عظم بھائی کے پاس آیا تھا۔ ان کے علاوہ اور کہاں جاتا، ایک وہی خیر خواہ اور دوست تھے اس کے۔

”بیک وقت دو کشتیوں میں سواری کا انجم اور کیا ہوگا ریاست؟“ انہوں نے ترنم سے اسے دیکھتے ہوئے بتایا کہ اس کی شادی اور بی بی کی خبر پاکستان پہنچ چکی ہے۔ منصور ایک جذباتی اور جوشیلا نوجوان تھا، اس سے راز داری کی توقع کیے کر رکنا جبکہ معاملہ اس کی بڑی بہن کا تھا۔

”رافدہ کا فون آیا تھا میرے پاس، مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ یہ سچ ہے یا نہیں؟“ عظم بھائی نے اس کی بیوی کے حوالے سے حیرت کہا۔

”اور شاید وہ بھی خود کو کھلی دے رہی تھی مگر اس کا سگا بھائی اس سے جھوٹ کیوں بولے گا؟ پھر کیسی وہ مجھ سے تصدیق کر رہی تھی، میں جھوٹ بول کر کیا کر سکتا تھا؟“

”اف!“ وہ کراہ کر رہ گیا، اپنے بال بچنے کی دل کر رہا تھا۔ حالات اس سچ پہ جچ جائیں گے جھوٹ نہیں تھا اور آگے کا وہ سوچتا ہی کب تھا۔ حال میں جینے والا، مستقبل کے بارے میں ہمیشہ یہ کہہ کر ٹالنے والا کہ جو ہوگا دیکھا جائے گا مگر اب جو ہو رہا تھا وہ ریاست سے دیکھا جا رہا تھا مگر اب ہمارا تھا۔

”شکر کرو اس نے تمہارا خیال کر کے صرف گھر بدری کیا ہے، پولیس کی صرف دھمکی دی، جو انہیں کیا، ورنہ وہ یہ بھی کر سکتی تھی۔“

”عظم بھائی! میری بی بی اس کے پاس ہے، وہ کیا تربیت پائے گی اس ماحول میں؟“ ریاست بلبلاتا تھا، ایک بی بی جانی کر رہی اور بیٹے بے گھر کا شیرازہ ٹوٹ کر ٹھہر گیا تھا وہ دکھ اپنی جگہ گرسب سے زیادہ اسے بی بی کی فکر تھی۔

”یہ سب تو پہلے سوچنا چاہیے تھا نا؟“ عظم بھائی نے طنز نہیں کیا تھا۔ حقیقت سے آگاہ کیا تھا۔

”موت اور جوئے نے معاملات بھلا کر تک چھپ گئے ہیں؟ کبھی نہ کبھی تو حقیقت کھلتی ہے اب اگر انسان ریت میں سر چھالے یا آنکھیں بند کر لے تو آنے والا خطرہ یا غم دشمن کو نہیں جاتا۔“

”اب کیا کروں؟“ دونوں ہاتھوں میں اپنا سر گھاسے، غشت حال، ٹوٹا پھوٹا ریاست احمد ان کے سامنے بیٹھا سوال کر رہا تھا۔

”اب تمہارے کرنے کے لیے کچھ نہیں بچا، قدرت خود ہی فیصلہ کر لے گی، خاموش رہو اور کچھ عرصے کے لیے خود کو حالات کے دھارے پہ چھوڑ دو۔“ عظم بھائی نے وہی مشورہ دیا جو ان کی کجی میں آیا مگر قدرت اپنا فیصلہ پہلے ہی کر چکی تھی۔

اگلے روز جب ریاست ان کے گھر سے نکل کر ایک ہی آیا تو قدرت کا وہ فیصلہ اس پر نافذ ہو گیا۔ شاید وہی انجمنوں میں زیادہ گھرا ہوا تھا کہ انتہائی تیز رفتار گاڑی کو نہ دیکھ سکا، ایک سیٹ بہت خوفناک تھا۔ سارے زخم بھر گئے کہ بعد میں بڑھ کر بی بی میں کچھ ایسی پیچیدگی ہوئی کہ وہیل چیئر کے سوا کوئی سہارا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ ریاست کے بے حد اصرار پر عظم بھائی سارہ کے گھر کے مگر وہ نہیں ملی مگر سچ کر کہیں اور چھپ چکی تھی، کہاں؟ یہ کسی کو نہیں معلوم تھا۔

اب ایک ہی راستہ تھا۔ عظم بھائی اب اپنے ساتھ لے کر پاکستان آگئے۔ رافدہ کا صدمہ، غم، غصہ، دکھ بے اعتباری سارے گلیشیر پھیل کر پانی بننے لگے اور سارے پھاڑ مٹی کا ڈھیر بن گئے جب اس نے بار، کمزور اور شکست خوردہ ریاست علی کو وہیل چیئر پہ دیکھا۔ اس کا شوہر اس کے چار بچوں کا باپ۔

”انسان خطا کا پتلا ہے، غلطیاں کس سے نہیں ہوتیں، ہمہ تن آدمی سے ہی سرزد ہوتے ہیں فرشتوں سے نہیں۔“ رافدہ نے نرم دلی سے سوچا اسے شوہر پہ کس آیا، رحم آیا اور ایک اچھی، رواں بیٹی شرفی بی بی کی طرح اس نے ریاست علی کی غلطی یا جرم یا گناہ، جو بھی تھا اسے معاف کر دیا۔

☆☆☆

بکھری ہوئی چیزیں ٹھکانے لگا کر اس نے فریج کھولا، سینڈویچ بنے رکھے تھے، ماریہ نے انہیں گرم کیا، کافی بنائی، دونوں چیزیں لے کر ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی اور بے دلی سے سینڈویچ کا کونا کترنے لگی۔ چمک نظر سامنے صوفے پر بیٹھی سارہ کو دیکھا جو معمول کے مطابق بے تحاشا اسوگنگ کر کے الیش ٹرے لبالب بھر چکی تھی اور بدستور اپنے آس پاس دھواں پھیلانے اسی غفلت میں مہنگ تھی۔

”بھئی!۔۔۔۔۔!“

”ہوں۔“

”ڈاکٹر نے اسوگنگ کم کرنے کو کہا ہے۔“

ماریہ نے اسے یاد نہیں دلایا بلکہ تنبیہ کی تھی۔

”جانتی ہوں۔“

”انتی کیوں نہیں ہو؟“ ماریہ بری طرح عاجز آ گئی تھی، سینڈویچ کا کونا کترنے کا غفلت بھی روک دیا۔ گرم کافی کا کھونٹ بھرا زبان، حلق اور سینہ جلاتا ہوا گھونٹ پیچھا کرتا۔

”تم اپنے کام سے کام رکھو، نصیحتیں مت کرو مجھے۔“ ایک زمانہ ہوا سارہ، سارے زمانے سے بے زار تھی، مٹی اپنی بی بی سے بھی ہو جاتی۔

”ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اسی طرح اسوگنگ کرتی رہیں تو کینسر ہو جائے گا۔“

”تو؟“

”تو؟“ تو یہ کہ اگر اس شخص سے اتنی ہی محبت تھی تو روک لیتیں، اسے کیوں جانے دیا، کیوں نکال پھینکا اپنے گھر اور زندگی سے؟

ماریہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا تو وہ اسی طرح پھٹ پڑتی تھی۔ بی بی نہیں رہی تھی، پچھلے چھ برسوں سے ماں کو بھرتے، ہلکتے اور جلتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ آس پاس انسانوں کی کمی نہ تھی مگر اس نے راہ فرار جو چنی وہ مگر بے نوث تھی، بے تحاشا دھوئیں میں خود کو چھپا کر وہ شاید اپنے غموں کو بھی چھپا لیتی تھی مگر اب ڈاکٹر نے خبردار کر دیا تھا اور سارہ کے نزدیک یہ ایک معمولی سی خبر تھی۔

”تم کیوں اتنی پابرجا ہو جاتی ہو؟“ سارہ نے بے حد سکون سے سس لگاتے ہوئے بچی کو دیکھا تھا مگر اس کی انگلیوں کا اضطراب ماریہ سے پوشیدہ نہ تھا۔

”تاہم کر لیا ہے تم نے خود کو، اب تو سنبھالو اپنے آپ کو، مجھے دکھ ہوتا ہے تمہاری حالت دیکھ کر“ ماریہ نے کھٹکتے ہوئے کافی کا دوسرا گھونٹ بھرا، اب یہ قدرے گوارا تھا۔

”دکھ تو مجھے بھی بہت ہوا تھا، جب یہ علم ہوا کہ محبت صرف میں نے کی تھی اس نے نہیں۔“ سارہ نے ختم ہوتا سرکٹ کا نوٹائیشن ٹرے میں سلا۔

”ڈاکٹر نے کہا ہے کہ وہ اس معاملے میں تمہاری مدد کر سکتے ہیں۔ دھیرے دھیرے یہ عادت لگاتار ختم ہو سکتی ہے تمہاری۔“ ماریہ نے امید بھری نگاہوں سے مال کو دیکھا۔

”شہ اپ مجھے کوئی دلچسپی نہیں ڈاکٹر سے یا اس کے مشوروں سے۔“ سارہ نے بے زاری سے سر جھکا۔

”مجھے تمہاری ضرورت ہے محی! مجھے محبت ہے تم سے۔“ ماریہ کر لائی۔

”آئے دن کی بحث بغیر کسی نتیجے کے لا حاصل رہتی تھی مگر پھر بھی وہ باز نہیں آئی تھی۔“

”تم اب بڑی ہو گئی ہو ماریہ! اپنا خیال خود رکھ سکتی ہو، اب میرے پروں میں چھپنا چھوڑ دو۔“ اس بار سارہ کا لہجہ نسبتاً ملامتھ لہجے ہوئے تھا۔

”اف!“ کافی کے پتھا گھونٹ لی کر اس نے گگ خالی کیا۔ اور کھڑی ہو گئی۔ ذرا سا کونٹا کترا ہوا سینڈویچ اسی نے اپنے پیکیج میں رکھا۔ اچھی وہ بانی اسکول میں بھی مگر ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں پارٹ ٹائم جاب کرنے لگی تھی۔ ایک دو گھنٹے بعد جب اسے بھوک لگی تو یہ سینڈویچ اس کے کام آتا۔

”زندگی کو کتنے سرے سے شروع کر دمی!“ اس نے بیک کا ندھے پر ہانکا۔

”ختم ہوئی چیز کو کیا نئے سرے سے شروع کرے کوئی؟“ سارہ نے خالی خالی نظروں سے بچی کو

جاتے ہوئے دیکھا، دروازہ بند ہونے کی آواز سنی اس کا دل مر گیا تھا۔

اسی دن، اسی وقت جب منصور ان کے گھر آیا تھا اور بعد میں جیسے جیسے وہ سوچتی رہی، اسے خود پر ترس آتا رہا، کتنی آسانی سے ریاست علی نے اپنے مطالب اور اپنی ضرورتیں پوری کی تھیں، وہ محبت کے نام پر بے وقوف بنی رہی۔

اسے کتنا شوق تھا کہ اس کے کم از کم تین چار بچے تو ہوں، اکلوتے پن کی تنہائی وہ خود چھیل چکی تھی اس کی خواہش تھی کہ اس کا بچا اس تنہائی کا شکار نہ ہو۔ مگر ریاست ہمیشہ اسے بھلاتا رہا کہ تھوڑا اور مالی استحکام آ جائے تو وہ پہلی ضرور بڑھائیں گے اور ادھر پاکستان میں وہ اپنی پہلی میں اضافہ کرتا رہا۔

ہر ڈیڑھ دو سال بعد وہ پاکستان جاتا تھا۔

سارہ سوچ سوچ کر باہل ہوئی رہی۔ محبت کی ناقدری اور جذبات کی پامانی کا دکھ کوئی چھوٹا دکھ نہیں ہوتا ویمک ہوتی ہے جو پورے وجود کو کھاجانی ہے۔ گھن ہوتا ہے جو مضبوط سے مضبوط لپکتی ہوئی مٹی بنا دیتا ہے وہ بھی رفتہ رفتہ مٹی کا ڈھیر بن جاتی تھی۔

☆☆☆

مرگ پر بکھرے سچے زرد اور سوکھے ہوئے تھے، پھر بھی اس کے چہرے تلے دب کر احتجاج کر رہے تھے۔ چرچر کر رہی ملائیں ہلند کر رہے تھے۔ حالانکہ درخت سے گرنے اور شاخوں سے جدا ہونے کے بعد بھلا کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ کہیں بھی اڑتے پھریں یا قدموں تلے آ کر چھڑ ہو جائیں، پھر بھی وہ اپنا تنہا منسا سنا احتجاج ضرور کرتے ہیں۔ قدموں تلے روندے جانا کسی کو بھی اچھا نہیں لگتا، چوں کہ بھی نہیں۔

اپنے چوں تلے چرچر کی آوازوں سے بے خبر اور بے نیاز سر جھکائے اپنے رستے پر بلکہ ایک نئے رستے پر دو ان بھی جب کسی نے اس کا بازو پکڑ کر ایک طرف کھینچا، وہ موثر سائیکل جو اسے روند

لائی بہت تیزی سے اس کے برابر سے گزری تھی، اس نے اس موٹر سائیکل کی تیز آواز اب سنی تھی ایک لمبی آواز۔

”تمہیں اتنی بڑی بائیک دکھائی نہیں دی، نہ اس کی آواز سنائی دی اندھی ہو، بہری ہو یا نشے میں“ درخت لہجے میں وہ پوچھ رہا تھا۔

ماریہ نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، جھکے سے کھینچے جانے پر اس کی جیکٹ کا ہڈسے سے پلٹ کر پیچھا کر رہا تھا۔ اس کا بازو ابھی تک مضبوط گرفت میں تھا۔ حالانکہ آج خلاف معمول آسمان صاف تھا مگر آنکھوں میں دھند کی وجہ سے اسے بائیک دکھائی نہیں دی اور اندازاً تا شور مچا ہوا تھا کہ باہر کی کوئی آواز سنائی نہیں دی۔

”روکیوں رہی ہو؟“ سیاہ آنکھوں اور سیاہ بالوں والے اس خوش شکل نوجوان نے ٹھٹھک کر اس کا بازو پھوڑا۔

”کچھ نہیں۔“ ماریہ نے اپنی آنسو بھری آنکھیں اور چہرہ ہلچلی سے لرزایا۔

”مطلب؟ کوئی وجہ نہیں رونے کی؟ شوق ہے تمہیں آنسو بہانے کا؟“ سیاہ آنکھوں میں مسخر ابرو، ماریہ ترنٹ گئی، پھر تن ہوئی۔

”میری ماں مر گئی ہے، کیا یہ وجہ کافی ہوگی رونے کے لیے؟“

وہ سیاہ آنکھیں چند لمحوں تک ماریہ کو دیکھتی رہیں، اس کا رویہ اوداں اور بچہ، الٹی سیدھی کھینچ کر ماریہ کی پونی سے باہر نکلیں جو کانوں اور گالوں کے آس پاس جمول رہی تھیں۔ اس کی خردلی انگلیوں والے خوب صورت ہاتھ جو اپنی آنکھیں اور چہرہ صاف کر کے اب پہلو میں گر گئے تھے۔ وہ جینز اور جیکٹ میں ملیں تھی۔

”کیا واقعی؟ یہ سچ ہے جو تم نے ابھی ابھی کہا؟“

”کیا ایسی بات کوئی مذاق یا جھوٹ میں بولتا ہے؟“

”اچھا، ٹھیک ہے، تم ادھر آرام سے بیٹھو، پھر

بات کرتے ہیں۔“ نوجوان نے دوبارہ اس کا بازو تھاما مگر اتنی احتیاط سے جیسے کوئی کاٹھن کی بنی بازگ سی شے، ماریہ کو قہر میں ایک منہ پر بٹھا کر وہ خود بھی وہیں بیٹھ گیا۔

”اب ہٹاؤ شروع سے آخر تک پوری بات؟“

”میری ماں مر گئی ہے۔ بس یہی ہے شروع سے آخر تک پوری بات؟“ ماریہ کے گلے میں پھر کچھ ایک رہا تھا اس نے بڑی مشکل سے خود یہ قابو پایا۔

”کسی کے جانے سے زندگی ختم نہیں ہوتی، تمہارے لیے پوری دنیا موجود ہے، ساری خوشیاں، مسکراہٹیں سب ہیں، ان میں سے اپنا حصہ سنبھالو اور ان آنسوؤں کو ایک طرف کر دو۔“ وہ لڑکا چاک ہی بہت معتبر اور بردبار سا بن گیا۔

”آنسو ایک طرف کرنا آسان نہیں ہوتا۔“ ماریہ نے اپنی پچھلی ٹانگیں اٹھا کر اسے بتایا مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ ابھی تک، ایک ہفتہ گزرنے پر بھی اسے، اس طرح تسلی نہیں دی گئی تھی۔

”انتہا مشکل نہیں نہیں ہوتا۔“ لڑکے نے اس کی بات سے اتفاق نہ کرتے ہوئے سر ہلایا اور اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

”ویسے میرا نام کبیر ہے اور تم؟“

”میں ماریہ ہوں۔“ ماریہ نے خود کو کہتے سنا۔

ایک انسان اکیلا ہوتا تو کچھ نہیں ہوتا، جب دو

ہو جاتے ہیں تو کہانی بن جاتی ہے یا بننا شروع ہو جاتی ہے تو کبیر اور ماریہ کی کہانی کی بہت شروع ہو گئی تھی۔

کبیر کا یونیورسٹی میں آخری سال تھا۔ ماریہ ابھی کالج میں تھی۔ پھر بھی ہر دوسرے تیسرے دن ملنا ملنا انتہا مشکل نہ تھا۔ ماریہ اس کی طرف یوں پھٹی چلی آئی جیسے کبیر کوئی متناظر تھا اور وہ یعنی ماریہ جیتتی جاتی انسان کے بجائے کوئی لوہے کا ٹکڑا۔ دونوں زیادہ تر وہیں بیٹھے تھے جہاں پہلی بار ملے تھے۔ کبیر بولتا رہتا وہ اسے رتی رتی جیسے کوئی مقدس جھنڈ۔

کبھی وہ گٹار پر دھنیں بجا کر اسے سنانا، اسے گٹار بجانے کا شوق تھا، یونہی شوق ہی شوق میں تھوڑا

بہت کچھ بھی گیا تھا۔ تو جب وہ مختلف مٹھی اور ریلی دھنیں بجاتا تو ماریہ اس کی آڑ لٹک لی مٹی لگی انگلیوں کو گٹار کے تاروں سے چلتا دھنکتی اور انتہائی انتہاک سے ساتھ ان تاروں سے لٹنے والی موسیقی سنتی، جن میں اس کی دھڑکنوں کی تال بھی شامل ہو جاتی۔

ماریہ کا دل بد لگے لگتا تھا۔ روز و شب، خیالات معمولات اور زندگی کی ہر پلے لگے، اب وہ گھر پر اتنی تنہا اور اکیلی نہیں ہوتی تھی جتنا کہ پہلے خود کو محسوس کرتی تھی، اب کبیر کا خیال، اس کا احساس ماریہ کے ہر قدم پر ہٹے لگتا تھا۔ تنہائی کو ہمیشہ رفاقت کی ضرورت ہوتی ہے چاہے وہ رفاقت اصلی ہو یا خیالی۔ ماریہ اکیلی ہوتی تو کبیر اس کے خیالوں میں ہمراہ ہوتا ملاقات ہوتی تو اس کی ہمراہی میں خواب دیکھتی رہتی۔

دس سال کی عمر تک ماریہ نے ماں اور باپ دونوں سے بھرپور محبت اور مکمل توجہ حاصل کی تھی۔ ریاست ملی کے چلے جانے کے بعد وہ باپ کی توجہ اور محبت سے محروم ہوئی اور سارہ اپنی بیٹی سے محبت کرنے کے باوجود بھی اس کا اظہار پہلے کی طرح نہ کر سکی، اپنے غموں میں ڈوب کر وہ خود سے بھی بیکانی ہو گئی تھی، ماریہ کا کیا خیال کرتی۔ ماریہ اس کی توجہ اور اس کے پیار کو ترس گئی تھی۔ وہ خود غرض بھی نہ تھی لاپرواہ، ماں کی بے اعتنائی کے باوجود اسے اپنی ماں سے محبت تھی۔ وہ اپنی بساط سارہ کا خیال رکھنے کی کوشش کرتی رہی۔ مٹریک تک تھی اس کے اندر جو وقت کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتی رہی۔

سارہ بھی شاید مجبور تھی اس نے جان بوجھ کر ماریہ کو نظر انداز نہیں کیا تھا مگر جو بھی تھا، ماریہ ایک محرومی کے ساتھ پروان چڑھتی تھی، وہ فکری اور محرومی اب مداوا جاتی تھی جو اسے کبیر کی صورت میں نظر آیا، اس کا بات کرنے کا انداز، خیال رکھنے کا طریقہ، اس کا رویہ، برتاؤ سب اہم الفت کے حروف بن بن کر اس جذبے کو مکمل کر رہے تھے۔

کیا گھاس کی خوشبو آلودہا میں سرسرا رہی

تھی۔ برف پگھلی تو خزاں کے سارے قتل بھی پگھل کر پھولوں کے کھلنے کی راہ ہموار کئے تھے، پارک کے قطعات ٹیولپس کے دیکتے پھولوں سے بھرے ہوئے تھے، ناشپاتی کے پیڑ کے سفید شگونی اعلی چاندنی کی طرح دکھ رہی تھی۔

ماریہ کا دل بھی ایسے ہی دیکتے، دیکتے کھلتے ہوئے پھولوں، کلیوں اور ٹھکوں سے بھرا ہوا تھا۔ بڑی پیاری دھوپ بھی جو چار طرف پھیلی تھی۔ ایسی دھوپ یہاں روز روز نہیں نکلتی تھی۔ کوکہ ہوا سردی مگر سورج کی کرنیں اس ہوا سے بھرپور مقابلہ کر رہی تھیں۔ ایسے خوب صورت پھولوں کے دلکش منظر کا حصہ بنے اور اتنی پیاری دھوپ اور ٹیکلی لکڑی ہوا میں بیٹھے ہوئے ماریہ نے کبیر کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”تمہارے کمرے میں کون کون ہے؟“
”مٹی، پاپا ایک چھوٹا بھائی اور میں خود۔“
”جواب ملنے کے بعد کبیر کیسے؟“
”پندرہ کی چھ ماہ کے درمیان اگلا سوال پوچھو۔“
”مے سے سکی بریٹ کروں گا۔“
”پھر؟“
”پھر؟“

کبیر نے ایک گہری سانس لے کر ایسی ہی گہری نظروں سے اسے دیکھا تھا۔
”پھر ایک پیاری سی اور تھوڑی بے وقوف سی لڑکی کو اپنے پیپے سے لڑائی کا۔“
ماریہ کے گال گلابی لہو لہنے لگے تھے مگر اچانک ہی وہ چونکی۔

”کیا کہتا ہے؟ بے وقوف سی لڑکی؟ کیا میں بے وقوف ہوں؟“ اس نے منہ پھلانے کی تیاری کی۔
”مگر میں نے یہ کب کہا کہ وہ تم ہو؟ وہ تو بہت پیاری بھی ہے۔“

”تم کچھ کہہ رہے ہو یا مذاق کر رہے ہو؟“ وہ رو ہنسی ہوئی۔
”کہا تھا کہ تھوڑی بے وقوف ہے، تو وہ تم ہو۔“ کبیر نے اس کے گال مسختہ کئے۔ ”بالکل

اگر۔“

”کبیر! ماریہ نے اپنے لیے لیے ناخن کی گلابی میں چھوئے۔“
”دیکھو، میرا ہرگز کوئی ارادہ نہیں کسی جنگلی ملی سے شادی کرنے کا۔“ کبیر نے اسے منہ بتا کر تنبیہ کی مگر اس سخت جعبہ کے پیچھے ایک زوردار قہقہہ چھٹک رہا تھا جو بالآخر خرابی ہی پڑا۔

”آج تک بہت لڑکیوں سے واسطہ پڑا مگر کسی کوئی نہیں ملی۔“
”مجھ جیسی کیا؟ حسین؟ ذہین؟“ ماریہ نے ہلکوک لگا ہوں سے اسے دیکھا۔
”تم جیسی مطلب بس تم ہی جیسی تھوڑی پامل، تھوڑی ذہن تھوڑی۔“

کبیر کا تھوڑا نامہ اور حواہی رہ گیا، جنگلی ملی کے ناخن بڑی طرح اسے نوج کھسوت رہے تھے۔
”اب میں تم سے بالکل بھی بات نہیں کروں گی۔“ بہت زیادہ تکرار مٹا کر ماریہ نے اعلان کیا۔

”کاش تم ہمیشہ اس عہد پر قائم رہو، زندگی کتنی حسین ہو جائے گی۔“ قہقہوں کی ایک سیریز تھی جس کا آغاز ہو چکا تھا، وہ ہنس ہنس کر لوٹ لوٹ ہو رہا تھا اور مارے غصے اور بے بسی کے، ماریہ کے گلابی گال اور سرخ ہوتے جا رہے تھے جب وہ اچانک ہی اٹھ بیٹھا۔

”آئی لو یو ماریہ، آئی لو یو میری بچ۔“ اس کے ہاتھ تھامے کبیر یکا یکا سمجیدہ ہو گیا، سرخی مائل گلابی گال فوراً ہی قدرہاری انبار بن گئے۔

☆☆☆

پوری رات یونہی گزر گئی، آنکھوں آنکھوں میں، کروٹیں بدلنے میں وہ آنکھیں بند کر لی یا کھولی ایک پیارا سا بلکہ دنیا کا سب سے پیارا قہرہ اس کی مامتوں کو اور خود اسے بھی گدگداتا رہتا اور کتنے دن اور کتنی راتیں اسی شمار میں گزریں اور پھر ایک رات اور اسے ٹھیک سے نیند نہیں آئی اور اگلے صبح سے لے کر

شام تک اس نے اپنی پوری وارڈروب بیلے پہ پھیلا دی مگر اسے کوئی جوڑا پسند نہیں آیا تھا، آنکھیں کے سامنے کھڑے ہو کر درجنوں ہینر اسٹائل بنائے گئے کچھ نہیں آ رہا تھا کہ فاسل کے کرے، تیاری، تیاری اف صبح سے شام ہو گئی۔

جانے کا وقت قریب تھا مگر اس کی تیاری، وہی تو مکمل ہو رہی تھی نہ فاسل، جوڑا کیا ہوا، ہینر اسٹائل، میک اپ کون سا انداز اختیار کرے جو دنیا کی سب سے پیاری، سب سے حسین لڑکی بن جائے اور وہ، اسے دیکھتے ہی پسند کر لیں جن سے ملنے جارہی ہے، اس کی تنہا، بے تاب تنہا، مہربل عاشقی گھوگر رہی تھی، آخر ٹھہراؤ، سکون، اطمینان کہاں سے آئے، کیسے آئے؟ اور اسی اوپر بن بن میں باقی بچا تھوڑا سا وقت بھی گزر گیا۔

کال بلی بجی، کسی ریلوٹ کی طرح اس نے دروازہ کھولا اور سی مجرم کی طرح کھڑی ہوئی سر جھکا کر۔

”نیار ہو تم؟ چلیں؟“ کبیر کی حیرت سے پھیلی نگاہوں نے پہلے اس کے کمرے کا پھیلاؤ دیکھا پھر اسے دیکھا، پھر غور سے دیکھا۔

”تم تیار نہیں ہوئیں اب تک؟“ وہ اتنی بلند آواز میں بولا تھا جو کس جینے کے ہی قریب تھی۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا میں کیسے تیار ہوں۔“ وہ منمنائی۔

”اوہ! کبیر نے ہونٹ کیڑے۔“ تم پہلے بتا دیتیں، میں ریسرچ کر لیتا کہ آج کل ہالی وڈ کے بڑے بڑے میک اپ آرٹسٹ اور ہینر اسٹائل کون ہیں، ان میں کس سے اپائنٹ لے لیتے۔“

”کبیر۔“

”کیا کبیر؟ تمہارے پاس صرف پانچ منٹ ہیں۔ میرے والدین وقت کے انتہائی پابند ہیں اور جو لوگ وقت کے پابند نہیں ہوتے انہیں سخت تائیند کرتے ہیں، اب آگے تمہاری مرضی۔“ وہ تو کدھے اچکا کر ایک طرف ہو گیا۔

”اچھا اب ایک منٹ رکھو، میں پانچ منٹ میں آئی۔“ ماریہ کو خوش نہیں پتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے، کیا کر رہی ہے، اس نے اب، اس بار آنکھیں بند کر کے کپڑوں پہ ہاتھ پھیرا جو دیگر ہاتھ آیا اسے لیے وہاں سے بھاگ لی بھامگ بھاگ ہی کپڑے بدل کر وہ آئی تو کبیر گاری کی چابی ہاتھ میں گھما رہا تھا۔

”فناٹ آ جاؤ، میں گاڑی اشارت کر رہا ہوں۔“

جتنی دیر میں اس نے جوتے پہنے تین بار باران نچ چکا تھا، نگھٹا اور اپ اسٹک اور سکارا شولڈر بیگ میں ڈالتے ہوئے اس نے بیک کاندھ سے لٹکایا، گھر لاک کیا اور فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تو وہ پانچویں بار باران بجا رہا تھا۔

”اب بس کرو میرے زیادہ تر پڑوسی بڑے کھڑوس ہیں، بڈھے کو سوٹ بات بات پہ پولیس بلا لیتے ہیں۔“ ماریہ نے اسے ڈرایا۔

چلتی گاڑی میں اب اسٹک لگانے کی زیادہ مشق تو نہیں تھی، پھر بھی لگا ہی لی، بار بار آئینہ دیکھنے پر مگر تسلی نہیں ہو رہی تھی۔

”دیکھو کبیر، ٹھیک کیسے ہے نا؟“

”میری کی کو یہ فگرز ہر گز گلتا ہے۔“

”کیا واقعی؟“

”مگر پایا جان دیتے ہیں اس رنگ پہ۔“

”پھر کیا کروں؟“ وہ تھوڑے ہوئی۔

”رہے دو، جو ہو گا دیکھا جائے گا۔“ کبیر نے ایک بے چاری سی سرد آہ بھری جو دراصل ماریہ کو بھرنی چاہیے تھی۔

اپنے تسلی بالوں میں وہ نگھٹا پھیرتی رہی اور بس بھی کرتی رہی کیونکہ ان میں لگانے کے لیے کوئی چیز اس کے ہینڈ بیگ سے دستیاب نہ ہوئی، جو ویلے تو عموماً عیار کے زینل بنار پتا تھا مگر آج بقول کبیر اس کے دماغ کی طرح خالی تھا۔ تو جب تک کبیر کا گھر آیا، وہ نگھٹا کر کے بے زار ہو گئی، سیدھی مانگ کر کے دو دنوں طرف سے بال کانوں کے پیچھے اڑس لیے

اور اپنا دل پکا کرنے کی کوشش کی (یوں بھی میں اچھی لگتی ہوں) پر فیوم ایک بار پھر اس پرے کر کے پیچھے اتر آئی۔

کبیر اسے لکڑا رنگ روم میں آیا اور وہاں بٹھا دیا، وہ بیٹھ گئی۔ نروس ہوئی رہی اور انتظار کرتی رہی، کبیر غائب تھا اور اس کے والدین بھی، تقریباً تیس منٹ بعد وہ واپس آیا، منہ میں کچھ چپاتے ہوئے صوفے پہ بیٹھ گیا۔

”تمہارے والدین وقت کے بہت پابند ہیں؟“ ماریہ نے ایسی نگاہوں سے دیکھا جو جس کلاشکوف کے برسٹ جیسی ہی ہوتی ہیں، قتل کر دینے والی جان سے مار دینے والی۔

”آ رہے ہیں، یہ چل کر وہ۔“ اس نے جنز کی جب سے موگنگ چلی کے دانے برآمد کر کے اس کی طرف پٹھلے۔

”تھوٹیکس۔“ نروس ہو کر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں مروڑ مروڑ کر اس نے گلابی پے کپڑے کر لی تھیں۔

”دراصل می تیار ہو رہی ہیں اور جب می می تیار ہوتی ہیں نا تو وہ کیلنڈر کے صفحات بدل جاتے ہیں۔“

”اس کی باتوں میں نہ آنا لڑکی! اس نے تمہیں تمہیں، ہمیں سر پرائز دیا ہے، ہم اپنی می کو سوتے سے اٹھایا ہے۔ وہ ابھی آ رہی ہیں۔“

درمیانے قد و قامت کے دبیلے تنے پہ کبیر کی طرح ہنس کھڑے، وہ اچانک ہی اندر آ کر بوکا شروع ہو گئے، ماریہ کی نروس اور کمزوری بیلو کے جواب میں انہوں نے ہائے کہا اسے غور سے دیکھا پھر مسکرایا۔

”شانت رہو، ہم لوگ اسے خوفناک نہیں ہیں جتنا اس لڑکے نے تمہیں بتایا ہو گا۔“

وہ بڑے نرم لہجے میں اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے، کبیر جانے کہاں غائب ہو گیا تھا مگر ماریہ اب پرسکون تھی۔ اس کی گھبراہٹ کم ہوتے ہوئے اب اس ختم ہی ہو چکی تھی۔ پھر کی آدھی جی ہو

گئی، ماریہ نے کھڑے ہو کر انہیں بیلو کہا اور ہاتھ لانے کے لیے بو جانے کو بھی مگر اس سے پہلے ہی انہوں نے ہاتھ جوڑ کر پڑی شانتگی سے منستے کہا، ان کی آواز پڑی تھی اور سر ہلکی تھی۔

ماریہ نے پیٹتے ہوئے دیکھا، فیوزی رنگ کی ساڑھی میں میلس جس کے کنارے پہ چمکیلی پاؤڑی سی پٹی تھی۔ ماریہ کو بعد میں علم ہوا کہ اسے بناری پاور رکھا جاتا ہے۔ سانولی سلونی مکروہہ برکشش نقوش کی مالک تھیں۔ ماتھے پر سرخ رنگ کا گول ٹیکہ ہلکی پھلکی چوڑی اور میک اپ۔

”میرا نام آتھ کھنہ ہے اور یہ میری مسز پشپا کھنہ۔۔۔۔۔ اور پشپا ماریہ علی ہیں۔“ کبیر کے والد نے کھڑے ہو کر باضابطہ تعارف کی رسم ادا کی اور تینوں پشپا کھنہ۔ ہلکی چمکیلی ادھر ادھر کی باتوں کے دوران سوالیہ لہجے کے ذریعے اس کا انٹرویو بھی جاری تھا۔

”وہ پاکستان میں رہتے ہیں می اور ان کی علیحدگی ہو گئی تھی۔“

”مسلم؟“

”جی۔“

دونوں میاں بیوی کی نگاہیں ایک لمبے کو آپس میں ملیں۔

”اور تم آتم بھی مسلم ہو؟“ پشپا کھنہ نے سرسراتی آواز میں سوال کیا۔

”میں؟“ ماریہ نے حیران ہو کر انہیں دیکھا، وہ کنفیوز ہونے لگی تھی۔

”دیکھو بات یہ ہے کہ یہاں یعنی مغرب میں مذہب کے بارے میں سوال کرنا بدتہذیبی اور غیر شائستہ طرز عمل تصور کیا جاتا ہے اسے انسان کا نجی معاملہ قرار دیا جاتا ہے مگر ہمارے پھر میں مذہب کے معاملے میں سوال کرنا اور جاننا ضروری، خصوصاً جب شادی وغیرہ کا معاملہ ہو اس لیے یہ سوال تم سے کیا ہے۔“ آئند صاحب نے بڑے سجاو اور نرم لہجے میں وضاحت کی تھی۔

”دراصل اس موضوع پر ہماری کبھی بات نہیں ہوئی۔“ خاموشی سے ان کی گفتگو سنتے کبیر نے پہلی بار مداخلت کی تھی۔

ماریہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سوال کا کیا جواب دے۔ دس سال کی عمر تک وہ مسلمان تھی۔ ریاست علی نے اسے نماز سکھائی تھی، قرآن پڑھوایا تھا، گلے اور دعائیں یاد کروائی تھیں۔ اس کے جانے کے بعد آہستہ آہستہ وہ سب چھوٹ گیا تھا اور اب بچپن کی بیروں سے، دیکھا جائے تو وہ کسی مذہب پر عمل نہیں کر رہی تھی وہ مسجد جاتی تھی نہ ہی چرچ، وہ کون تھی؟ کیا تھی؟ ان سوالوں کے جواب ماریہ کو نہیں آتے تھے۔

”اچھا یہ بتاؤ تم کبیر سے پہلی بار کب اور کہاں ملی تھیں؟“ پایا نے مسکرا کر موضوع ہی بدل ڈالا اور ماریہ کو اس مشکل صورت حال سے باہر نکالا، مگر وہ تہذیبی و فنی سوال اپنی جگہ باقی تھا۔

”وہ کون ہے؟ جس مذہب پہ عمل کرے گی؟“

پشپا کھنہ اس سوال کا جواب جانے بغیر اگلا قدم اٹھانے کو تیار نہیں تھیں۔ وہ اگرچہ برسی لکھی ماڈریٹ عورت تھیں، پچھلے ستائیس برسوں سے مغرب میں سکونت اختیار کیے ہوئے تھیں۔ بیٹے کی پسند اپنانے پر راضی تھیں مگر اندر سے کٹر مذہب پرست تھیں۔ انہوں نے بیٹے سے صاف کہہ دیا تھا۔

”دھرم اہم ہے کبیر، اس کے بغیر تم اپنی مرضی چلا سکتے ہو مگر میری خوشی شامل نہیں ہوگی اس میں۔“

”آپ فکر نہ کریں می! کوئی نہ کوئی راستہ میں نکال ہی لوں گا، اپنی مرضی کے ساتھ ساتھ مجھے آپ کی خوشی بھی عزیز ہے۔“ کبیر شتر پہ مہار نہیں تھا۔ والدین سے محبت کرنے والا ان کی خوشیوں کا خیال کرنے والا ہونہار اور سعادت مند بیٹا بھی تھا۔ محبت اپنی جگہ مگر وہ صرف ماریہ کے ساتھ گھر بسانے کا خواہش مند نہیں تھا، اس کے ساتھ شادی کر کے اپنی فیملی کا حصہ بنانا چاہتا تھا، جس میں مرکزی اور اہم افراد اس کے والدین تھے۔

”میں بات کر لوں گا ماریہ سے۔“ ماں کے کندھوں پر ہاتھ کرکے اس نے وعدہ کیا تھا ان سے۔
”مشکل ہی ہے مسلمان اپنا مذہب نہیں بدلتے، کوئی ایک آدھ ہی ہوتا ہے جو.....“ پشیمانے اپنے شوہر کو غلط کر کے تہرہ کیا تھا۔

☆☆☆

اور اسے اندازہ نہیں تھا کہ ماریہ ان ”ایک آدھ“ میں شامل ہو جائے گی، جب کبیر نے اس کے سامنے یہ معاملہ رکھا تو اس نے نگاہ بھر کے کبیر کو دیکھا۔

”کبیر! کئی سال ہو گئے مجھے خود بھی نہیں معلوم کہ میرا مذہب کیا ہے مگر مجھے یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ میری محبت کیا ہے، تم اپنے ساتھ جہاں لے جاؤ گے میں آنکھیں بند کر کے چلی جاؤں گی، چاہے وہ کوئی مسجد ہو، چرچ ہو یا مندر۔“

پشامیت کسی کے اعتراض میں اب کوئی وزن نہ رہا تھا۔ اس نے کبیر کے والدین کے لائے ہوئے سرخ بنارس ساڑی اور زیورات پائین کر آگ کی گرد سات پھیرے لے کر اپنی محبت کو ثابت بھی کر دیا تھا اور حاصل بھی کر لیا تھا۔

☆☆☆

ایکایاں لے لے کر وہ بے حال ہو گئی تھی۔ کچھ کھایا تو تھا نہیں، مشکل سے دو چار کھوٹ جوں پیا تھا وہی باہر نکل آیا۔ بدمذبی وادش بین پر پھٹکے تھکے اس نے غل کھولا تھا۔ پانی کی دھار گرتے ہی ایک مہربان ہاتھ نے اس کی کمر بھلائی۔

”تم تھیک ہو؟“ وہ بہت تشویش اور فکر مند ہی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”ہاں۔“ ماریہ نے آئینے میں اس کا اور اپنا چہرہ ایک ساتھ دیکھا اور مسکرا دی۔
”میں اب تھیک ہوں۔“

”بالکل بھی تھیک نہیں ہو، اتنی کمزور اور پتلی ہو رہی ہو، تھیک سے کھانی پینی نہیں ہو، اب میں تم سختی کرنے والا ہوں۔“ کبیر نے اس کے شانے کے گرد بازو دراز کر کے ہونے اعلان کیا۔

”اچھا!“ ماریہ کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔
”میں کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ میرے دنیا میں آنے سے پہلے میرے باپ نے بھی اسی طرح میری ماں کی باز برداریاں کی ہوں گی؟“ پتا نہیں کیا بات تھی آج کل ماریہ کو اپنے ماں اور باپ دونوں کا بہت خیال آ رہا تھا۔

”ہر محبت کرنے والا اسی طرح خیال رکھتا ہے۔“ کبیر کی انگلیوں نے اس کے بال سنوارے۔
”پھر محبت کرنے والے جدا کیوں ہو جاتے ہیں؟“

”تم کمرے میں چل کر ریٹ کر دو اور اچھی اچھی باتیں سوچو۔“ کبیر نے اس کا سوال مسکراتے انداز کیا۔

”میں پہلے ہاتھ منہ دھو لوں؟“
”تھیک ہے، میں یہیں کھڑا ہوں، تمہیں ساتھ لے کر چلوں گا۔“

کبیر اس کا دھیان بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پچھلے کچھ دنوں سے وہ سارہ اور ریاست علی کے گھر کر کے گئی تھی اور کبیر نے اپنی بیچن کی اپنے والدین کی بہت سی یادیں اور باتیں تیز کرنے لگی تھی اور ان کی باتوں اور یادوں کے دوران وہ شیش بھی ہو جایا کرتی تھی۔

کبیر اسے ہر قسم کی مشغلی سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر کی ہدایت بھی سنی تھی کبیر اسے دیتے ہوئے کوئی دلچسپ قصہ سن رہا تھا۔

ماریہ نے پہلے ہاتھ منہ دھوئے پھر کئی پھر..... میکا کی انداز میں ہاتھ منہ دھوتے ہوئے اس نے سب سے آخر میں ہر دھوئے تھے۔

”چلو۔“ تو لیے سے ہاتھ اور منہ خشک کر کے اس نے کبیر کی جانب دیکھا جو بڑی عجیب سی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”تم نے کیا کیا تھا؟“
”کیا کیا میں نے؟“ ماریہ الجھی۔
”تم نے جس طریقے سے اپنے ہاتھ منہ اور ہر

چیز میں ایسے مسلمان دھوتے ہیں اپنی عبادت پہلے اسے دھو کہتے ہیں۔“
اپنے ہمارا لا کر اسے بیڈ پر بٹھاتے ہوئے کبیر نے اپنی تاثر کے اسے بتایا، اس کے حلقہ احباب اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتے تھے۔ وہ بہت سی عبادت اور رسوم و رواج سے واقف تھا۔

”کیا ہو گیا ہے مجھے؟“ ماریہ بڑبڑاتی، اس کے پاس بے بسی کی پٹائی پھیلا رہی تھی۔
”کچھ نہیں، تم بالکل جا ڈکار ہو رہی ہو، جب

ہر یک کیفیت ہوتی ہو، اپنے ماضی، بچپن اور والدین کے بارے میں بہت سوچنے لگی ہو، اس وقت بھی یاد نہ آئے بچپن میں کہیں پہنچی ہوئی تھیں۔“ کبیر نے درست سزا دے کر کہا تھا۔

”کبیر، ہمیں میں سانسکو۔“ (نفیاتی) تو نہیں اور ہی مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ یکا یک ہی ماریہ خوف زدہ نظر آنے لگی۔

”ماریہ!“ کبیر آگے جھکا۔
”ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ ایسی حالت میں عورت

بہت کچھ سوچتی ہے وہ ماضی بھی ہو سکتا ہے، حال بھی اور مستقبل بھی، بس جو بھی سوچا اچھا سوچو، اگر تم ماضی کے بارے میں سوچو تو خوشگوار یادیں، اچھی باتیں

سوچو۔“ کبیر اسے یوں سمجھا رہا تھا جیسے کسی بچے کو ہمت دیتے ہیں۔
”کبیر میں پاکستان جانا چاہتی ہوں اپنے ڈیڈ

بانا جانا چاہتی ہوں۔“ ماریہ نے اس کے ہاتھ تھام کر ہمت پٹی لے کر کہا تھا۔
”میں تمہیں لے چلوں گا وہاں، وعدہ۔“ کبیر

اس کی آنکھوں میں تیرنی نمی اور بے بسی دیکھ رہی تھی۔
☆☆☆

طائر وقت کی پرواز اپنے معمول کے مطابق گئی۔ دن اور رات کے سیاہ و سفید دھاکوں سے ان کی مہینوں اور برسوں کی لامحدود چادر کی بخت پائی گئی۔ ماریہ کو ان مہینہ نگا تو وہ کبیر کے سر ہو گئی۔

”مجھے ڈیڈ سے ملنا ہے کبیر؟“
”اس حال میں جاؤ گی؟ کچھ عرصہ ٹھہر جاؤ، میں لے چلوں گا تمہیں، اعتبار نہیں ہے مجھ پر۔“ کبیر اسے سمجھا سمجھا کر رنج ہو گیا تھا۔

”مجھے ڈر لگتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ میں مرنے والی ہوں، میں مرنے سے پہلے ان سے ملنا چاہتی ہوں، پلیز کبیر، تم مجھے اور میری فیکٹور کو سمجھو۔“
اس کے آنسو کبیر کی کمزوری تھے، وہ فقط بے بسی سے اپنا سرا مل کر رہ گیا۔

”ایڈریس ہے تمہارے پاس؟“
”میری پرانی ڈائری اور کچھ کھلونے میرے پاس اب تک محفوظ ہیں۔ اس میں لکھا ہے۔“
کبیر نے اپنا وعدہ یا اس کی ضد یا آخر پوری کر

ہی دی۔ ایک طویل سفر کر کے وہ اس گھر کے باہر کھڑی تھی جہاں آم کے درخت کی شاخیں اور پون و بیلا کی بیلن باہر لٹک رہی تھیں۔ اندر بڑے سے صحن میں دہی پھول کیاریاں اور انیل تھیں، چڑتے جو ریاست علی اسے بتایا کرتا تھا۔ بغیر دیکھے بھی یہاں کا نقشہ اسے حفظ تھا۔

ویل چیر پے بیٹھے کمزور سے ریاست علی کو اس نے پہچان لیا تھا اور ڈیڈ کہہ کر اس کے گلے لگی تو ریاست علی نے بھی اسے پہچان لیا۔ اس کے چہرے سے نہیں بلکہ اس کے وجود سے پتہ چلتا اس خوشبو سے جو والدہ کی خوشبو بھلائی ہے۔ ماریہ کے ہاتھ تھامے وہ کچھ نہیں بولا، بس بہت دیر تک روتا رہا، ماریہ کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ آنسو خوشی کے ہیں، پچھتاوے کے یا کسی اور بات کے؟

☆☆☆

اس کی واپسی ایک عام واپسی نہیں تھی جس میں انسان پورا کا پورا رنج و سام واپس آ جاتا ہے۔ یہ واپسی تو ایسی تھی جس میں انسان اور عورت واپس آتا ہے اپنا کچھ حصہ کہیں چھوڑ کر، شعوری طور پر وہ آج بھی اپنے باپ کے زیر اثر تھی بالکل اپنے بچپن کی طرح۔
اسے اندازہ نہیں تھا، انکشاف ہوا تو وہ پہلے

شد شد رہ گئی، پھر دھیرے دھیرے اس کی اپنی زندگی ہی اس کے لیے پہلے وہاں پھر مذاہب بننے لگی۔ ریاست علی نے اس سے جو کچھ کہا وہ سچے کاڑ کر اس کے اندر تک بیٹھ گیا۔ اس کے خون میں یوں سرایت کر گیا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ان باتوں کو اپنے اندر سے پھٹکنے پر انہیں بھولے اور فراموش کرنے پر قادر نہ ہو سکی۔

باپ کی آواز اس کی سماعتوں میں ہمہ وقت یوں رہتی جیسے دل کی دھڑکن اپنی موجودگی کا احساس دلانے لگتی ہے۔

”ماریہ میری بیٹی، یہ تم نے کیا کیا؟ ایک غیر مسلم کو مسلمان بنانے بغیر اس سے شادی کر لی؟ تو گناہ ہے؟ تمہارے بچے کس مذہب پر عمل کریں گے ان کی کراہی کا دل بھی تم پر ہوگا؟“

بس چند جملے ہی تو تھے گردن کی سلاخیوں بن کر ہر لمحہ کچھ کے دیتے رہتے تھے اسے معلوم نہیں تھا کہ ریاست علی کا ڈالا وہ مذہب کا کج اس کے اندر تک سرایت کر کے ایک نغمہ ساز بنا دیا تھا۔

وہ اس کے وجود سے لاعلم رہی مگر ریاست علی نے احساس دلایا تو اسے اپنی شناخت کا اور اس شناخت کی اہمیت کا اندازہ ہوا، مگر مسئلہ یہ تھا کہ یہ سب کچھ اپنی جگہ، دوسری طرف کبیر کی محبت جو اس کے پورے وجود کو ڈھاپے ہوئے تھی، اور جس کی جڑیں اس کے اندر بھی پھیل چکی تھیں، اس محبت اور اس حقیقت سے فرار ممکن تھا نہ آخر ارف۔

ماریہ دو ٹوکوں میں جتنی جاری تھی، ایسی اذیت ناک زندگی کا تصور تو اس نے بھی نہیں کیا تھا، وہ جو، سوچتی تھی کہ محبت کا نہ مانا اذیت ہے، اسے اب معلوم ہو رہا تھا کہ محبت کا مل جانا بھی کبھی انسانی کے لیے عذاب بن جاتا ہے۔

کبیر اس کی ہنسی کش اور پریشانی کو دیکھ رہا تھا، محسوس کر رہا تھا مگر سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ رہا رہا پوچھنے پر نہیں کہہ کر نال جاتی تھی۔

بچی کی پیدائش پر ماریہ بہت خوش تھی، وقتی طور پر

”میں اپنی بیٹی کو مسلمان - بنانا چاہتی ہوں۔“

لیہ بالکل وہی الفاظ دہرائے جو ریاست علی نے اس کے کہنے تھے اس کے اپنے لیے۔

”اور تم، تم خود؟“ کبیر نے اسے غور سے دیکھا۔

”میں آج بھی اندر سے وہی دس سالہ ماریہ ہوں، میرا دل میرا اندرون نہیں بدلا کبیر! ماریہ نے اس کے سامنے اعتراف کیا۔

”میت میری بھی بیٹی ہے، اپنے مذہب کے واسطے سے میری بھی وہی خواہش ہے جو تمہاری ہے، اب کیا کریں؟“ سوال مشکل تھا، معاملہ الجھا ہوا تھا مگر اندھنہ آنے کے بڑھ کر ایک نال لیا۔

”مذہب کا خانہ خالی چھوڑ دو، بڑی ہو کر خود ہی پہل کر لے گی۔“ مغرب میں یہ چلن عام ہے۔

”ماریہ! اللہ کا مذہب کا خانہ خالی چھوڑ دیتے ہیں کہ بڑے ہو کر اپنی مرضی سے فیصلہ کریں گے۔“

”میت کے معاملے میں بھی یہی کیا گیا۔“

مگر انجینس برہمنی ہی جا رہی تھیں، زندگی آسان تھی نہ معاملات، میت کچھ بڑی ہوتی تھی۔ ماریہ اسے کلمہ سکھاتی اور یاد کرواتی تھی۔ اس کی دادی، اپنی پوتی کو پوجا کے کمرے میں اپنے ساتھ بٹھاتیں اور خود ماریہ کا ہاتھ اٹھا لیا بھی عجیب تھا۔

اسے اپنے ڈیڑے بہت محبت تھی، اتنی کہ اس کی خواہش اور اس کے کہے ہوئے لفظوں کو خراج مان لیا، خود کو وہ بلکہ تین ٹکڑوں میں تقسیم کر ڈالا تھا اس لیے اسے کچھ خود بخود ہو گیا تھا۔

کبیر کے ساتھ رہتے ہوئے اسے گناہ کا احساس بھی ہوتا، ندامت اور ملامت بھی مگر اسے پھوڑنا بھی ماریہ کے بس کی بات نہیں تھی، محبت نے اس پر پکڑا ہوا تھا۔

کبیر کو چھوڑنے کا تصور کرتی تو اس کی سانسیں لٹکتی، پھر گیت سے قلمی لگاؤ جو دونوں کے رشتے کا قدری تقاضا تھا۔ وہ کبیر سے بلکہ کسی کا سوچتی تو یہ اسی خیال آتا کہ بیٹی اپنے باپ کی قربت اور شفقت

سے محروم ہو جائے گی۔ کبیر کے ساتھ ساتھ گیت سے جدا بھی اس کے لیے وہاں روح تھی۔

کبیر کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی وہ اس کے ساتھ نہیں ہوتی تھی۔ اس کا والہانہ پن، خود پسندی، جاہت سب کچھ برف کا تو داغ جا رہا تھا۔ ٹھنڈا، بے حس اور بے جان، کبیر اس ساری صورت حال سے، اس کے رویے سے تنگ آنے لگا تھا، بے زار ہونے لگا تھا۔ باپ کے ساتھ مل کر اس نے بڑی اسٹارٹ کیا تھا۔ اسے اب زیادہ تر سفر میں رہنا پڑتا تھا۔ وہ سفر سے واپس آتا تو ماریہ کی پر جوش رفاقت کا تماشیا ہوتا مگر اب وہ کچھ ٹھنک گئے تھا۔

”تم ایک باز اچھی طرح سوچ کر فیصلہ کر لو ماریہ! یا تو مجھے پہلے کی طرح اپنی محبت سے غلام بنا لو، نہیں تو اس بے مقصد قید سے مجھے بھی آزاد کرو اور خود کو بھی۔“

ایک روز اس نے صاف صاف کہہ ہی دیا۔ اسے اپنی پوتی کی پوری محبت، مکمل توجہ اور سارا وجود چاہیے تھا۔ ٹکڑوں میں بٹا ہوا انسان جذبول کو اور زندگی کو بھی ادھورا کر دیتا ہے۔

”تمہیں ایک چیز کو چننا ہوگا مذہب یا میں، تم نے خود کو بھی اذیت میں ڈالا ہوا ہے اور مجھے بھی۔“

سات برسوں کی برداشت کے بعد کبیر کا ضبط بس جواب دے گیا۔

”کبیر! تم مسلمان ہو جاؤ۔“ ماریہ کے پاس بس یہی ایک طریقہ تھا خود کو، محبت کو زندگی کو اور اپنے گھر کو بچانے کا۔

”ماریہ! ایک گہری سانس لیتا ہوا وہ اس کے قریب بیٹھ گیا، اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیے۔

”دیکھو، سب باتا آسان نہیں ہوتا، مذہب کی تبدیلی کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہوتی۔ نہ وقتی جذبہ اور نہ ہی کسی کے کہنے سے یہ عمل ہوتا ہے۔ یہ دل کی تبدیلی ہوتی ہے، انسان کے اندر سے پھوٹی ہے، تم اپنی مثال لے لو میرے لیے، محبت کے لیے، شادی کے لیے تم

نے میرے مذہب میں پناہ لے لی مگر وہ قبیح حساب کچھ، مجھے معلوم ہے تم نے اس وقت جان بوجھ کے یہ سب نہیں کیا۔ شاید اس وقت تم غیر تھیں، اپنے آپ سے لاعلم، مگر وہ جو تمہارے اندر ہے وہ بالآخر خراب دن باہر آ گیا۔ میں بھی تمہارے پاس کے بھی کہنے سے یہ سب نہیں کر سکتا، میں جوں ہوں، اس پر مطمئن ہوں، تم مگر اپنے بارے میں فیصلہ کر لو ایک بار، ایک فیصلہ۔

”کبیر! میں تم سے اور گیت سے بہت محبت کرتی ہوں، میں انہماک کر رہی ہوں کہ تم کوئی اندر سے مجھے اس زندگی پر ملامت کرنا رہتا ہے میں کیا کروں، کہاں جاؤں؟“

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ کبیر ترسے سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ خود بھی تو قسم ہوتا جا رہا تھا۔ کبھی ماریہ یہ ترس آتا، کبھی خود پہ۔ محبت اور تعلقات میں گرم جوشی زندگی کی علامت ہے مگر نہ وہ مردہ ہو کر لافانی کے تابوت میں بند ہو جاتے ہیں اور روپوں کی باتوں کی، حالات اور واقعات کی زنگ آؤں نہیں ایک ایک کر کے ٹھک ٹھک اس تابوت کا ڈھکن ٹھوکتی راتی ہیں۔

کبیر اور ماریہ کی محبت، رشتے اور تعلقات کے تابوت میں آخری کل بھی ایک دن لگ گئی، اس دن، جب کبیر نے اپنے ایک ضروری کاغذ کی تلاش میں الماریاں، دروازے، پیکیٹس سب کچھ چھان مارا، کاغذ تو اسے نہ ملا مگر جو کچھ ملاد وہ اسے حیران اور پھر سن کر گیا۔

”یہ کیا ہے؟ کب سے استعمال کر رہی ہو تم؟“ ماریہ واپس آئی تو کبیر اس سے جواب طلبی کر رہا تھا، وہ مشتعل تھا اور بہت دھمکی بھی۔

”جہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ میں نیلی بڑھانے کا تنازعہ نہیں تھا، تم بھی تو یہی چاہتی تھیں کہ ہمارے کم از کم تین چار بچے تو ہوں، پھر تم کیسے کر سکتی ہو یہ سب؟“ اسے سمجھو کر وہ اب اپنا سر تھامے بیٹھا تھا۔

”میں آج تک یہی سمجھتا رہا کہ یہ قدرت کی

طرف سے ہے میں نے سمجھوتا کر لیا تھا، ایک بچی کو اپنی پوری دنیا مان لیا، مجھے معلوم نہیں تھا تم دھوکا دے رہی ہو مجھے، کیوں کرتی ہیں یہ سب؟“ وہ ایک پھر سوال کر رہا تھا اس سے۔

”میں نہیں چاہتی تھی کہ میرے جیسے اور اس دنیا میں آئیں، جو ایک واضح صحت میں نہ رہ سکتے ہوں۔“ ماریہ نے سر جھکا کر اعتراض کیا تو اس کی نظریں کبیر کے چہرے ہوئے اس خالی ڈبے پر تھیں جس میں موجود گوئیوں نے گیت کے بعد کی اور جان کو دنیا میں نہ لانے میں اس کی مدد کی تھی۔

”تم اپنے ساتھ ساتھ میری زندگی بھی تباہ کر رہی ہو۔“

”کبیر! تم مجھ پر ترس اور رحم کھاؤ بغیر جو فیصلہ کرنا چاہو کرو۔“ ماریہ جواب دینے کے لیے ایک عرصے سے خود کو مضبوط کر رہی تھی۔ آج اس نے کہ ڈالی۔

اسے شدت سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنے ساتھ ساتھ کبیر کے ساتھ بھی زیادتی کر رہی ہے۔ وہ کبیر سے محبت کر رہی ہے مگر اسے وہ محبت دے نہیں رہی، کبیر کی جو خوشیاں اور ارمان اس سے وابستہ ہیں انہیں پورا کرنے میں ناکام ہو رہی ہے پھر اسے کیا حق ہے ایک انسان کی زندگی یوں تباہ کرنے کا۔

”گیت اب بارہ سال کی ہو رہی ہے، اسے سمجھایا جا سکتا ہے۔“ وہ کبیر سے علیحدہ ہو گئی تھی، تمام تر دکھ اور تمام تر کرب کے باوجود اس نے یہ بل کر لیا اور کبیر کی لیا گیت اس کے ساتھ بھی رہتی اور کبیر کے ساتھ بھی، اسی آگے بڑھتی تھی وہ کاج بچے کی۔ تب ماریہ کے دل نے ایک دن اچانک دھڑکنے لگا دیا۔

☆☆☆

اگرچہ وہ اپنی دانت میں فقط ایک آدھ گھنٹے کی مہمان بن کر یہاں آئی تھی مگر اسے اندازہ نہیں تھا کہ جو کچھ ہم سوچتے اور سمجھتے ہیں وہ اکثر یوں نہیں ہوتا وہ ایک گھنٹہ تقریباً تین گھنٹوں پر محیط ہو گیا تھا۔ پہلے

کبیر اس کی تواضع کی گئی پھر اسے اصرار کر دیا کہ اسے روک لیا گیا۔

”مارے ہاں یہ بہت برا سمجھا جاتا ہے کہ مارے کے وقت کوئی مہمان آئے اور کھانا کھائے مارے جانے۔“ سیاہ آنکھوں والے اس لمبے سے لکھنے لکھنے، جس کا نام اسے بعد میں پتا چلا، سیف ریاست علی اسے جی بھر کے دیکھنا اور دل بھر کر اسے گھر لانا چاہتے تھے، مگر ان کی صحت اور وقت اس کی اجازت دینے میں متاثر تھے۔

”تم مجھے ماریہ کے بارے میں بتاؤ۔“

”کیا بتاؤں ان کے بارے میں، آپ نے گناہ کیا ہے جسے سولی پر انہیں ٹانگ دیا تھا، وہ اسی پر چھوڑ دیے گئے۔“ گیت نے کندھے اچکا کر دیکھا تو اسے اردو آدمی انگلیں میں جواب دیا، ”نونی“ اس نے اپنے ایک پاکستانی کلاس فیلو سے کہا تھا۔ اس کی شادی میں تو ان کا پورا گروپ آیا تھا۔

”کیا وہ مجھ سے ناراض تھی؟“ ریاست علی بے پروائی سے اسے بتا رہے تھے، سارے زخموں کو کھلوا رہے تھے، انہیں اذیت ہونے لگی۔

”وہ تو ناراض نہیں تھیں آپ سے، مگر۔“ گیت نے سر پیٹتے پیٹتے آگے جھک کر ریاست علی کا ہاتھ پکڑ لیا اور بے بس چہرہ دیکھا اور کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

”مجھے اس شخص پہ کیوں ترس آ رہا ہے؟“ وہ اٹھ کھڑی۔

”میں صرف اپنی ماں کی آخری خواہش پوری کرنے یہاں آئی ہوں، مگر نہ یہاں آنے کا مجھے کوئی حق نہیں تھا۔“

گیت نے جتایا، وہ بار بار خود کو یاد دل رہی تھی کہ اسے اس شخص پر ترس آنا چاہیے نہ کہ کھانا چاہیے اس نے اپنی ماں کو بہت تکلیف میں دیکھا تھا۔ کبیر تو دوسری شادی اور تین بچوں کے بعد پھر

بھی سنبھل گیا تھا، پہل گیا تھا مگر ماریہ جس ان دیکھی آگ میں جل کر خاک ہو گئی تھی، اس کی اذیت کا اندازہ گیت پوری طرح لگا بھی نہیں سکتی تھی۔ بس تھوڑا بہت محسوس ہی کر سکتی تھی۔

وہ اس پوری داستان سے واقف تھی۔ ماریہ کے ساتھ اس نے زیادہ وقت گزارا تھا۔ دوسری شادی اور پھر بچوں کے بعد کبیر کا وقت توبہ، محبت، شفقت سب کچھ ہو گیا تھا، مگر پھر بھی اس نے اپنی ہی پوری کوشش کی تھی گیت کو ساتھ رکھنے کی، اس کا خیال کرنے کی۔

گیت اپنے باپ سے تو دور نہیں ہوئی تھی مگر اس گھر اور کبیر کی جیسی سے ضرور دور ہو گئی تھی اور ماریہ کے زیادہ قریب تھی۔ اگرچہ ماریہ نے اس کے سامنے کبھی ریاست علی کی برائی نہیں کی تھی، بس یہ گیت کی اپنی سمجھ، تھقل اور شور تھا کہ وہ جتنا اپنی ماں کی زندگی اور موت کے بارے میں سوچتی اسے سب سے زیادہ اور سب سے بڑھ کر ریاست علی کے سوا کوئی قصور وار نظر نہ آتا تھا۔

پھر بھی جانے کیا بات تھی، خون کی کشش والی بات سچ ہے یا وہ اپنا دل ختم کرنے میں ناکام ہو رہی تھی، وہ ایک بوڑھے اور بیمار شخص سے، زیادہ سچ اور طعنے پر دیر اختیار نہ کر سکی۔ اس کے پوچھے گئے چھوٹے چھوٹے سوالوں کے جوابات دے رہی تھی جب سیف احمد اندر آیا۔

”کھانا لگ گیا ہے۔“

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ اس نے پھر راہ فرار اختیار کی۔

”تھوڑا سا کھاؤ۔“ ریاست علی کے لمبے میں اتنی لاجبنت تھی کہ وہ بس اٹھ ہی گئی۔ میز پر موجود سارے افراد کا تعارف بھی ہو گیا۔ صاف رنگت اور شہریتی آنکھوں والی خاتون اس کی امی تھیں اور بہت گوری رنگت چھیلے چھیلے نقوش اور دیسے ہی سرائے کی مالک سیف کی چچی تھیں۔ ان دونوں خواتین کے دودھ پنے بھی موجود تھے۔ پتا نہیں کیا کیا نام بتائے تھے،

گیت نے خوش اخلاقی سے مسکراتے ہوئے سب سے تعارف حاصل تو کیا بعد میں بھول گئی۔ بس ایک ہی نام یاد رہا۔ وہ جو گھر میں سب سے بڑا تھا۔ عمر میں بھی قد میں بھی اور جواریہ کو اپنے ساتھ اندر لایا تھا۔ کچھ دیر اس سے باتیں کرتا رہا تھا اور جب وہ واپس جانے کو کھڑی ہوئی تو وہ بھی کھڑی ہو گیا۔

”بات سنو۔“ باہر چھوٹے سے صحن میں سیف نے اسے دھکا۔

”تم جب تک یہاں ہو تو یہیں ٹھہراؤ، داجی کے پاس۔“

”مگر کیوں؟ میں ہوٹل میں اپنے گروپ کے ساتھ ہوں اور خوش ہوں۔“ گیت نے ابرو اچکائے۔

”داجی نے کہا تھا تمہیں کہ.....“

”ہاں مگر وہ ایک ریکی یا دعوت تھی یا پھر شاید وہ اپنا گھٹ کر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔“ گیت نے اس کی بات کاٹی۔

”وہ ریکی دعوت نہیں تھی، وہ دل سے چاہتے ہیں کہ تم ان کے پاس رک جاؤ۔“ سیف میں اس کی نسبت کل اور ٹھہراؤ زیادہ تھا۔

”مگر میں نہیں چاہتی۔“ نکاسا جواب دے کر وہ آگے بڑھی۔

”میں، تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔“ سیف نے شاید پاپس ہو کر اسے پیش کش کی۔

”میں، رائڈ منگوا چکی ہوں۔“

”رینشل کر دو۔“

”تمہارے کہنے سے؟“ اس نے مڑ کر سیدھا سیف کی آنکھوں میں جھانکا۔

”نہیں، اپنی مرضی سے۔“ وہ بہت پرسکون ہو کر جواب دے رہا تھا۔

”چلو۔“ چند لمبے سوچنے کے بعد اس نے کندھے اچکائے اور ان پر پڑا اپنا بیگ درست کیا اور آگے بڑھی۔

☆☆☆

یہ زندگی ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے

کہ کچھ نہیں معلوم کر اگلے بل کیا ہو، گیت کو بھی معلوم نہیں تھا کہ جس جگہ وہ اپنی دانست میں ٹھہر کر کھڑے ہوئے، وہاں سے چار گھنٹوں بعد واپس آئے کی اور واپس بھی اس طرح نہیں آئے کی۔ اس طرح آئی تھی، یعنی ایسی بلکہ واپسی پہ اس کے ہمارے حد پوچھتی ہوئی سیاہ آنکھوں اور دروازہ کا مالک ایک لڑکا ہوگا، جو رشتے میں اس کا قریبی کزن مگر بھی بھی انجان اور انہی ہوگا اور جب اجنبیت اور سزا مہری کی برف پچھلے کی تو اس کے اندر سے کیا برآمد ہو، کون جانے؟

قدرت کے کھیل نرالے ہیں وہ آہ ہی جانے ہر ہجید، انسان پہ تو جوں جوں کوئی ہجید، کوئی حقیقت آشکار ہوتی ہے وہ بس حیران ہی ہوتا رہتا ہے۔

ہوٹل کی پارکنگ میں گاڑی سے اتر کر وہ کھڑکی میں جھکی۔

”تم سے مل کر اور باتیں کر کے اچھا لگا سیف!“ وہ جہاں کی پروردہ تھی وہاں کے باسی عمو اپنے جذبات، احساسات، دھڑکنے والے صاف گوئی سے بیان کرنے کے عادی ہیں، وہ بھی ایسی ہی تھی۔

”شکر یہ، کیا میں کل لینے آؤں تمہیں؟“

”مجھے رنگ رہا ہے کہ میں ہاں کہوں یا نا، ہم کل مجھے یہیں ملو گے؟“ گیت کی تیز چمک دار آنکھیں سیف کے اندر تک اتر چکی تھیں۔

”اتنی جلدی، اسے فریب اور گہرائی سے جان لیا تم نے مجھے۔“

”میرا خیال ہے کہ یہاں کے لوگوں کی خاصیت یہ ہے، زبردستی کرنا، مانی کرنا، اپنی مرضی چلانے کی کوشش کرنا۔“ سیف سے وہ شہ آشکریزی میں بات کر رہی تھی۔

”اتنے ہی ساری خصوصیات جان لیں؟“

سیف مسکرایا۔

”اتنے سے پہلے بھی جانتی تھی، سلا میں آدمی مشرق سے ہوں آدمی مغرب سے، ہائی داوے اگر تم باتیں کرنے کے موڈ میں ہو تو میرے کمرے میں

”اے ہو۔“ گیت کھڑکی چھوڑ کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔

”میں کل آؤں گا۔“ سیف نے گاڑی آگے بڑھائی، چہرے کی مسکراہٹ اب سنجیدگی میں ڈھل گئی۔

”اکی صبح، بہت صبح تو نہیں مگر دس بجے سے پہلے وہ ہوٹل کی کشادہ لابی میں گیت کے سامنے بیٹھا تھا۔

”تم اتنا اصرار کیوں کر رہے ہو، میرے دو چار دن رہنے سے تمہارے داجی کو کیا فرق پڑے گا؟ کچھ دن پوری مہمان داری کر کے ان کی عداوت یا شرمندگی دھل جائے گی، ختم ہو جائے گی؟ میں تو یہی اپنے گروپ کے ساتھ آئی ہوں، ہم اپنے دوست کی شادی انجوائے کریں گے، تمہارے شہر کی سیر کریں گے پھر لاہور اسلام آباد، پنڈی مری اور شمالی علاقہ ہات، ہمارا پورا منصوبہ تیار ہے ہر دن لیکچر لپیڈ ہے، سارا منصوبہ تیار ہو چکا ہے ان سب میں، میرے لیے کہیں اور جانے اور کھانے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔“

گیت نے ذرا فیصلہ اور کچھ تیزی سے ہی اسے سمجھا دیا تھا مگر اس نزع کے پیچھے ایک غیر محسوس ہی تھی۔

”اس شہر کی سیر میں کرادوں گا تم سب کو، یہاں کی حیرت انگیز باتیں اور دلچسپ مقامات، انوکھے لوگ، یقین کر دو تم سب بہت انجوائے کرو گی اور شادی کا بھی کوئی مسئلہ نہیں۔“ جتنے دن تقریبات ہیں، میں اسے داری سے تمہیں پک اینڈ ڈراب کر دوں گا۔“

سیف کی آنکھوں میں التجا کے رنگ واضح تھے۔

”میری طرف سے معذرت کر لیتا۔“ گیت اپنی حق کھڑکی پر تکی کر لیتا۔

”وہ مرنے والے ہیں گیت! خدا کے واسطے، ایک مرتبے ہوئے شخص کو مزید تکلیف مت دو، تم سامنے ہو گی تو شاید ان.....“ سیف آگے جملہ مکمل نہ کر سکا۔

گیت کچھ کہے بغیر اپنی تیز نظروں سے اسے گھورتی رہی۔

”ان کے گردے جواب دے چکے ہیں، وہ

ڈائیکسیز پر ہیں۔ زیادہ وقت نہیں ہے ان کے پاس۔“ سیف نے دھیمی آواز میں بتایا تو اس کی نگاہیں، گیت کی سرخی آنکھوں سے ابھرتی تھیں۔

”تم چاہتے ہو، میں ترس کھاؤں ان پر؟“

”میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ تم اپنی مرضی کی مالک ہو، اتنا نرم دل تو ہر انسان ہوتا ہے کہ ایک مرتبے ہوئے انسان پر رحم کھالے۔“

”میں تو خرابی ہے ہم سب میں، مرتبے ہوئے انسانوں پہ رحم کھالیتے ہیں، جیتے ہوئے، زندگی گزارتے ہوئے لوگوں پہ ترس نہیں آتا ہمیں۔“

گیت نے اپنے مخصوص انداز میں ابرو چڑھائے۔

سیف سمجھ نہ بولا مگر اس کی سوالیہ نگاہیں گیت پر تھیں جس کے صاف شفاف چہرے پر ابھرنے لگی جو کی نیچے یا کسی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے چہرے پہ آ جاتی ہے۔

”میں شام تک آ جاؤں گی۔“ بالآخر فیصلہ ہو گیا اور قدرت اپنے فیصلے انسانوں سے کروا دیتی ہے۔ ویسے یہ بھی ایک غور طلب بلکہ بحث طلب معاملہ ہے کہ قدرت اپنے فیصلے انسانوں سے کرواتی ہے یا وہ خود یہ فیصلے کرتے ہیں؟ آزادی و خود مختاری کتنی ہے؟ کیسی ہے؟ کہاں تک ہے۔

سیف ان معاملات کو سوچتا تھا، غور کرتا تھا، گیت نے اب سوچنا شروع کیا تھا۔

شام کی سرخی ردا سیاہ ہونے سے پہلے گیت گھر آ گئی تھی۔ بلیک ٹائٹس اور پرنٹڈ کرنی میں بلبوس، ایک مختصر سا سفری بیگ، وہ ریاست علی کے کمرے میں موجود تھی، سیف انہیں ایک گھنٹہ پہلے ہی ڈائیکسیز کر کر کر اسپتال سے گھر لایا تھا۔

”شکر یہ۔“ سیف کی مسکراہٹ دھیمی مگر شکر یہ بہت واضح تھا۔

”اپنا شکر یہ اپنے پاس رکھو تمہارے لیے نہیں آئی۔“ گیت آ گئی تھی، مگر برہمنی، شاید اسی لیے برہمنی، جتنی بے رحمی، بے گاہی بلکہ نفرت وہ سوچ کر اس ملک اور اس شہر میں آئی تھی، وہ سب کچھ دھواں

بن کر قتل ہوتا جا رہا تھا۔ ہرگز رتے لئے زندگی کسی نہ کسی تجربے سے نوازتی ہے، گیت کو بھی تجربہ ہو رہا تھا کہ کسی سے نفرت کا ارادہ کرنا یا اظہار کرنا آسان ہوتا ہے اور جی جی نفرت کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔

”تمہیں غصہ آ رہا ہے کہ اسنے دوستوں کو چھوڑ کر یہاں کیا کر رہی ہو؟“ سیف بالکل بنجیدہ تھا، مذاق تو نہیں کیا تھا اس نے، مگر وہ تیز ترخ ترخ لگی۔

”میرے چہرے پہ لکھا ہے جو تم نے پڑھا لیا؟“

”مجھے چہرے پہ نہ نہیں آتے، میں مجھے محسوس ہوا کہ تم شاید اسی وجہ سے پرہم ہو کہ یہاں آنا نہیں چاہتی تھی پھر بھی کیوں آ گئیں؟“ سیف کا چہرہ بھی سادہ تھا اور جواب بھی۔

”کیا میرے لیے الگ کرے کا بندوبست ہے یا سبیل رہنا پڑے گا؟“

”دونوں کہتے ہیں جیسے تم پسند کرو۔“

”یہ تو سورہ ہے؟“ گیت نے اچھی پسند یا مرضی بتانے کے بجائے ریاست علی کے خوابیدہ چہرے کو ایک نظر دیکھا۔

”کچھ دیر میں جاگ جائیں گے، آؤ، میں تمہارا کمرہ دکھا دیتا ہوں۔“

گیت کو ساتھ لے وہ صحن میں آیا اور بیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ”تمہاری گئی نے اس صحن کا جو نقشہ تمہارے سامنے کھینچا تھا وہ بھی حقیقت تھا، پھر جب مکینوں کی تعداد بڑھ گئی تو مزید کمروں کی ضرورت ہوئی، لہذا اس بڑے سارے صحن کی کیاریاں، پھولوں کے چھاؤں اور پھولوں کے درخت کاٹ کر یہاں تعمیرات کی گئیں۔“ بیڑھیاں چڑھ کر اوپر جاتے ہوئے وہ گیت کو بتا رہا تھا۔ اوپر کا پورا پورا بننا ہوا تھا، کمرے، لاؤنج، کچن، صاف ستھرا، نیا ٹیگر، وہ ایک کمرے کے آگے رکھا۔ ”یہ تمہارا کمرہ ہے۔“ وہ دروازہ کھولنے لگا۔

ابھی رہنے دو۔“ گیت نے اسے روکا، اور بیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی جو چھت پہ جا رہی تھیں،

اس بار بیڑھیاں چڑھتے ہوئے گیت آگے تھی، سیف اس کے پیچھے اوپر کھینچت تھی، بہت بڑی ایک طرف ایک کمرہ تھا یا شاید اسٹور روم، اس کے ساتھ مختصر شاید تھا جس کے نیچے ایک تخت پڑا تھا، ان سب کے اوپر کھلا آسان تھا، تاروں بھرا آسان چھج کے ستارے، پکٹے ہوئے۔ ”یہ آسان اور ستارے یہاں بھی ہیں؟“ گیت نے ایک نظر آسان کی طرف کی۔

”تمہارے ساتھ چلے ہوئے آگے ہوئے گئے۔“ سیف تخت پر بیٹھ گیا اور اس سے کچھ دور، کچھ قریب گیت بھی بیٹھ گئی۔

”میں نے بھی سوچا نہیں تھا کہ..... وہ چند لمحوں کے لیے چپ ہوئی۔

”کہہ سکتی ایک رات، کسی نئے شہر میں ایک انجان گھر کی چھت پر تاروں بھرے فلک کے نیچے بیٹھی ہوگی۔“ سیف نے اس کا جملہ مل کر دیا۔

”تم نے اس نئے شہر اور انجان گھر کے ساتھ ایک انجینیئر شخص کا ذکر کیوں نہیں کیا جو میرے ساتھ موجود ہے؟“

”میں انجینیئر نہیں ہوں تمہارے لیے۔“ سیف نے بہت نرمی سے جی کی گئی۔

”اگر مجھے علم ہوتا کہ فیس بک پہ میرا پرانا دوست، مجھے یہاں ملے گا، ایک نئے رشتے، ایک نئے روپ میں، تو میں اسے ملنے کو شرمندہ ہونے سے پہلے ہی ختم کر دیتی۔“

گیت نے وہ پریش، ساناؤں پر چڑھ کر دیکھا، پچھلے ایک سال سے جس کے ساتھ وہ رابطے میں تھی، اور اگرچہ یہ تعارف ابھی روگ نہیں بنا تھا اور نہ ہی یہ تعلق ابھی بوجھ بنا تھا پھر بھی وہ خائف تھی۔

”تم جانتے تھے سب کچھ پھر بھی؟“

”ہاں میں سب کچھ جانتا تھا پھر بھی میں نے تم سے رابطہ کیا، اسی لیے کہا کہ تمہیں معلوم کرنا چاہیے اور کون کون سے رشتے ہیں جو تم سے جڑے ہوئے ہیں۔“

”داجی اپنی بیٹی کے حوالے سے جتنے پشیمان تھے

اٹھاس یاد کرتے تھے، میں جانتا ہوں، ان کی بات تمہاری آدمیں ہی ان کی ہوئی ہے۔“

”کیا ہو گا پشیمان ہونے سے؟ سارہ نام کی دل سے رخصت ہوئی اور ماریہ بھی، کیا فرق پڑا؟“

”میں کو، سوائے اس کے کہ اس دنیا میں ایک دل اور چند کرداروں کا اضافہ ہو گیا۔“ گیت نے کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی

”میں جتنا غور کرتی ہوں اتنا ہی الجھتی جاتی ہوں، سارہ اور ریاست علی کے ملنے سے جو کچھ بھی رہا، اور رشتے، تعلق یا کہانی؟ وہ کیا تھی؟ کیوں تھی؟“

”اس بے سمت زندگی کا ذمہ دار کون ہے؟ میں اس کے جواب حاصل کرنے بھی شاید یہاں آئی ہوں، میرے والدین نے مذہب کا خالی ڈھنگ کر فیصلے کی ذمہ داری مجھ پہ ڈال دی اور مجھے ہو کر یہ فیصلہ کرنا آسان ہے؟“

گیت کے لیے اس وقت وہ ریاست علی کا پوتا ایک آدمی نہیں بلکہ اس کا وہ فیس بک فرینڈ تھا جس نے وہ اپنی بہت سی فیلنگز اور بہت سے معاملات شیئر کیا کرتی تھی۔

”یہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا معاملہ، سب اس کے سامنے تھا۔“

”انتہی مشکل اور اتنی بھاری ذمہ داری، کیسے اٹھائیں؟“ وہ مستقبل بول رہی تھی۔ ”ڈیڈ ویسے تو دل بننے ہیں مگر چاہتے ہیں کہ میں ان کی بیوی رہوں، یہی تو خواہش تھی کہ میں ان کے عقیدے کو اپنوں، مجھے دونوں سے محبت ہے، ڈیڈ سے بھی می کی لیکن میں نے سوچا کہ اس معاملے میں مجھے اپنی عقل اور شعور استعمال کر کے پھر کوئی فیصلہ کرنا۔“

”پھر؟“ سیف محویت سے اسے سن رہا تھا۔

”میری عقل اور میرا شعور کہتا ہے کہ خدا جو بھی چاہتا ہے، اکیلا ہے، ایک ہے یہاں تک تو کچھ میں آتی ہے، اس کے بعد پھر میں.....“

گیت نے پھر بات ادھوری چھوڑ دی۔

”اتنا جھٹکا بھی ابھی کافی ہے تمہارے لیے، مزید سوچو گی تو خود ہی راستے کھلتے چلے جائیں گے۔“

سیف نے اسے تسلی دی۔

”تمہارے مشورے کا شکریہ مگر تم اس لمحے میں بات نہ کیا کرو مجھ سے اور ان نظروں سے نہ دیکھا کرو۔“ وہ بڑبڑا رہی۔

”کیوں، تم ڈرتی ہو کیا؟“ سیف اس کے اعتراض پہ مظلوم ہو کر بیٹھا تھا۔

”ہاں، میں ڈرتی ہوں، کہانیوں کے دہرائے جانے سے ڈر لگتا ہے مجھے۔“ گیت نے اس کی طرف دیکھے بغیر، سامنے دیکھتے ہوئے اعتراف کیا۔

”یہ کہانیاں تھوڑی ہوتی ہیں جو دہرائی جاتی ہیں یہ تو محبت ہوتی ہے جو ہر بار دہرائی جاتی ہے گیت پیاری!“ سیف اٹھ کھڑا ہوا۔

”نیچے اتر کر جاتے ہوئے گیت نے اس کمرے کا دروازہ کھولا جو سیف نے اس کے لیے بنایا تھا۔ کچھ دیر وہاں کھڑی وہ سوچتی رہی پھر نیچے آ گئی۔

ریاست علی ابھی بے خبر تھے کہ ان کے پاس کون بیٹھا ہے، کس نے انہیں دیکھتے دیکھتے ان کا ہاتھ پکڑ کر پہلے اپنے رخساروں پر ہونٹوں سے لگایا ہے، خون کی اپنی ایک کشش ہوتی ہے اور کس کی اپنی ایک مہک، گیت کو ریاست علی کے ہاتھ سے ماریہ کے کس کی خوشبو آ رہی تھی۔

”میری می نے آپ سے بہت محبت کی ہے، آپ کی بہت باتیں کی ہیں مجھ سے، دس سال کی یادیں اور باتیں کم نہیں ہوتیں، میری ان سے محبت اور ان کی آپ سے عقیدت، مجھے مجبور کر رہی ہے کہ میں اس ہاتھ کو اور اس کمرے کو محترم چھوٹا ہوں۔“

گیت کی آنکھیں نم ہونے لگی تھیں، انسان اتنا کمزور کیوں ہوتا ہے اور اتنا مجبور بھی کیوں؟

ریاست علی کا ہاتھ تھا اس کے تصور میں سیف کا چہرہ ابھرا ہوا تھا۔

☆☆☆

ماڈل موڈ سے باہر آتے ہی اس کی کنٹری شروع ہوگئی۔

”یہ قائد اعظم انٹرنیشنل ایئر پورٹ ہے اس سے تھوڑا آگے پرانا ایئر پورٹ ہے اسٹارگیت پہ، وہ حاجیوں کے کام آتا ہے۔ حج پروازیں وہیں سے جاتی ہیں وہیں پہ آتی ہیں۔ یہ ہم پاکستانیوں کی ایک خاص عادت کہہ لو یا ادا، نئی چیز آ جاتی ہے پھر بھی پرانی شے بچھتے ہیں نہ ضائع کرتے ہیں، سینے سے لگا کر رکھتے ہیں جانے کس کام آ جائے۔“

طارق روڈ اور بہادر آباد کے بازار دکھاتا ہوا پھر سیدھے اس نے مزار قائد پہ جا کر ہی دم لیا۔ سفید پر سکون مقبرہ دھوپ میں ٹکینے کی طرح چمک رہا تھا۔ گت سمیت وہ چار لڑکیاں تھیں اور دو لڑکے، ان کی ستائش نظریں سنگ مرمر کی مندر دہناوٹ پہ چمک رہی تھیں۔ کچھ بڑے وہاں شہر کے میوزیم اور دیگر جگہیں دیکھ کر سیلفیاں لیں، پھر وہاں سے آگے بڑھے۔

اب یہ ایم اے جناح روڈ ہے، بھی بندر روڈ کہلاتا تھا۔ نمائش پنچ کر سیف نے اعلان کیا۔

”بندر روڈ؟ کتنا عجیب نام تھا۔“ ایما بی۔

”عجیب نام تو ابھی میں نے بتائے ہی نہیں، یہاں چمکر کا لوٹی ہے، گیدڑ کا لوٹی ہے، خاموش کا لوٹی ہے، یہاں کر لیا اسٹاپ بھی ہے، مستانہ چوک بھی ہے اور مکا چوک بھی۔“

سیف ایک ایک کر کے نام گنوار ہا تھا اور نام گنوارے گنوارے پر یو پاکستان کی نگہ والی عمارت آگئی۔ جس کے برابر میں اردو بازار روڈ پارک کے سامنے شوخ اور بچہ رنگ میں ایک عمارت چمک رہی تھی، آس پاس کی پرانی، پچھلی پچھلی عمارتوں کے درمیان وہ الگ ہی لگ رہی تھی۔

”یہ لوٹی خاص جگہ ہے؟“ فردوز اور پٹیریشیانے خاص طور پر اسے غور سے دیکھا۔

”یہ؟ یہ تو اورنگ زیب مارکیٹ ہے، پچانوئیں کس نے نہر بنائی کی ہے جو یہ رنگ و روغن ہو گیا، اس کی دوسری منزل پہ ان ڈائجسٹوں کا آفس ہے جو

میری امی اور چچی پڑھتی ہیں، خواتین، شہر اور کرن، ایک بار آتا تھا میں یہاں، چچی جان کا ہوا افسانہ دینے۔“ سیف شروع ہو گیا۔

”تمہاری چچی رائٹر ہیں؟“

”بن جاتیں، اگر وہ افسانہ شائع ہو جاتا تو ”اچھا یہ دیکھو یہ اس روڈ پہ اندر ڈاکٹر اور رضوی کا (Siut) گردوں کا اسپتال اور برابر میں سول اسپتال اور یہ سامنے جامع کلاٹھ مارکیٹ شاپنگ کرنی ہے تو لوگوں کو؟“

”ہاں، انجی نہیں۔“ آدھوں کے سر ہاں میں ہلے تھے اور آدھوں کی زبان نہ میں۔

”چھوڑو، میرے پاس بھی وقت نہیں ہے۔“ سیف سیدھا آگے بڑھ گیا۔

”یہاں پرانی عمارتیں نہیں ہیں، تاج محل کی کی؟“ فریک نے بہت دیر میں سوال کیا تھا۔ وہ اپنی چھٹی چھٹیوں میں انڈیا کی میر کے گئے تھا۔ اب حاضریں کو اپنے مشاہدات اور تجربات سے آگاہ کر دیا تھا۔

”ارے وہاں جو کچھ بنا ہوا ہے تاج محل، شاہی قلعہ، بادشاہی مسجد اور اسی طرح کی دوسری تعمیرات سب ہم نے ہی تو کی ہیں؟“ سیف کا ہنسنے کا لہجہ تھا۔

”تم نے؟“ یعنی پاکستان نے بنائی ہیں وہ سب؟“ ایما کچھ چکر اٹھی۔

”میرا مطلب ہے مغلوں نے بنائی تھیں نا، مسلمان حکمرانوں نے، وہی سب چھ لاکھ پچاسی ہے جو تم نے دہلی میں دیکھا ہوگا، شاہی قلعہ، بادشاہی مسجد وغیرہ وغیرہ۔“

”یہاں کی قدیم تعمیرات کیا ہیں؟ وہ دکھاؤ۔“

”روڈ آگے کر بولا۔

”ہمارے سندھ میں پانچ ہزار سال پرانی تہذیب کے آثار ہیں۔“ سیف کو اس کی آگاہی بری لگی۔

”کراچی میں ہیں وہ آثار؟“ وہ تو جیج کا اہل

”ہاں کراچی سے تھوڑا آگے ہیں، لاڈکانہ کے مومن جو دوڑو کے کھنڈرات۔“ سیف نے دلی سے جواب دیا۔

”تو لوگ کہتے وہاں کا پروگرام بنالیتے ہیں، لاڈکانہ کا تم سب کو۔“

”انجی جہاں ہو، وہاں کی بات کرو۔“ گیت نے اعلیٰ کی۔

”اچھا، یو، یہ ڈیفو ہال ہے۔“ زرد پتھروں کی مخصوص طرز تعمیر اور بناوٹ کیلئے اس عمارت کو سب نے دلچسپی سے دیکھا۔

”یہ انگریزوں نے بنائی تھی، لائبریری تھی ان کی۔“

”میرا یہ ہال، نوکیلے مینار اور غریبی چھت والی عمارت، انگریزی حکومت کا کلاسیک مرکز تھی۔“

”خانیق دینا، جہاں مولانا محمد علی جوہر پہ مقدمہ چلایا گیا تھا۔“

”سندھ مدرسہ العلوم کی محرابوں والی آن بان شان رکھتی عمارت، قائد اعظم سمیت متعدد رہنماؤں اور مشہور شخصیات کو ابتدائی درس گاہ۔

”بودھ پوری پتھروں سے بنی ایمپیرلس کھٹ، میری ویدر کلاک ٹاور، چرچ، موبائیل ٹیلیسٹام کا خوب صورت محل، جواب میوزیم ہے۔

”اساف فلگ ہاؤس جہاں قائد اعظم رہے تھے۔ پھر سیف کی گاڑی کا رخ آئی آئی چندر بیکروڈ کی طرف ہوا۔

”یہ سڑک یہاں کی وال اسٹریٹ سمجھ لو۔“ سیف نے انہیں بتایا، ملک کے مشہور اور بڑے اخبار کلاک ٹاور، اتالیقی ادارہ ٹکھانے کے بعد اس نے وہ منفرد مگول عمارت دکھائی، جس وقت یہ تعمیر ہوئی ایلیاء کی سب بلند عمارت تھی 1963ء میں عجیب بینک ”راہ۔“

پھر وہ انہیں لے کر کھارادر پہنچ گیا، وزیر مینشن لاک، قائد اعظم کی جائے پیدائش یہاں کی

عمارتوں، سڑکوں، بگیوں اور راستوں میں قدامت کی بو باس رچی ہوئی تھی۔ ”کھارادر، چٹھار اور ان کے آس پاس کے علاقے کراچی کے قدیم علاقے ہیں، سیف نے پورا دن لگا کر سب کچھ دکھادیا۔

اگلے دو دن میں سیف نے قابل ذکر مقامات دکھائی دیے، مغربیک بڑائی غیر مطمئن بندہ تھا، درم اور بھارت کی سیر کرنے کے بعد وہ ہزار، پانچ سو سال سے کم کی تعمیر یا کھنڈر کو قدیم بناتا ہی نہ تھا۔

”میرے پیارے بھائی، یہ جو میرا پیارا شہر کراچی آپ نے دیکھا جہاں اب انسانوں، گاڑیوں اور مشینوں کی کثرت ہے، اب سے ڈھائی تین سو سال پہلے پھیردوں کی چھوٹی سی تھی، ہمارے مثل حکمران لاہور سے آگے بڑھے تو ٹھنڈے کے رک گئے، شاہجہانی مسجد تعمیر کر کے واپس لوٹ گئے، یہاں تک نہ کوئی آ یا نہ کسی نے کچھ بنایا، تو خدا بھلا کرے اگر یزوں نے 1839ء میں سندھ پہ قبضہ پانچ کرنے کے بعد ڈیڑھ دو درجن تعمیرات کر دی تھیں ورنہ تو 1947ء کے بعد کی تعمیرات ہی پر گزراہ کرنا پڑتا، دیے ہمارے ہاں ہزاروں برس پرانی ایک شے ہے جسے تقیقا پسند کرو گے۔“ بہت پیارے فریک کو سمجھاتے ہوئے سیف نے آخر میں دعوئی کیا۔

”کیا ہے؟“ سب ہی چونکے۔

”سمندر، ہمارے پاس صدیوں پرانا بحیرہ عرب ہے، بکل دکھاتا ہوں۔“

”میں جانتی ہوں کائنات کا سمندر۔“ ایما نے اپنی معلومات کا مظاہرہ کیا۔

”وہاں سمندر کہاں ہے، اب تو سیوریج کا پانی ہے۔“ سیف نے ناسف سے سوچا۔

”ہم تمہیں ہاؤس ہے، سینڈز پٹ یا گڈانی دکھائیں گے۔“ سیف نے اعلان کیا۔

☆☆☆

”سیف! ایک بات بتا چک۔“ ہنڈیا بھوتی ہوئی امی نے اپنے کو نقشیش لگا ہوں سے کھوڑا۔

”ہوں۔“ اس کی توجہ امی اور ان کی نقشیش سے

زیادہ گاجر اور کھیرے کے کللوں پہنچی جنہیں وہ اٹھا اٹھا کر منہ میں رکھ رہا تھا۔

”اس لڑکی کو تو نے روکا ہے یہاں یا بڑے میاں نے؟“

”نہ میں نے روکا ہے نہ داجی نے، قسمت نے آئی ہے یہاں۔“

”قسمت یہ ڈال دوسب کچھ، یہ آسان طریقہ ہے۔“ انہوں نے ہنڈیا میں تھوڑا سا پانی ڈالا۔

”پھر کس پر الزام رکھیں پیاری امی جان! ہم پہ تو بلا وجہ کی تہمت ہے بخاری کی، ڈوریاں تو کسی اور کے ہاتھ میں ہیں، وہ اپنی مرضی سے ہلاتا رہتا ہے۔“

”سیف! یہ کتنا بے رحمی میرے سامنے نہ استعمال کیا کر، مجھے انجمن ہوئی ہے ان مشکل مشکل باتوں سے، میری بات کا سیدھا سیدھا جواب دینا ہے تو دے۔“ امی کی توجہ ہنڈیا پر بھی تھی اور بیٹے پر بھی۔

”روکا تو داجی نے ہے مگر میری بھی خواہش تھی۔“ سیف نے امی کے سامنے سچ اٹھل دیا۔

”پوئے کس کے ہو، ان ہی کے نقش قدم پہ چلو گے۔“ انہوں نے چولہے کی آگ دھبی کی۔

”کون جانے کس کے نقش قدم ہوتے ہیں جن پہ چلتے ہیں، انسانوں کی مباحثت کے؟ دنیا کا سب سے قدیم راز، جو دلوں پہ کب اور کیسے الہام ہو جاتا ہے؟ سمجھ سے باہر ہے۔“ سیف نے گاجر کا کلوا اٹھا کر منہ میں رکھا۔

”اتنا قلفہ لڑکی کے سامنے بولو گے تو بھاگ لگی اٹھ کر۔“

”وہ مجھ سے زیادہ گاڑھا اور مشکل فلسفہ بولتی ہے امی جان!“ سیف نے انکشاف کیا تو وہ مسکراتے لگیں۔

”شکر ہے اونٹ، پہاڑ کے نیچے آیا، سیر کو سوا یہ تو ملتا۔“

”اس سے پہلے کہ میری مزید کھپائی ہو مجھے نکل لینا چاہیے۔“ سیف بڑی شرافت اور تیزی سے باہر

نکل گیا۔

☆☆☆

ہوا میں خنکی تھی، سرد ہونے دھیرے سے اس کے بال بکھیرے، گیت کے چونک کر بھر پھری لی۔

”موسم تبدیل ہو گیا ہے، تم نے کوئی گرم کپڑا نہیں پہنا۔“ سیف کو آج خود بھی سردی محسوس ہو رہی تھی۔

”دو چار دن پہلے تک تو گرمی ہو رہی تھی، اب یکا یک ٹھنڈی ہوا میں چل پڑیں۔“ گیت نے اپنے بال سیٹ کر ایک طرف کیے اسے بے اختیار اپنا پتلا دن یاد آیا جب وہ اس گھر میں آئی تھی۔

”گراچی کا موسم اچھے ہی بدل رہا ہے، صبح کچھ دوپہر میں کچھ اور شام میں کچھ اور۔“ سیف نے مسکراتے دیکھا۔

”لوگ بھی ایسے ہی ہوں گے یہاں کے؟“ گیت نے اس پہ چوٹ کی۔

”کم از کم میں تو نہیں ہوں۔“ سیف نے اپنے کراچی جیکٹ اتاری اور اس کے شانوں پہ ڈال دی۔

”اسے ٹھیک سے پہن لو، تمہیں ٹھنڈ نہ لگے جائے۔“

”میں بہت جلدیے مقام سے آئی ہوں، یہ سردی سردی میرا زیادہ کچھ نہیں لگا سکتی۔“ گیت نے بولتے بولتے ہی ایک زوردار چھٹک ماری تھی۔

”سستی نہیں ہونا کسی کی، اپنی سہیلی مانی کرتی ہو۔“ اپنی مانی تو میں ہاگل بھی نہیں کرنا چاہتی۔“ گیت نے رخ موڑ کر اسے دیکھا۔

”کیسے لگ رہے ہو تم کلین شیو ہو کر۔“ بالکل چھلے ہوئے سر تھے۔

”اچھا اور پہلے کون سا مرنے لگا تھا؟“ سیف نے اپنی شان میں کی تھی یہ گستاخی کچھ زیادہ پسند نہیں آئی تھی۔

”کچھ محفل قسم کے مرنے لگتے تھے،

”گیت!“ سیف نے کچھ کہنا چاہا مگر گیت نے اسے روک دیا۔

”سیف پلیز، میں نہیں جانتی کہ اب ایک اور نئی کہانی جنم لے۔“ گیت کے خوب صورت چہرے پہ اضطراب تھا۔

”مگر دنیا میں کوئی بھی کہانی نئی کب ہوتی ہے؟“ سیف رخ موڑ کر پوری طرح گیت کے سامنے تھا۔

اس کے چہرے پہ، لہجے میں نری تھی اور آنکھوں میں ایسی چمک تھی آج کی سیاہ رات میں آسمان پہ چمکتے ستارے، گیت مسکرا کر اسے دیکھ اور سن رہی تھی۔

”چند ہی کہانیاں ہیں دنیا میں، جو بار بار دہرائی جاتی ہیں، بار بار سننے ڈھنگ سننے انداز سے لکھی جاتی ہیں۔ دنیا میں اب تک کتنی بھی کہانیاں لکھی گئی ہیں ان میں خدا ہے، شیطان ہے، انسان ہے، محبت ہے، نفرت ہے، وصل ہے، جدائی ہے اور ہم ہیں۔“

”ہم؟“ محبت سے سنی گیت چونک پڑی۔

”میں اور تم، اس کے بغیر کوئی کہانی مکمل نہیں ہوتی۔“

”تم پھر مجھے نظروں میں الجھا رہے ہو۔“ گیت نے سر جھٹک کر جیسے خود کو کسی بحر سے آزاد کیا تھا سر بھی

”محبت ایک چار حرفی لفظ ہی تو ہے، مگر کبھی پوری زندگی بن جاتا ہے۔“

”تم بار بار میرے سامنے محبت کا نام مت لیا کرو۔“ گیت بڑی مشکل سے چہرے پہ بے زاری لے کر آئی۔

”کیوں؟“

”مجھے چڑ ہے اس لفظ سے بھی اور اس.....“

”ہم دنیا میں دوسرے انسانوں، چیزوں اور جذبوں سے بھاگ سکتے ہیں مگر اپنے آپ سے نہیں، خود کو مت بھلاؤ، تم یہاں نہیں آئی تھیں، تب سے ہی میری ساتھ تھیں اپنے خوابوں میں۔“ سیف نے دعویٰ یوں نہیں کیا تھا۔

”دعویٰ یوں نہیں کیا تھا۔“

”دعویٰ یوں نہیں کیا تھا۔“

”دعویٰ یوں نہیں کیا تھا۔“

”دعویٰ یوں نہیں کیا تھا۔“

”جی کبھی ایک پوری کہانی بن جاتی ہے۔“
 ”وہ تم نہیں تھے، ریاست علی کے پوتے، وہ میرا دوست تھا، سب سے اچھا دوست، اگر مجھے ہوتا کہ میں یہاں آ کر ایک سچے اور مخلص دوست کو کھودوں کی تو بھی یہاں نہیں آئی۔“
 دل کے بے بسی اور آنکھوں کی نمی، گیت کی آواز میں گھل گئی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ بے شک وہ خود سے فرار حاصل نہیں کر سکتی تھی مگر سیف سے تو دور جا سکتی تھی۔
 ”ایک بار قریب آنے کے بعد کوئی دور نہیں جاتا، جانی نہیں سکتا۔“ سیف نے اسے اپنے آگے سے گزر کر بیڑیوں کے پاس جاتے ہوئے دیکھا تو بلند آواز میں بولا۔
 ”مگر میں چلی جاؤں گی۔“ گیت نے خود کو سنبھال کر بہت مضبوط لہجے میں کہا تھا۔
 ☆☆☆
 حاذ بیت سمیٹے سانولی رنگت، اب قدرے سیاہی میں بدل گئی تھی۔ پرکشش نفوش کی خوب صورتی، بیماری لکڑی اور بڑھاپے نے جھین لی تھی۔ آنکھوں، آرزوؤں سے میرا دل اب بھگ کر رکھا ہو رہا تھا۔ توانا، پرشباب جسم کی رعنائیاں نمک کا ایسا ڈھیر بن گئی تھیں جو پانی میں پڑا ہوا ہو، مکمل کر ختم ہونے میں بس تھوڑی دیر ہو یا کچھ دیر۔
 گیت کے سپید مومی آنکھوں والے ہاتھ میں، ابھری ہوئی رگوں والا وہ آنکھوں جاتی بہت عجیب لگ رہا تھا مگر گیت کو نہیں، ان ہاتھوں میں اس کی ماں کا بچپن، اس کا کلس، خوشبو، ہنسی، بہت کچھ محفوظ تھا۔
 ”میں نے خود سے وابستہ تمام لوگوں کو بہت دکھ دیے، کسی کو خوشی نہیں رکھ سکا، نہ کوئی خوشی دے سکا۔“ ریاست علی کمزور آواز میں بول رہے تھے۔
 ”شاید، یہ سب یونہی ہونا لکھا تھا۔“ گیت نے سیف کے الفاظ پر اپنی آنکھوں کی لمبی کے لیے کہے، جن پر وہ خود بھی زیادہ یقین نہیں کرتی تھی۔
 ”نہیں، ہم اپنی غلطیوں کو قسمت کے ذمے

ڈال کر بری نہیں ہو سکتے۔“ ریاست علی نے نفی میں ہلایا۔ پھر مزید کہا۔
 ”تم نہیں جانتی ہو، نہیں سمجھ سکتی ہو، جب انسان لا چاری اور بے بسی کے عالم میں اپنی زندگی کا چرما اپنی آنکھوں کے سامنے بھٹاتا ہوا دکھ رہا ہو تو کیسے اس کی پوری زندگی، اس کی نظروں کے سامنے گزرتی رہتی ہے، اگر اس میں پشیمانی کی لمحات زیادہ ہوں تو مرنے سے پہلے ہی انسان مرنے لگتا ہے۔“
 ریاست علی نے بے حد خوف زدہ اور بے بس لگا ہوں سے گیت کو دیکھا۔
 ”میرا گزرا وقت، میرا وقت آنے سے پہلے ہی مجھے مار ڈالے گا۔“
 ”آپ اتنا نہ سوچا کریں آپ کی صحت کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔“
 ”میرا کچھ بھی میرے اختیار میں نہیں ہے، نہ میرا جسم، نہ میرا ذہن، میں لاکھ جاہول مکر خیالات مجھے خود ہی بکھڑا لیتے ہیں، میرے لیے ممکن ہے ان سوچوں کی گرفت سے رہائی پانا۔“
 ”آپ مجھے می کے بارے میں بتائیں، جب آپ نے پہلی بار ان کے لیے ڈوکی خریدی۔“ گیت نے موضوع بدلا۔
 ”ہاں، سارہ نے گھنٹ کیا تھا اسے، بالوں والا پوڈل، جس کا منہ پتا نہیں چلتا تھا کہ کہاں ہے۔“
 ریاست کی آنکھوں میں چمک سی آگئی تھی۔
 ”اور ماریہ نے اعلان کیا کہ وہ اس کا نام ڈیڈ رکھے گی کیونکہ وہ ڈیڈ جتنا ہی کیوٹ ہے۔“ ریاست نے مسکراتے کی کوشش کی مگر جانے کیوں مسکراتا نہ سکے۔
 ”میں نے اسے قرآن پڑھوایا، نماز، کلمے، دعائیں سکھائیں اور یاد کروائیں، وہ بہت شوق اور دلچسپی سے سیکھتی تھی۔ سارہ نے اسے سو رنگ سکھائی تھی اور وہ پانی سے باہر آنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ میں اسے خوش دیکھنا چاہتا تھا، خوش رکھنا چاہتا تھا، میں نے بہت بڑی خطا کی، میں۔۔۔۔۔“

ریاست کی ذہنی پر پھر بہک گئی۔
 ”جی کا اسکول میں پہلا دن، کیسا تھا، جب پہلی بھٹی ہونے تک کلاس کے باہر بیٹھے رہے؟“
 گیت نے پھر ان کا دھیان بنایا۔
 ”اسی شرط پر وہ کلاس میں بیٹھی تھی۔“ ریاست بولتے ہوئے بدلت بدلت اپنا چہرہ گیت کی طرف کیا۔
 ”تم نے تو مجھے معاف کر دیا ہے نا؟“
 ”مجھے تو آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔“
 گیت نے ایک بار پھر انہیں تسلی دی۔
 ”تم ماریہ کی طرح معصوم ہو، گناہ گار کی اولاد آدم اور مظلوم ہونو گناہوں کا بوجھ کچھ اور بڑھ جاتا ہے۔“
 ”آپ۔۔۔۔۔“ گیت نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر سیف اندر آ گیا۔
 ”فون خراب ہے یا سائلنٹ ہے؟“
 ”نہاں رے دوستوں کا فون آیا ہے میرے پاس، زواری مہندی میں کب تک جاؤ گی؟“
 ”میں کال کر لوں گی ان لوگوں کو۔“ گیت نے رخ موڑے بغیر جواب دیا۔
 ☆☆☆
 روایتی بلے گلے والی پاکستانی شادی وہ پہلی بار کر رہی تھی، شادی کی ساری شاپنگ کراچی کے ایک جدید مال سے کی تھی، یہاں کے فیشن اور ٹرینڈز کے حساب سے آج کے دن کے لیے تینوں لڑکیوں نے فرار ہوٹ منتخب کیے تھے۔
 لڑکے کرتا شوار میں تھے۔ دوار کے خصوصی دستوں کی وجہ سے ان کی بے حد آؤ بھگت کی جارہی تھی اور خصوصی پروٹوکول دیا جا رہا تھا جسے وہ سب ہی ادا بنوائے کر رہے تھے۔
 گیت البتہ کچھ پریشان اور کھوئی کھوئی تھی، وہ مسکراتا مسکراتا سب سے گلے ملنے اور باتیں کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔
 ”تم کچھ ڈسٹرب ہو؟ فریک کی زیرک لگا ہوں گیت کا عجیب چھاندہ رکھا۔“ نہیں تو۔

”میں پوچھ نہیں رہا تم سے، بتا رہا ہوں، تم پریشان لگ رہی ہو، یہاں ہو مگر یہاں نہیں ہو۔“ فریک نے چند لمحوں میں اس کا مکمل اور بھرپور تجزیہ کیا تھا۔
 ”نانا کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی مجھے، میں آنا نہیں چاہتی تھی یہاں مگر سیف نے مجبور کر کے بھیج دیا۔“
 گیت نے اپنے ارد گرد پھیلے رنگ و روشنیوں اور خوشبوؤں کے ماحول کو دیکھا، سب کچھ بہت پرکشش تھا پھر بھی اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔
 ”وہ اپنے بھے کی زندگی جی چکے ہیں۔ اب آج جو کچھ ہے وہ قدرت کا فیصلہ اور قدرت کا قانون ہے۔ ویسے یہاں آنے سے پہلے تم نے بھی ذکر نہیں کیا ان کا۔“ فریک نے اپنی ازلی صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔
 ”ارے گیت! تم یہاں اکیلی کھڑی کیا کر رہی، آؤ تازہ دار بار بار ہے۔“ ایما اسے بلانے آئی تھی۔
 ”چلو۔“ گیت نے فریک کے تبرے کا جواب دے بغیر ایما کا ہاتھ تھاما۔
 ”گیت!“ فریک نے یکدم ہی پکارا۔ وہ مڑی۔
 ”تمہیں یقین ہے کہ تم اسی وجہ سے پریشان ہو، اپنے نانا کی وجہ سے؟“
 ”ہاں!“ گیت نے وہ جواب دیا جس پر اسے یقین نہیں تھا اور فریک کو بھی نہیں آیا۔
 ”یہ میری زندگی کا یادگار منکشن ہے۔ میں کبھی فراموش نہیں کر سکتی اسے۔“ ایما بہت پر جوش ہو کر زوار کو بتا رہی تھی۔
 ”یہ تو شروعات ہے بارات اور ویسے میں اس سے زیادہ انبجوائے کر دو گی۔“ زوار زور سے چلا۔
 زندگی اور خوشی سے بھرپور تھی، جو اس کے چہرے کا مستقل حصہ بنی ہوئی تھی۔
 ”یہ جو تمہارے ہاں پورے خاندان، رشتے داروں اور دوستوں کی اسچ منٹ ہے تا یہ بہت

زبردست بات ہے، مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔
ایمانے مزید رہا۔
”کیا ہو گیت، تم بہت خاموش ہو؟“ زوار اس کی طرف متوجہ ہوا۔
”ہاں، بس وہ.....“ گیت سے کوئی وجہ بتائی نہ گئی۔

”تمہارے نانا ٹھیک ہو جائیں گے، گاڈ بلیس ہم۔“ زوار نے اس کی پریشانی کی وجہ خود ہی سمجھ کر اسے تسلی دی۔ اسے کسی نے آواز دی تو وہ وہاں چلا گیا، گیت نے ایما کی طرف دیکھا۔

”کیا میں بہت فکر مند لگ رہی ہوں؟“
”ہاں، کچھ کچھ لگ تو رہی ہو۔“ ایمانے اب غور سے اسے دیکھا۔ اپنے دوستوں کو تو کئی برسوں سے دیکھ رہی تھی۔ لہذا آج اس کی تمام تر توجہ نئے مناظر اور نئے لوگوں پر تھی۔

”چہرے کو آئینہ نہیں بننا چاہیے، جس کا جی چاہے کس دیکھ لے نہ کھلی کتب کہ جو دیکھے، بڑھ لے، گیت کی اچھن اور بڑھ گئی، کبیر کا فون آیا تو وہ ایک نبتا لگ تھلک نیم روشن گوشے میں بیٹھی۔

”تم ٹھیک ہو نا گیت؟“ ہر دوسرے روز بات ہوتی تھی دونوں کی اور ہر بار سب سے پہلا سوال، کبیر یہی کرتا تھا۔

”ڈیڈ! میں شدید مشکل میں ہوں۔“ گیت بے حد ناز لڑکھی، اکیلے بہت سارا بوجھ اٹھانا اس کے لیے بہت مشکل تھا۔

”کیا ہوا؟“ کبیر پہلے چونکا پھر فکر مند ہو گیا۔
”میں کھو گئی ہوں، راستہ سم ہو گیا ہے مجھ سے۔“
”راستے موجود ہوتے ہیں، بس ڈھونڈنے پڑتے ہیں، تمہیں کمر نہیں، بہادری دکھانی چاہیے۔“
کبیر ہر بات سے باخبر تھا۔ گیت اپنی ایک ایک بات اس سے شیر کر رہی تھی۔

”بہادر بننے سے کیا ہوگا؟ مجھے کوئی تمہہ نہیں چاہیے۔ نہ کوئی اعزاز۔“ وہ کسی چھوٹے بچے کی طرح ناراض ہو رہی تھی۔ سب سے خفا ہو رہی تھی، جس کے

پنہیدہ کھلونے اور اشیاء اس کے سامنے ہوں
انہیں اچھ لگانے کی ممانعت ہو، وہ روٹا نہیں جاتی تھی
مگر آنسو پلوں کی دبلیز پہ بیٹھے اجازت کے منتظر تھے۔

”وقت، انسان، کہانیاں، جذبے یہ سب لوٹ لوٹ کر ہر بار واپس کیوں آتے ہیں؟“ گیت کا دماغ سوالوں کی آماجگاہ بن چکا تھا۔ نئے کھائی گیندوں کی طرح ادھر سے ادھر ادھر سے ادھر اچھل رہے تھے مگر جواہروں کی گرفت میں نہیں آ رہے تھے۔
”اگر محبت ہے تو جرات سے آگے قدم بڑھاؤ، ورنہ واپس آ جاؤ، دنیا انسانوں سے بھری ہوئی ہے، ایک ہی شخص یہ قسم نہیں ہوتی۔“

کبیر دو متح دو پار کرنے والا بزنس مین تھا، رسک لے کر جرات مندانہ فیصلے کرنے کا عادی تذبذب میں وقت گزارنے کا قائل تھا نہ زندگی۔

”دنیا کا سب سے زہریلا لفظ کتا ہے، یہ محبت انسان کو مار دیتی ہے ڈیڈ۔“ گیت نے دانٹ پریش کر کے بولے۔

”محبت زندگی بھی عطا کرتی ہے، جیسے کا آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتی ہے۔“ کبیر نے اس کا اختلاف کیا۔

”میں نے تو نہیں دیکھا۔“ گیت بولتے بولتے جھنجھلا گئی، ایک تو یہ سیف، اس کی پانچویں کال آرہی تھی، گیت نے پھر اسے نظر انداز کیا۔

”گیت!“ پیڑیہا کی آواز نے اس کے چونک کر سر اٹھایا۔
”سیف کا فون آیا تھا ابھی میرے پاس۔“

”تمہیں لینے آ رہا ہے۔“
”کیوں؟“ اس کے چہرے پہ غیر معمولی تاثر دیکھ کر گیت کا دل انہونی کے خیال سے دھڑک اٹھا مگر انہونی اب ہوئی بن چکی تھی، پیڑیہا نے اس کے قریب بیٹھے ہوئے گیت کا ہاتھ اپنی نرم گرفت میں لیا اور دیکھی ہی نہ رہی۔

”گیت نے مدد طلب لگا ہوں سے اسے دیکھا۔“
”کریڈٹ فارڈر گزر گئے ہیں۔“

☆☆☆

پرکشش نفوش والا سناٹا لاچرہ، گھٹے چمکدار بال ایک طرف سے ماتھے پر گرے ہوئے، اپنے دور کا اور معروف ہیئر اسٹائل، ہلکی سی سکرابٹ سفید ہلدار داٹوں کی ایک جھلک دکھار رہی تھی۔ گیت نے اس چہرے پر انگلیاں پھرنی چاہیں۔

اس کا ہاتھ شیشے کی سرج سے لگایا۔ فریم میں لگی، ریاست علی کی اوائل جوانی کی تصویر، اس نے سیف کی اجازت سے اپنے پاس رکھ لی تھی۔ تصویر کو اپنے بیک میں رکھ کر وہ باہر آگئی، کبیر سے باہر، گیت سے باہر، ہوا میں کھلی بڑھتی تھی۔

باہر نکلی تو اندازہ ہوا کاشن کا سوٹ سردی روکنے میں ناکام تھا۔ چلتے چلتے جب تک وہ قریبی پارک میں پہنچا تو ہوا سے اس کے ہاتھ اور چہرہ ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ بالوں ککناؤں کے چپچپے کرتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھ بغلوں میں دے دیے اور بچ پٹھنے لگی، سرہ کا سورج اپنی چمکی تھمازت لٹا رہا تھا۔

سرد ہوا اس کے آڑے آرہی تھی۔ بچ کی ٹھنڈی سانس پہ بیٹھے ہوئے ایک لمبے کو وہ سٹ کئی پھر چند لمحوں بعد ٹھنڈے کے سارے احساسات ختم ہو چکے، شاید اندر کی تپش بہت زیادہ تھی۔

”بہت خدی لڑکی ہو، مجھے پہلے اندازہ نہیں تھا۔“ سیف کی آواز کے ساتھ ہی ایک گرم شال اس کے کندھے پہ پڑی۔

”تم کیا ہر وقت میرا پیچھا کرتے رہتے ہو؟“ گیت پھر چڑچڑی ہوئی۔

”جو میرے دل میں رہتے ہیں، ان پہ نظر رکھتا ہوں۔“ اس کے قریب بیٹھا ہوا بے حد اطمینان سے بول رہا تھا۔

”میں اس وقت تمہاری چاہتی ہوں۔“
”خود کو تمہاری تو کیا ہوا ہے تم نے، اب اور کتنی کہاں چاہیے۔“

”سیف! کیا تم بدگلی سے نکلنے کا راستہ جانے لگا؟“ گیت نے مدد طلب لگا ہوں سے اسے دیکھا۔

بس ایسی ہی ہو رہی تھی آج کل وہ چل میں تولہ، چل میں ماشہ۔

”میرا ہاتھ تھام لو، ہر بندگی سے باہر لے جاؤں گا۔“ سیف نے اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔
”خوف زدہ ہو رہے ہوئے ہاتھ تھامنے کی جرات نہیں رکھتے۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تم خوف زدہ نہیں ہو، مجبور ہو، محبت سے بڑی مجبوری کوئی نہیں، یہ انسان کو بے بس کر دیتی ہے۔“ سیف اس کے ہمراہ چلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”ہر وقت محبت محبت مت کیا کرو میں چلی جاؤں گی کل پھر واپس نہیں آؤں گی۔“ وہ جھنجھلا کر اس پر برس پڑی۔

”میں نے کچھ نہیں کیا گیت، یہ سب فیصلے کوئی اور کرتا، میں نے تو صرف محبت کی ہے جنہیں یہاں تک کوئی اور لایا ہے، واپس چلے بھی جاؤ گی تو وہ دوبارہ لے آئے گا۔“ سیف نے دعویٰ کیا۔

”نہ میں محبت یہ یقین رکھتی ہوں نہ قسمت پہ۔“ بے چلک لہجے میں بولی ہوئی وہ چلے جا رہی تھی۔
”کسی شے پہ یقین نہ رکھنا اس کی عدم موجودگی کو ثابت نہیں کرتا اس دنیا میں بہت سے لوگ خدا پہ یقین نہیں رکھتے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدا موجود نہیں، وہ تم سے ڈراؤ کر کے ہوئے سو جا کر، میرے بارے میں بھی اور محبت کے بارے میں بھی اس وقت تمہیں جو خیالات آتے ہیں، خاصے مقول ہوتے ہیں۔“

چنٹ کی دونوں جیبوں میں ہاتھ گھسائے وہ کسی طرح پارمانے پہ آ ماہدہ نہیں تھا۔
”خواب یادداشت بھی ایک بڑی نعمت ہے اسے ہر بات کیوں یاد رہتی ہے میری؟ گیت نے اسے دیکھا جسے نہ دیکھنے کے لیے وہ اپنے دل کو مٹانے کے حقن کر رہی تھی۔

اس نے ہی تو ایک روز سیف کو بتایا تھا کہ خدا کی یکائی کے بارے میں اسے ڈراؤ کر کے ہوئے خیال پختہ کر رہی تھی۔

نیال آیا تھا اور پھر مزید سوچتے سوچتے یہ خیال چنٹ



مباحثہ گیکہ کروڈ

اے اپنے کانوں پر ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔ سن بگلا بھورا بنا سارے فتن کا ایک چکر لگا آیا تھا۔ ہر گلی کے ساتھ چھپر چھڑا، اور ہر گلی کا بوسہ لے آیا تھا۔

”بی محترمہ..... آپ کا ”ایک کروڈ“ کا انعام نکلا ہے!“

اس شخص نے جو شیلے انداز میں دوبارہ سے خبر سنا کر سمجھنا نہیں سکتے تھے۔ ہوتے ہوئے پتہ نہ تھا۔ ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ بہت حسین سا خواب دیکھ رہی

”مبارک ہو، آپ کا نور بنا پستی گھی بنانے والوں کی طرف سے ”ایک کروڈ“ کا انعام نکلا ہے!“ ایسی خبر کہ سمیرا کو لگا اس کا منہ ”موٹی چوڑ“ کے لہوؤں سے بھر دیا گیا ہے۔ سماعتیں بے یقین، آنکھیں پٹی کی پٹی اور منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔

”کھک..... کیا؟.....؟“ نا جانے کیسے وہ یہ خبر سن کر اپنی خوشی سے بھر پور جھجھک کر روک پائی تھی۔ مگر لڑنی آواز اس سے خوشی کی غماز بن گئی تھی۔ آواز تو کیا بلکہ اس کا پورا وجود ہی جوش میں لرز رہا تھا۔

میں جا رہے تھے کیڑے نکال لیں مگر کسی اور سے اس کی برائی برداشت نہیں ہوئی، رہے مسائل تو بھی نہ بھی حل ہوئی جائیں گے۔“
مگر وہ اس وقت چپ ہی رہا، گیت چلی گئی، اے خدا حافظ بھی نہیں کہا۔ جن کی واپسی کا یقین ہو، وہ انہیں الوداع کہنے پہ یقین نہیں رکھتا تھا۔

☆☆☆

کسی بھی جگہ تفریح کے لیے سب کا اصول ایک ہی تھا، عوامی سواری، عوامی کھانے اور ڈھابے سوائے اصول پر عمل کرتے ہوئے جھک جھک کرنی ٹرین میں سوار تھے، دیسی اور بدیسی دونوں اقسام کے مسافر حیرت اور دلچسپی سے ایک دوسرے کا جائزہ لے رہے تھے۔

دریائے سندھ کے شیشے پانیوں سے سیراب سرسبز کھیتوں کو انہماک سے دیکھ کر فریاد اب اسی انہماک سے گیت کا چہرہ دیکھ رہا تھا جو آئینہ بھی بن چکا تھا اور کھلی کتاب بھی۔

سیف اور گیت کے درمیان جو بھی جھگڑا ہو جاتا تھا، جو تعلق تھا، وہ ان دونوں کے بغیر بتائے بھی نہیں کی نظروں میں آ چکا تھا۔ ماضی کی داستان سے واقف نہیں تھے وہ سب، مگر اتنا ضرور سمجھ چکے تھے کہ دونوں میں ان کہا سا ایک بندھن بھی ہے اور گریز اور تباہی بھی۔

”جتنا تم آگے کی طرف سفر کر رہی ہو، تمہارا دل شاید اتنا ہی فاصلہ پیچھے کی طرف کھینچ رہا ہے۔“ فریاد نے جھپک جھپک کر گیت کو مخاطب کیا، جو اس جرات پر اسے گھور رہی تھی مگر اس کا دل تو تسلیم کر چکا تھا جو سیف نے کہا تھا کہ۔ ”ماضی کی داستانوں پہ مستقبل کی خوشیاں ترپاں نہیں کی جاسکتیں۔“

اور اسے یہ بھی آگئی ہو رہی تھی کہ اسے واپس جانا ہی پڑے گا۔

سیف کے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے کیونکہ وہ خود کو دہاں چھوڑ آئی تھی۔



ہو گیا تھا، ایک گاڑی کو ایک ہی ڈرائیور درست سمت میں چلا سکتا ہے ایک سے زیادہ ڈرائیور ہوں تو سفر اور منزل کھولے ہو جاتے ہیں، سوار یوں کی خیریت نہیں ہوتی، اتنی بڑی کائنات کا نظم و نسق، ایک ہستی کے ہاتھ میں ہے، بھی سارا انتظام بخیر و خوبی اور حسن و کمال کے ساتھ چل رہا ہے۔

”تم اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔“ تھک ہار کر خود کو بہادر ثابت کرنے کے لیے اس نے سیف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

”اور تم زندگی اپنی بھی میری بھی۔“
سیف کی آنکھوں میں کرب تھا لہجے میں بھی، چہرے پر بھی اور آواز میں بھی، وہ اندر چلا گیا، پھر اس نے گیت سے کچھ نہیں کہا، نہ رات میں، جب وہ اپنا بیگ تیار کر رہی تھی، نہ صبح ناشتے کی میز پر، جب امی نے اس سے کہا کہ۔
”پھر کب آؤ گی۔“ تو گیت نے کندھے اچکا کر کہا تھا۔

”دیکھو گی امی اگر وقت ملا تو، ویسے بھی زندگی بہت مصروف ہے۔“

اور سیف اس وقت بھی خاموش رہا جب وہ سب سے الوداعی گلے کر اس کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔

”تمہاری ہر مہربانی کا شکریہ۔“ سیف نے سرمہ کر کے مسکراتے ہوئے اس کا شکریہ قبول کیا اور اب بھی خاموش رہا، مگر نہ جب گیت کے بانی دوستوں نے اس کی مہمان نوازی کا گرم جوشی سے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

”تمہارا شہر بھی اچھا ہے اور یہاں کے لوگ بھی، بس ذرا ماضی.....“

تب سیف نے ہنس کر کہا تھا۔

”یہ شہر بیک وقت ایک ماں کی طرح سب کو اپنی آغوش میں سمیٹنے والا بھی ہے اور ایک تھوڑے بگڑے مگر لاڈ لے بچے کی طرح پیارا بھی ہے۔ اپنے تمام تر مسائل کے باوجود ہمیں عزیز ہے۔ ہم خود اس

ہے۔ تصدیق کے لیے اپنی کلائی پر چنگی بھری تو منہ سے نکلتی "ہائے" کو بیکھل دانتوں میں دبا کر روکا تھا مگر آنکھوں میں آئے خوشی کے آنسوؤں کو روک نہ پائی۔

"ایک کروڑ..... آپ سچ کہہ رہے ہیں نا؟" لرزتی آواز پر قابو پا جاتے ہوئے سیرا نے فون کے دوسری جانب مخاطب شخص سے پوچھا تھا۔ یقین تو سیرا کو اتنی ہی گیا تھا۔ تصدیق کے لیے سوال پوچھ کر وہ خود کو سنیا رہی تھی اور دل کو بھی۔

"جی محترمہ..... اور وہ بھی نقد!" "ایک اور دھماکے دار خبر..... یعنی رقم ہاتھ کے ہاتھ نقد!"

"مطلب "فوری کے فوری"..... نہ چیک" کا جھنجھٹ اور نہ ہی مہینہ دو مہینہ انتظار کے بعد رقم اکاؤنٹ میں منتقلی کا مسئلہ۔ سیرا کی تو جیسے باجیس ہی کھل گئیں۔ کیونکہ اس کا یہ تو ذالی اکاؤنٹ تھا۔ اور نہ ہی کسی "چیک بک" یہ دیکھ کر رقم وصول کرنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔

وہ ہاؤس وانف تھی۔ مگر حمادی کمائی سے چلتا تھا۔ جو ایک سرکاری ملازم تھا۔ نایا بینک میں ملازم ہوا تھا سو ابھی تنخواہ معقول تھی مگر بہت زیادہ نہیں تھی۔ اس تنخواہ میں بھی وہ بہت اچھے طریقے سے گھر کا انتظام والہ امر دیکھ رہا تھا۔ صابروں کا سنا انسان تھا۔ کچھ خرچ بھی کر لیتا اور تنخواہ ابھرت بھا کر جمع بھی کر لیا کرتا تھا۔ تاکہ مشکل وقت میں کام آسکے۔ اپنی استطاعت کے مطابق کچھ جب خرچ سیرا کے ہاتھ پہ بھی رکھ دیا کرتا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کرتا کہ۔ "فصل خرچی انسان کو سوائے پریشانی کے اور کچھ نہیں دیتی!"

کسی حد تک تو سیرا کو شوہر کی اس صیحت پر غصہ بھی آیا کیونکہ اس نے سوچ رکھا تھا کہ شادی کے بعد شوہر کی کمائی پر خوب عمل کریش کرے گی۔ مگر شوہر صاحب اس قدر لافیت شعار فطرت کے مالک تھے

کہ سیرا کے سارے ارمان دھرے کے دھرے رہ گئے۔ سو شوہر کی حکم عدولی بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔ دل مار کر بہت سی خواہشوں کو دل میں دبا کر جیب خراب استعمال کرنا شروع کیا۔ مگر دل کے نہاں خانوں میں چھپی اس خواہش کو کسی دل سے نکال نہ پائی۔ کہ کوئی بڑا سا انعام یا "پرائز باؤ" تو لکھ بھی اپنے سارے ارمان جو اکثر "آنسوؤں" کی صورت میں بہہ جاتے تھے۔ پورے کرے اور آج اسے موقع مل ہی گیا تھا۔

"ایک کروڑ" کی صورت میں۔ "تو مجھے اب کیا کرنا ہوگا.....؟" من بھلا کا تو میں نہیں آ رہا تھا۔ پھر بھی خود پر کنٹرول کرتے ہوئے سیرا نے اس شخص سے سوال کیا۔

"اپنی انعامی رقم وصول کرنے کے لیے محترمہ بس آپ کو.....!" اور پھر اس شخص نے سیرا کو فون پر ہی سارا طریقہ سمجھا دیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اور وہ اس طرح اپنی انعامی رقم وصول کر سکتی ہے۔

نور بنا پتی تھی ایک لوکل بھی چنانچے والی کمپنی تھی۔ یہ لوکل کمپنی اپنے نمائندوں کے ذریعے اپنی پروڈکٹ کئی محلوں میں بچھا کرتی تھی ان کی پروڈکٹ کسی حد تک بازار میں ملنے والی اشیاء سے تھی۔ ہوتی تھیں۔ پھر کم قیمت کی چیزیں عورتوں کی نظر سے کیسے بچ سکتی تھیں۔ ان پروڈکٹ پر شاندار آفرز ایک کے ساتھ دو مفت "بے"

یہ تو عورتوں کے کپڑوں پر پھر بیاں چلانے کے برابر تھا۔ جیسے ہی ان کے نمائندے آئے مگر ہوس گھر کے سب کام چھوڑ کر ان کی طرف کھینچیں۔ نمائندوں کے گرد بول گئے اڑاں دیتیں کہ جیسے کوئی مداری اپنے ساتھ ایک عدد بندر..... ایک عدد بکری اور ایک عدد کتا لے کر آگیا ہوتا تھا کھانے کے لیے۔

شروع میں سیرا نے اس طرف کوئی دیکھی نہ لی مگر کسی نہ کسی بڑوں کے منہ سے تعریف ہی تو پھر ایک آدھ چیز لے کر خود بھی تجربہ کیا۔ ذائقہ پسند آیا۔ چیز بھی مناسب دام کی تھی۔ پھر کسی حد تک متاد اور بچوں نے بھی تعریف کی تو اس کا حوصلہ بڑھا اور پھر اکثر ہی کچھ نہ کچھ

لے لگی۔ نور بنا پتی تھی بنانے والوں نے اپنی اشیاء انعامی اسکیم شروع کر کے اپنی آفرز کو مزید دلکشی عطا کر دی تھی۔ اسی انعامی اسکیم کے تحت سیرا کا انعام نکلا تھا۔ جس کی اطلاع اسے فون پر دی گئی تھی۔

"ایک کروڑ..... اتنی بڑی رقم..... اتنا بڑا انعام!" سیرا کا دل تو خوشی سے پھولنے لگا تھا۔ "ایک کروڑ..... اتنی بڑی رقم..... اتنا بڑا انعام!"

کیونکہ اسے تیز دوڑتے دماغ نے چند ہی سیکنڈ میں اس رقم کو استعمال کرنے کی ایک لمبی کی فہرست تیار کر کے اس کے سامنے رکھ دی۔

"پہلے تو ایک اچھا سا صوفہ سیٹ خریدوں گی وہی جو نی وی ڈرائے میں دیکھا تھا۔ ہمارا صوفہ سیٹ کتنا پرانے فیشن کا ہو گیا ہے نا.....!" "ایک عدد ای ڈی ڈی، بھلا کتنے انچ کی۔ چلو درجہ نیے سائز کی ہی سہی۔" "حماد کو کتنی بار کہہ چکی تھی کہ پرانے فیشن کے ہونگے ہیں۔ تب تو یہ کر لیں۔ مگر حماد اور خیر کیوں کی وجہ سے ہمیشہ ہی "اچی بار" کا کہہ کر ٹال دیتا کرتا تھا۔" چلو اب اتھ سے

پڑے بھی خریدوں گی!" اس کا دھیان اپنے پرانے چھوٹے سے موبائل کی طرف نہ کرتی وہی میں نت نئے ماڈل کے موبائل فونوں میں محو ہو گئے۔ "تو دل نے ایک اچھا سا مہنگا موبائل خریدنے کی تجویز پیش کر دی.....!"

"سچ موبائل کے بعد تو یہ اپنی سونی کلائیوں کی طرف گئی تو دل سونے کے ٹکٹن کے لیے چلنے لگا تو اس شوق کو پورا کرنے کا ارادہ بھی باندھ لیا۔ ہر عورت کی طرح "سونا" سیرا کی بھی کمزوری تھا۔ جس کی گولڈ کی جیلوری شاپ کے سامنے سے گزرتی تو آنکھوں میں ڈھیروں حسرت جمع ہو جاتی.....!"

"سونے کے ٹکٹن کے بعد نظر اپنے کپڑوں کی الماری پر ڈالی۔ جس میں کوئی سوٹ بھی ڈھنک کا نہ تھا۔ کچھ جوڑے شادی کے تھے۔ جواب پرانے فیشن کے ہو گئے تھے اور کچھ سے اتوار بازار سے خریدے ہوئے لان، کاشن کے سوٹ تھے۔ جو حمادی تہوار پر

لا کر دے دیتا تھا۔ وہ انہی کو میسوں باراستری کر کے استعمال کر لیا کرتی۔ چلو اس بار بہت سارے نئے اور مہنگے جوڑے خریدوں گی!"

کپڑوں کے بعد دماغ جوتوں کی شاپ کی طرف گیا۔ جہاں سے جدید فیشن اور ڈیزائن کے جوتے خریدے اپنے لیے، بچوں اور حماد کے لیے بھی۔ دونوں ہاتھوں میں شاپنگ کے بیگ پکڑے باہر نکلی تو آنکھوں کے سامنے فریول انجینی کا پورڈو دیکھ کر آنکھوں میں غریب جذبات سے سی در آئی۔

"چلو اتنا بڑا انعام نکلا ہے تو کسی بھانے وہ اور حماد وغیرہ بھی کر آئیں!" انسان کے پاس بیٹے ہوں اور اللہ کا گھر نہ رکھے۔ یہ تو کتنی ہوئی نا..... آنکھوں سے پانی خشک کرتے ہوئے دل ہی دل میں شاپ بھی سلیکٹ کر لی کہ کہاں سے عمرے کے لیے ضروری اشیاء خریدنے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سوچ لیا کہ فریول انجینی میں حماد کا ایک دوست بھی ہے اس کے ذریعے سستا عمرہ بیچ بھی مل جائے گا۔ لوجی کرہ پانچ بھی ہوگی۔

مجبوریں، آپ ذم ذم، جائے نمازوں

آپ کا بُرہ

مصنف:

کیرو

قیمت

150/- روپے



منگوانے اور قریب سے لکھیے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، گرامی فون: 32216361

اور تبصیحوں کے حساب کتاب لگانے کے ساتھ یہ بھی سوچنے لگی کہ انعامی رقم میں کچھ بینک میں بھی جمع کروادوں گی اور اکاؤنٹ سے اسے نام کا بھی حلقوں کی گی۔ آخر کو میری بچت سے تو ہی اتنا بڑا انعام نکلا ہے۔ کیا کیک ڈورنٹل نے توجہ اپنی جانب نہ کی۔ حماد آفس سے کھڑا گیا تھا۔

”حماد..... ایک اتنی بڑی خوشی خبری ہے کہ کیا بتاؤں؟“ وہ آفس سے تھکا ہار ہمارا گھوٹا تھا۔ میرا نے پیٹر اسے فون پر سنانے کے لیے دس کالز میں مگر وہ میٹنگ میں مصروف تھا۔ سو بات نہ ہو سکی۔

”ایک کروڑ.....!“ اس نے ساری رام کھٹا شروع سے لے کر آخر تک حماد کے سامنے پھولی ہوئی ساکسوں کے ساتھ سٹاڈی تو پہلے تو وہ تھوڑا حیران ہو اور پھر ہنسنے لگا۔

”دامغ ٹھیک ہے تمہارا؟“ حماد میرا کی سادہ لوح فطرت سے ابھی طرح واقف تھا۔ جو آج کل کے دور کے اعتبار سے قدرے بے وقوف سی بھی۔ وہ اپنی معاملات میں اتنی جذباتی بھی کہ یہ تک نہیں سوچتی تھی کہ سامنے والا بول رہا ہے یا جھوٹ..... یا کہیں وہ کوئی فراڈ تو نہیں کر رہا۔

”اس میں دامغ خراب ہونے والی کیا بات ہے؟“ سمیرا جو خوشی میں اتانولی ہوئی جا رہی تھی۔ حماد کی اور اتنی بڑی خوش خبری کو تانکا لیلے پر دمزدہ ہوئی۔

”ایک انجان بندہ..... فون پر تمہیں ایک کروڑ“ انعام کی خبر دے رہا تھا اور تم اس پر یقین کر کے بیٹھ گئی ہو۔ اس پر ہنسون نہ تو اور کیا کروں!“ وہ ہنوز ہنس رہا تھا۔

”حماد..... انجان کہاں..... فور بننا پستی بھی بنانے والوں کا نمائندہ بول رہا تھا جو دوسرے مینیج ہمارے محلے میں آتے ہیں.....!“ سمیرا کو حماد کی بے موقع بات سخت چڑا رہی تھی۔ وہ حماد سے جس قسم کی توجہ چاہ رہی تھی اس کا عشرہ پر عیش بھی دیکھنے کو نہیں ملا تو وہ محل بھیج کر رہ گئی..... بلکہ اس کے مطابق حماد نے اتنی زبردست خوشی کی خبر کو کسی میں اڑا کر اس کا

بھی مزہ کر کر اکر دیا تھا۔

”جناب وہی نور بننا پستی بھی جس میں بکے مزے مزے کے کھانے آپ اور بچے کھا کر انگلیاں چاٹتے ہیں!“

سمیرا چارہ رہی تھی کہ حماد جسے تینہ ختم کر کے اس نمائندے سے جو آگے کی کارروائی بتانی تھی وہ کرے اور اپنی انعامی رقم ”ایک کروڑ“ پورے پانچ دن بعد وصول کرے۔ مگر یہ کیا وہ تو مسلسل اس کا فائدہ اڑا رہا تھا۔

”اس دور میں بھی کوئی اتنا بے وقوف!“ حماد قدرے تنجیدہ سا رہتا تھا مگر آج یوں کل کر ہنس رہا تھا جیسے سمیرا نے اسے کوئی لطف سنا دیا ہو۔

اسے یہ ساری کہانی ”فراڈ“ اور ”جھوٹے باز“ کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اور سمیرا کی بے وقوفی پر ہی آ رہی تھی جو اس کی سٹائی خبر کو کج مان سمجھتی تھی۔

”آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ فراڈ ہے؟“ ”نہ کوئی جانا پچھانا نام ہے اس کی پستی۔ نہ ہی یہ پتا کہ یہ کہنی کہاں ہے یا کس علاقے یا شہر میں ہے۔“ بارکیٹ میں بھی میری ایسے کسی نام پر ہنسنے لگی۔ ”گزری!“ حماد کے لیوں پر ابھی بھی مسکراہٹ کی وہ سمیرا کی پچکانہ باتوں پر خاصا محظوظ ہوا تھا۔

”پھر اپنی انعامی رقم وصول کرنے کے لیے پہلے دس ہزار روپے بذریعہ ”ایس پی“ اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرنا۔ تم خود ہی سوچو کہ یہ اپنا سارا معاملہ کہاں سے فراڈ نہیں لگتا؟“

حماد کی مضبوط دلیل اسے بھر کے لیے سمیرا کو لا جواب کر گئی تو وہ بھی تذبذب کا شکار نظر آئی۔ تاثرات بتانے لگے کہ عقل کچھ سمجھا رہی ہے مگر وہ سمجھنے پر شاید آمادہ نہیں ہو رہی تھی۔

اس جتنی کہ نمائندے نے انعامی رقم ”ایک کروڑ“ وصول کرنے کے لیے یہ پراس تیا تھا کہ دس ہزار روپے پہلے بطور فیس آپ ہمارے موہاٹل اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کریں اور پھر پورے پانچ دن کے بعد ہمارا نمائندہ انعامی رقم وہ بھی نقد لے کر آپ کے دروازے پر کھڑا ہوگا۔ اور سمیرا نے بنا سوچے سمجھے بھی ہنسنے لگی۔

”فرق تھا کہ حماد سے بات کر لی تھی۔ ورنہ خوشی میں دیوانی کرا کر تو بس نہیں چل رہا تھا کہ ابھی کے ابھی دس ہزار روپے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروادے.....“

”سمیرا..... زمانہ اب اتنا بھی سادہ نہیں رہا جتنا تم سمجھ رہی ہو.....!“ حماد اب کچھ تنجیدہ سا ہوا تھا۔

”تیرے میں تمہیں اس کام کی اجازت دوں گا ورنہ اتنی جہاد کی ایسی بے وقوفی کا حصہ بنوں گا.....“

حماد نے حکمے انداز میں دو ٹوک بات کی تھی۔ مگر سمیرا کے اندر کی بے چینیوں کو قہر اڑ نہیں مل رہا تھا۔ اسے لگا حماد بہت زیادہ مخفی ہو کر سوچ رہا تھا۔ ہلالو کی پائل سے جو اتنا بڑا انعام دے..... رات بھر ”ایک کروڑ“ کی رقم خواب میں دیکھتے ہوئے سوئی جا کی کیفیت میں رہی۔ اسے صبح ہونے کا انتظار تھا اور حماد کے آفس جانے کا.....

☆☆☆

حماد آفس چاچا تھا اور بچے اسکول روانہ ہو گئے تھے۔ میرا نے جلد از جلد حکم کے کام سینے اس دوران اس نے دوسرے مگر کی طرف دیکھا۔ نمائندے نے کہا تھا دن کے بارہ بجے تک یہ رقم آپ میرے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرادیں۔ یعنی جلد ہی آپ رقم ٹرانسفر کرادیں گے۔ یہ انعامی رقم اتنی جلد آپ تک پہنچا دی جائے گی۔

سارے کام مکمل کر کے اس نے بینک میں دس ہزار روپے جو اسے حماد چپ خرچ کے طور پر دیتا رہا تھا۔ وہ اکثر اس میں سے کچھ نہ کچھ چھپایا کرتی تھی۔

اب اس کے پاس مطلوبہ رقم موجود تھی۔ اسے حماد سے ملنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ وہ پر ضرورت اپنا انعام حاصل کرے گی۔

حماد کی باتوں میں آکر بے وقوفی نہیں کرے گی۔ جب اتنا بڑا انعام اس کے ہاتھ میں ہوگا تو حماد خود بخود اس کی کفایت شعاری، عقل مندی کا مستحق ہوگا۔

بس حماد سے چوری جیسے کام کرنا تھا۔ وہ جب ایک کروڑ کی رقم وصول کرے گی تو بہت اعتماد کے ساتھ حماد کو سب بتائے گی۔

”کہ جناب زمانہ اب اتنا بھی خراب نہیں ہوا ہے آپ نے سوچ بنائی ہے!“

چادریاں لے وہ گھر سے نکلنے ہی لگی تھی کہ بڑوں کا ناہید آیا آپ آئیں۔ چرے پر چھائی رہنمائی کی خاص رہنمائی کا اشارہ دے رہی تھی۔ یوں اچانک آدھ پر سمیرا کو سخت ناگواری ہوئی تھی۔ اسے جانے کی جلدی تھی اور ناہید آپ کی آمد اس کام میں رکاوٹ بن گئی تھی۔

ناہید آپ کی رہنمائی کی وجہ ہو چکی تو پتا چلا کہ انہیں بھی ایسے ہی ”انعام رقم“ کی کال آئی تھی۔ یعنی کے نمائندے نے آٹھ ہزار اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرنے کو کہا جو انہوں نے گھر والوں کے منع کرنے کے باوجود مع کرادے۔ نتیجہ اس صورت میں نکلا کہ پانچ تو کیا پندرہ دن گزرنے کے بعد بھی انعامی رقم موصول نہیں ہوئی اور نمائندہ کال تک وصول نہیں کر رہا تھا۔ اس صورت حال کے بعد ناہید آپ کا شوہر کے ساتھ خاصا جھگڑا ہوا۔

سمیرا کی آنکھیں مزید حماد کے ایک اور انکشاف نے کھول دیں کہ ایک ایسا فراڈ کروہ بچڑا گیا ہے جو ”ایک کروڑ“ کی انعامی رقم کی خوشی خبری سنا کر سادہ لوح لوگوں کو خوف بناتا ہے۔ اور پھر ان سے انعامی رقم بڑ کر کی اور علاقے یا شہر کا رخ کرتا ہے۔ سمیرا نے فیصلہ سن کر اندر ہی اندر لرز اٹھی۔ وہ بھی ایک انجان شخص کی بات کا اعتبار کر کے بے وقوفی کرنے جا رہی تھی۔ جو ناہید آپ کی جتنی تھیں۔

”سمیرا تمہارے پاس کچھ بچت بڑی ہے تو مجھے دے دو۔ اس پر میری خواہاں ہے۔ جتنے جتنی کا مل جمع کروانا ہے۔“ حماد نے ضرورت پڑنے پر میسے مانگے تو اس کے پاس وہی رقم کی جو وہ انجان اکاؤنٹ میں بھیجے والی تھی۔ وہ تو شکر ہے کہ بروقت آنکھیں کھل گئیں۔ اور ساری سچائی سامنے آگئی۔ ورنہ وہ بھی یوں ناہید آپ کی طرح ہی شرمندگی سے دوچار ہوتی۔

”ایک کروڑ“ کی رقم تو کتنی نہیں تھی ہاں ”کروڑ“ کی جھڑکیاں اسے حماد سے ضرور سننے کو مل جاتیں۔ کیوں کہ ہر کسی پر اعتبار کر لینا بھی دانش مندی نہیں اور ہر کسی سٹائی بات پر بغیر تحقیق کے کوئی قدم اٹھانا انسان کو پیچھا دے اور افسوس کے سوا کچھ نہیں دیتا۔

☆☆

خوشبو کا پیغام

اس کی آنکھ اٹھیں پہ بھانت بھانت کی آتی
آوازوں سے مٹتی تھی۔
”اوہو کیا مصیبت ہے؟“ گرمی اور سفر کی
اکٹا ہٹ دہ بڑے خراب موڈ میں تھا۔ کھڑکی سے باہر
جھانکا۔ یہ کوئی چھوٹا سا گناہ اٹھیں تھا اور یہ آوازیں
جنہوں نے اسے ڈسٹرب کیا تھا۔ ٹھیلے اور چھاپڑی
والوں کی نہیں بلکہ ٹرین پر سوار ہونے والے نئے

مسافروں کی تھیں۔ اس نے قہر سے دیکھا۔ دو ادھیڑ
عمر صحت مند خواتین، ایک جوان دوسری نو جوان لڑکی
ایک پہلوان نما مرد ایک اجیر عمر کے حضرت اور جوان
لڑکا جوان سب میں معقول تھا اور ان لوگوں کے ساتھ
سامان اتنا تھا کہ لگ رہا تھا ایک سال کے لیے کہیں
ڈیرے جمانے کا پروگرام ہے خواتین نے اس تیز
چلائی دھوپ میں شوخ رہی کپڑے اور زیورات

وقار

پاکستانی یو اینٹ

ڈاٹ کام



پہن رکھے تھے۔ البتہ مرد ہلکے ہلکے موسم کے مطابق لباس میں تھے۔ خواتین اسی ڈبے میں سوار ہوتی تھیں اور اب مرد سامان رکھ رہے تھے۔ ذرا دیر کے بعد یہ پرسکون ڈبا شور سے بھر گیا۔

”بھابی! آپ اگلے اتنی بڑی سیٹ پر بیٹھے ہو۔ ادھر چھوٹی سیٹ پر جا کر بیٹھو۔“ پہلوان نما مرد نے اتنی ہی شاس کو مخاطب کیا۔

وہ بے زاری سے اٹھا اور جا کر سنگل سیٹ پر بیٹھ گیا۔

”خالد اختر! آپ ادھر آ جاؤ۔“

اس مرد کی آواز کھروری اور بھاری سی تھی۔ شاس کے تو کانوں میں ہلکی ہونے لگی۔ سامنے کی سنگل سیٹ پر بیٹھی رسلے میں مگن لڑکی نے سر اٹھا کر نئے مسافر کو دیکھا اور پھر دوبار اپنے ڈائجسٹ میں مگن ہو گئی وہ اور شاس ایک ہی اسٹیشن سے سوار ہوئے تھے جبکہ بھی ایک ہی ڈبے میں ملی اور شاس نے دیکھا تھا اس نے آتے ہی بیک سے ڈائجسٹ نکالا اور اس میں مگن ہو گئی۔ ایک دوبار جب شاس نے اس پر نگاہ ڈالی تو اسے لگا تھا۔ وہ مسلسل ایک ہی صفحے پر نگاہ جمائے بیٹھی ہے۔ خیر وہ زیادہ دھیان نہیں دے سکا کہ اس وقت اس کے ساتھ چند لڑکے بیٹھے تھے وہ ان سے باتوں میں مشغول ہو گیا۔ وہ اترے تو اسے نیند آ گئی اور اٹکھ اس شور سے کھلی تھی۔

”خالو جی! آپ کہاں گواچی گاں کی طرح پھر رہے ہیں۔ ادھر آئیں سیٹ چنے میں کریں۔“

لڑکے نے انتہائی بیزار لہجے میں بزرگوں کو پکارا تھا۔ وہ ادھر آئے تختہ دیر نگاہ سے اس پاس دیکھا اور منہ بنا کر بولے۔

”یہ کیسی جگہ ہے لی ہے تم لوگوں نے میں تو کہتا ہوں۔ اٹھا اگلے ڈبے میں چلتے ہیں۔“ انداز دانشمند اور ادراک تھا۔

لڑکے نے گہری سانس لے کر ہاتھوں پر اٹھائی اٹیچی برتھ پر دھکی پھر بولا۔

”ہاں خالو جی! جگہ واقعی بڑی ہی غیر مناسب ہے۔ اگلے ڈبے میں جانا ہی بہتر ہے مگر میں کیا کروں۔“

مجھے چلتی گاڑی میں ایک ڈبے سے اتر کر دوسرے میں جانا اور اتنا سارا سامان بھی چڑھانا نہیں آتا۔“

”جیل: اوئے بسنے مرغ کا دیگ کدھر ہے؟“

پہلوان نما مرد گھبرا کر سامان پر نظر دوڑا کہ اس لڑکے سے پوچھ رہا تھا۔

”وئے الیاس! فکر نہ کرو وہ تو میں نے اپنی سیٹ کے نیچے رکھ لیا ہے۔“

صحت مند خاتون جنہوں نے گہرے پیلرنگ کاری شیشی سوٹ پہن رکھا تھا جس کے بازوؤں اور گلے پر سرخ سبز دھاکے سے کڑھائی کی ٹکڑی تھی۔ بڑے جوش سے بتا رہی تھیں۔

الیاس جو کہ دیکھنے میں ہی خوش خوبرو لک دھائی دے رہا تھا۔ اس اطلاع سے کافی خوش ہوا اور بولا۔

”آپا انوری! ذرا سا ادھر کھڑکی کے ساتھ ہو جاؤ تو میں ادھر تمہارے برابر بیٹھ جاؤں۔“

”نہ دے، گری بڑی ہے۔ یوں سب کے سب جڑ کر بیٹھ گئے تو مر جائیں گے۔“

”نہیں اتنی ساری تو چھلکا ہے کچھ نہیں ہوتا۔ تم تھوڑی ادھر کو کھسکو۔“

”نہیں نہیں ہوتی۔“ وہ بھی اگلی سیٹ پر آگئی۔

”آپا اختر! سامان کا دیگ بھابی الیاس کو دے دو، ابھی یہاں سے چلے جائیں گے۔“

نیل نے مشورہ دیا۔ اسی وقت چودہ چندرہ سال لڑکی جو گلابی اور سبز چھوڑا دروسٹ میں بیٹھیں تھی کھڑکی کے پاس بیٹھنے کی خواہش کیا تھا کہ..... چل کر کرنے لگی۔

”نی مرن چوگی! اب میں تیرے لیے یہاں درمیان میں کھڑکی لگوانے سے تو رہی۔“

اس کے برابر میں بیٹھی دوسری دوسری صحت مند

انوں ایک ہاتھ جڑنے کے بعد بولی تھیں۔

”تو میں نے کب کہا۔ یہاں کھڑکی لگواؤ! بس کھڑکی کے پاس بٹھاؤ۔“

”بابا کوئی باغات کا سلسلہ نہیں ہے جو تم اتنی ضد کر رہی ہو۔“ نیل کو فضا آ گیا۔

”نہ میں ادھر ہی بیٹھوں گی۔“ لڑکی بھی سخت مدد کی تھی۔ شاس اور ڈائجسٹ والی لڑکی دونوں پوری طرح ان لوگوں کی طرف متوجہ ہو گئے تھے مگر انہیں ان کی باتوں سے یوں لگتا تھا جیسے اپنے کمرے کے آئین میں آئی بیٹھیں ہیں۔

”انوری! تو ادھر آ جا۔ اس چرمل کو ادھر کھڑکی کے ساتھ بیٹھنے دے۔ شاید کچھ میں شہنشاہ پڑ جائے۔“

”خالد اختر! تم دیکھ تو رہی ہو۔ میری گود میں کچھ ہے۔“ میں نہیں اٹھ سکتی۔“ ادھر سے کورا

ادب قبول ہوا۔

”گھو! تو ہی اپنی سیٹ دے دے۔“ اب خاتون نے دوسری کھڑکی کے سامنے بیٹھنے والی لڑکی سے کہا۔

وہ غالباً صلہ جو تھی۔ اٹھنے لگی مگر جیل نے روک دیا اور بولا۔

”شکو کو تو میں نے عارضی طور پر بٹھایا ہے وہاں، اصل میں وہ سیٹ میری ہے۔ میں ہی وہاں بیٹھوں گا۔“

”مجھے نہیں پتا۔ مجھے..... کھڑکی کے ساتھ بیٹھنا ہے۔“ لڑکی نے پاؤں فرش پر بیٹھے۔

”کیسے بیچوں کی طرح ضد کرتی ہے، اتنی بڑی ہو گئی شرم نہیں آتی۔“ جیل نے غصے سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”خیر اتنی بڑی بھی نہیں۔ بس قدر ذرا جلدی لبا دیا ہے۔“ اس کی ماں اختر کی بی بی نے فوراً دفاع کیا۔

”ہاں قدر لبا، عقل چھوٹی رہ گئی ہے۔“ جیل نے گھور کر بسورنی لڑکی کو دیکھا۔

”جیل اوجھلے پر اٹھوں والی پوٹلی کہاں ہے؟ نظر نہیں آ رہی۔“ الیاس بھابی بے چینی سے سیٹ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

”فکر نہ کرو الیاس بھابی! کھانے پینے کی ساری چیزیں میں نے اسٹیٹ کے ساتھ رکھی ہیں۔“ وہ مطمئن ہو کر سرشات میں ہلکا کر بیٹھ گئے۔

”میں کھڑکی والی سیٹ لوں گی۔“ لڑکی نے جو موضوع بدلتا دیکھا تو اپنی آواز میں دہائی دی۔

اب اختر کی بیگم نے نگاہ ادھر ادھر دوڑائی۔ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور ڈائجسٹ والی لڑکی کے پاس آ کر بولیں۔

”بی بی! تم ادھر ہمارے پاس آ جاؤ میری لڑکی بڑی ضدی ہے۔ اسے کھڑکی کے پاس سیٹ نہ ملی تو جینا حرام کر دے گی۔“

”جی میں؟“ لڑکی خاصی پریشان ہو گئی۔

”ہاں ہاں۔ ایسی کیا بات ہے۔ یہ سارا ڈبہ ایک ہی جگہ جا رہا ہے۔ تم اس سیٹ پر بیٹھو جب بھی اپنے شہر پر پہنچو گی۔“ لڑکی کی کھراہٹ انہیں دلیر بنا گئی۔

”مگر وہاں تو آپ کے ساتھ مرد بھی ہیں۔ میں کیسے؟“

”لو بھلا۔ تم کیا بسوں! نیکوں میں سفر نہیں کرتیں؟ اور پھر ہمارے مرد کوئی بد معاش تھوڑی

ادب خواتین 11 جلد کی طرف سے بیہوش کے لیے خوب صورت ادب



فصل غم کا گوشوارہ

رضیہ جمیل

قیمت: 800 روپے

کتابخانہ: 37 - اورنگ آباد، لاہور۔ فون نمبر: 32735021

ہیں۔

”ہاں ہاں بی بی! تم اٹھ جاؤ اور آکر خالہ اختر کی کے ساتھ بیٹھ جانا۔“ الیاس نے بھی کہا اور خالو جی بھی سر ہلانے لگے۔

شمس لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کتنی ڈری سہی اور بے بس دکھائی دے رہی تھی۔
”عجب بزدل لڑکی ہے! انکار بھی نہیں کرتا آتا۔ یوں ڈر رہی ہے جیسے نہیں اٹھے گی تو وہ قتل کر ڈالیں گے۔“

”اب اٹھو بھی کیا چلے گا ٹٹے لگی ہو؟“ اختر کی کی بیزاری اور تیزی پر عروج پر تھی۔

”نہیں اٹھیں گی۔“ آخر شمس نے کہہ دیا۔ وہ کچھ چٹکیں۔ مڑ کر مدد کے لیے اہل خانہ کی طرف دیکھا۔

”تم کون؟“ الیاس نے آنکھیں نکالیں۔
”یہ میرے ساتھ ہیں۔“ اس نے اعتماد سے جھوٹ بولا۔

”اوہ اچھا اچھا!“ الیاس صاحب اب کھڑکی سے باہر چلن میدانوں کو دھچکی سے ٹکٹنے لگے۔

”اچھا بی بی! تمہارے ساتھ ہے۔ پہلے کیوں نہیں بتایا۔“ اختر کی تنگم نے بھی یہ سنتے ہی پسپائی اختیار کر لی اور اپنی سیٹ پر جا بیٹھیں۔

لڑکی نے شکر گزار نظروں سے شمس کی طرف دیکھا۔ وہ ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے نگاہ جھکا لی۔

”بڑی گھٹنہ کیجیو میں؟“ جمیل ضدی لڑکی سے کہہ رہا تھا۔

”مجھے نہیں پتا میں نے کھڑکی والی سیٹ لینی ہے۔“ اس کی ضد برقرار تھی۔

”ایسا کرو۔“ آپا! انوری کی گود سے کا کالے کر اپنی اماں کو پکڑا اور وہ خود چڑھ جاؤ ان کی جھولی میں اور دیکھو کھڑکی سے باہر کے نظارے۔“

اس کا انداز ایسا تھا کہ شمس اور لڑکی کو بھی ہنسی آگئی۔
”اماں! سمجھا لو بھائی جمیل کو یہ ہمیشہ میری

خالفت کرتا ہے۔“

”ہاں جمیل! میری ہنسی سچ کہہ رہی ہے تم واقعی بڑا تنگ کرتے ہو۔“

”خالہ! تمہاری ہنسی کبھی عقل کی کوئی بات کرے تو میں بھی اس کی خالفت نہ کروں۔“

”میں کہتا ہوں ڈبا ٹھیک نہیں ہے۔ اگلے ڈبے میں چلو۔“ خالو جی کی سوتی غائب ایک جگہ تک آگئی تھی۔

”میں نے کب روکا ہے۔ آپ بسم اللہ کر کے اتریں آپ کے پیچھے ہوں۔“

شمس کو ہنسی آگئی۔ جمیل نے جو اسے ہنسنے دیکھا تو مسکرایا اور اشارے سے کہا۔

”ہمارے سب ساتھی ہی کرک ہیں۔“
”جمیل! میرا اچھا بھائی۔“ ذرا اٹھ کر کولر سے پانی تو نکال میرا کا کیا سا ہے۔“

”چل بھئی! پانی نکال۔“ جمیل کو یہ حکم پسند نہیں آیا آگے فرانسفر کر دیا۔

”مجھے نہیں پتا۔ میں تو آئی اسی لیے کھڑکی کے پاس بیٹھوں کی نظارے کروں گی کھجوت کوئی چیز بیچنے والا آئے گا تو میں چیز خریدوں گی۔“

”ہائے ہائے۔“ تیرے تو سارے ارمان خاک و غبار میں مل گئے۔ ایسا کر جا کے دروازے میں بیٹھ جا۔

وہاں سے نظارے بھی دیکھا اور چیزیں بھی خریدنا۔
”اوئے جمیل! کچھ کھجوت مل رہی ہے نا۔“

خالو جی اس ڈبے میں خرگیاں ڈھونڈنے میں مصروف تھے۔

”چھت؟ چھت ہی نہیں ہم جگہ مل رہے ہیں۔“

”مجھے تو لگتا ہے، چھت کمزور ہے کہیں نیچے ہی نہ آجائے۔“

”اے میں کتنی ہوں ہنسی کے ابا! اب جیسی بھی جگہ ملی ہے تک کے بیٹھ جاؤ۔“ خالہ اختر کی کوئل کے پیچھے جمیل کا اپنے شوہر کے ساتھ مذاق کرتا پسند نہیں آیا تو شوہر کو سمجھا نہ لیں۔

”شوہر! اٹھو! اٹھو! دو گھنٹ پانی نکال کولر سے میرا

لا کا بڑا پیاسا ہے۔“

شوہر چادر سنہا لیتی تھی۔ گلاس پتا نہیں کس بیک پر آدھ کیا اور جب کولر کی فونٹی کھولی تو گاڑی ایک منگے سے رک گئی۔ گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور پانی بھائی الیاس اور رونی بدوٹی ہنسی پر گر اوروں اہل بڑے۔

”گھبراؤ نہیں۔ پانی ہے۔ کوئی ایٹم نہیں گرا تم۔“

جمیل نے دونوں کو حوصلہ دیا۔

”سارے بال خراب ہو گئے۔“ الیاس کا موڈ خراب ہوا۔ ہنسی کو خشنڈے پانی سے ویسے ہی چھڑی۔

گرمیوں میں بھی کم کم نہائی تھی۔ یہ تو ایسا بخیر فیلا پانی تھا وہ بھلا کیوں کمر بھر کر کے بیٹھ جانی۔

ایسا سا کا کا کھڑکی سے باہر جھانک کر اللہ جانے کیا کر رہا تھا۔ جمیل نے انوری سے کہا۔

”آپا! یہ سارا فساد تیرے اس کا کے کا پھیلا یا ہوا ہے نا۔“ پیاس لگی نہ ہی خشنڈے پانی کے کرنے سے ہنسی زندگی کی آخری سانس لیتی۔

”اے ہے حیرے منہ میں خاک ایسی بات پر۔“ خالہ اختر بڑبڑاتی تھی۔

شوہر نے گلاس میں پانی ڈالا، انوری کو پکڑا لیا اور پھر اپنی سیٹ پر جا بیٹھی۔ ہنسی ایک ایک کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کوشش میں تھی مگر درمیان میں الیاس اور انوری کے صحت مند وجود حاصل ہو جاتے تھے۔ منہ ہانک ماں سے بولی۔

”ابھی تک تو کوئی جھاڑی والا آیا نہ کوئی چائٹ، فروٹ، یوگنوں کا ٹھنڈا دکھائی دیا۔ سارا ایشیئن

بھائیوں میں جھگڑ رہا ہے۔“

”ماں! میں تانی کے گھر جا کر بال کٹواؤں گی۔“

”صبر کرو ابھی بڑا سہتر باقی ہے۔“ ماں نے تسلی دی۔

”اماں! میں تانی کے گھر جا کر بال کٹواؤں گی۔“

ہنسی کو شاید بولے بغیر چین نہ تھا۔

اور بات وہ چھڑتی ہوئی تھی جس سے باقی

سب کو اختلاف ہو اب بال کٹوانے کا اعلان ہوا تو ماں کے علاوہ سب نے چونک کر اس کی شکل دیکھی۔ جمیل بولا۔

”ہاں تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ سر بالکل صاف کرو اور ورنہ اس میں پٹنے والی جوئیں تمہارا دماغ بھی کھا جائیں گی۔“

”خبردار جو بال کٹوائے۔ یہ شرف لڑکیوں کا شیوہ نہیں۔“ الیاس بھائی جی دھاڑے۔ انوری آپا نے اتفاق کرتے ہوئے سر ہلایا اور اختر کی سے بولیں۔

”ہوا! آپ سمجھتی کیوں نہیں ہیں بیٹی کو۔“

”یہ بیٹی کو کیا سمجھائے گی۔ اسے تو خدا بھی عقل نہیں آئی۔“ خالو جی نے لب کشائی فرمائی۔

”اچھا تم تو بڑے عالم فاضل ہو خود سمجھاؤ۔“ نیا محاذ کھلنے لگا۔

شمس نے بیزار ہو کر ادھر سے دھیان ہٹا لیا اور سامنے بیٹھی لڑکی کو دیکھا۔ اس نے ڈائجسٹ بیک میں رکھنے کے بعد سر سیٹ کی پشت سے نکال دیا تھا۔ وہ بھی اس شور کی وجہ سے بیزار تھی تھی۔

”کہاں جا رہے ہیں آپ لوگ؟“ جمیل نے شمس کو متوجہ کیا۔

”سر کو دھا اور آپ؟“ اس نے پوچھا اس سے پہلے کہ جواب میں جمیل کچھ کہتا۔ اوپر رکھے سامان میں سے کوئی چیز دھڑام سے بیچنے آ کر۔ خواتین تو جتنی ہی انھیں۔ خالو نے غائبانہ سمجھا تھا کہ چھت نیچے آ پڑی ہے۔ اس لیے ایک مردانہ جتن بھی بڑی نمایاں کی تھی۔

”یہ بیک اس جگہ کس نے رکھ دیا تھا؟ اب خالو شرمندہ ہے، اتھارہ سب کو شتر کڈاؤٹ پار ہے تھے۔“

”ہائے اس بیک میں تو میری پوزاں تھیں!“

ہنسی نے دہائی دی۔

”بس یہ ان ہی کی محسوس کی وجہ سے گرا ہے۔“

جمیل نے اعلان کر دیا۔

”آپ کہاں جا رہی ہیں؟“ وہ آپس کی لڑائی

میں مصروف تھے شمس نے لڑکی سے پوچھا۔

”سرگودھا“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”چلو یہ تو اچھی بات ہے۔“ اس کے یوں کہنے پر لڑکی نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

”میرا مطلب ہے کہ میں ان لوگوں سے کہہ چکا ہوں کہ ہم ساتھ ہیں اگر آپ میلے اتر جاتیں اور میں بعد میں تو جھوٹ پڑا جاتا۔“ لڑکی نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔

”وہاں آپ کا گھر ہے یا کسی سے ملنے جا رہی ہیں؟“

یہ سوال لڑکی کو پسند نہیں آیا۔ چہرے پر ناگواری کا اثر ابھرا اور پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

”دیکھئے میں کوئی بدبیز راہ چلتی لڑکیوں کے پیچھے چلنے والا لڑکا نہیں ہوں۔“ میٹھے کے لحاظ سے ڈاکٹر ہوں اور شریف شہری ہوں۔“

اس وضاحت سے ادھر کافی تسلی ہوئی اور چہرے پر چھائے، بیزاری کے بادل چھٹ گئے۔

”میں سرگودھا میں جاب کے سلسلے میں ہوتا ہوں۔“ چھوٹا شہر ہے۔ پرسکون ہے۔ اب تو مجھے اچھا لگنے لگا ہے۔ یوں تمہیں میں نے تو مستقل وہیں سنبھلے ہوئے کا پروگرام بنالیا ہے۔“

”میں وہاں جاب کے سلسلے میں جا رہی ہوں۔“ لڑکی نے اہستہ سے کہا۔

”اچھا دیے رہائش کہاں ہے آپ کی۔“ لڑکی نے پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن بڑی نمایاں تھی۔

”سوری شاید مجھے یہ سوال کرنا نہیں چاہیے تھا۔ اصل میں میرے لیے خواتین کوئی ممنوعہ چیز نہیں ہیں۔ تعلیم بھی ان کے ساتھ حاصل کی اور اب بھی کئی ڈاکٹر لڑکیوں سے اچھی سلام دعا ہے بس اسی وجہ سے آپ سے بھی یہ سوال کر گیا۔“

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں میں نے بڑا نہیں مانا۔ اصل میں آپ کے اس سوال کا جواب میرے پاس ہے ہی نہیں۔“

ڈاکٹر شمس کا لہجہ ہڈی کو اس پر اعتماد کرنے پر مجبور کر رہا تھا اور اس کی پرسنائی واقفی ماثرا کن اور ڈیسنٹ تھی۔

”میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد کی۔ ان کی ڈیسنٹ کے بعد میری زندگی آزمائشوں میں گھر کر رہی ہے۔ کبھی چچا کے گھر، کبھی ماموں کے ہاں۔ اب میری ایک رشتہ کی خالہ نے سرگودھا سے خط لکھا تھا۔ وہ کہتی ہیں کہ یہاں تمہارے لیے جاب کا انتظام ہو جائے گا اور تم میرے گھر کا ایک کمرہ کرائے پر لے کر ہمارے ساتھ ہی رہ سکتی ہو۔“

”خالہ ہو کر کرایہ لیں گی؟“ شمس نے افسوس کیا۔ ”وہ خود بھی کچھ زیادہ آسودہ حال نہیں ہیں میرے لیے یہی بہت ہے کہ انہوں نے میرا خیال کرتے ہوئے میرے لیے جاب کا بندوبست کیا ہے۔ آپ دعا کریں مجھے جاب مل جائے۔“

اب تو میں بہت تھک گئی ہوں۔ زندگی بے انتہا ہونے لگی ہے۔“

”نہیں اپنا نہیں سوچتے۔ زندگی تو اللہ کا ہاتھ ہے۔ اونچ نیچ ہوتی ہے۔ ان شاء اللہ بہت سی خوشیاں بھی دیکھیں گی آپ۔“

ہڈی مسکرائی اور بولی۔

”آپ ڈاکٹر ہیں اور ڈاکٹر اپنے مریضوں کو ایسے ہی انداز میں تسلیاں دیتے ہیں جس طرح اس وقت آپ نے مجھے دی ہے۔“

”بس!“ پھر رکا اور بولا۔ ”اگر پھر میں کوئی نام بتا دیں۔“

”میرا نام ہڈی ہے ہڈی علوی۔“

”بہت اچھا نام ہے آپ کا میں نے کہہ رہا تھا مرس ہڈی! کہ تم اور غوی، آزمائش تو ہر کسی کے ساتھ ہے۔ اس دنیا میں بہت ہی کم ایسے خوش نصیب ہوں گے جنہیں کوئی پریشان نہیں ہوگی۔ اب مجھے ہی دیکھ لیں۔“

ماں کو ارمان تھا کہ میں ڈاکٹر بنوں میں بہت چھوٹا تھا جب باپ کا سایہ میرے اٹھ گیا تھا۔ میرے ماموں مجھے

اور ماں کو اپنے گھر لے آئے تھے مردہ خود بھی ہال بچے دار تھے مجھ پر کہاں توجہ دے سکتے تھے۔ میری امی نے بڑی محنت کی۔ جہاں بھی کام ملا۔ انہوں نے کیا۔ برف کے کارخانے میں مزدوری کر کے ان کے ہاتھ دیکھنے لگتے تھے۔ بالکل سن ہو جاتے مردہ کام میں لگی رہتیں۔ ان پر بس ایک ہی دھن سوناسی۔ بیٹے کو دوسروں کا محتاج نہیں بنانا اس کے لیے محنت کرنی ہے، اسے یہ فخر دینا ہے کہ وہ دوسروں کے ٹکڑوں پر نہیں پلا۔ ماں نے اس کے لیے دن رات محنت کی ہے۔ مجھے اپنی ماں کی محنت، غراب محنت اور پیار کا پورا احساس تھا۔ میں نے بھی کوئی ایسی بات نہیں کی جو میری ماں کو دکھی کرے، جب میں میٹرک میں تھا تو میں نے اخبار چھپنا شروع کر دیا تھا۔ میں اپنی ماں کا ہاتھ پٹانا چاہتا تھا۔ وہ مجھے ڈاکٹر کے روپ میں دیکھا جاتا تھی اور میں جانتا تھا۔ میڈیکل کی تعلیم ملے ہوئے کے ساتھ ساتھ بھی مجھی ہے۔ میری غریب پیار ماں مجھی محنت کر لے، اخراجات پورے نہیں کر سکتی۔ بس پھر میں نے بھی دن رات ایک کر دیے۔ مزدوری بھی، مشقت برداشت کی اور پھر ایک دن وہ بھی آیا۔ جب مجھے میڈیکل کالج میں ایڈمیشن مل گیا۔ میں جہلم سے ملان آ گیا۔ وہاں اتنی دور آ کر بھی ماں ہر دم میرے ساتھ رہتی تھی۔ میں بڑی باقاعدگی سے اپنی امی کو خط لکھتا اور انہیں بتاتا۔ بس تھوڑے دنوں کی بات ہے پھر دکھ کے یہ دن ہمیشہ کے لیے چلے جائیں گے۔ ہم سب کے موسم دیکھیں گے۔ میری سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ اپنی ماں کو قیمتی لباس پہنا کر خوب بڑے سے پلنگ پر بٹھا دوں اور ان کی خوب خدمت کروں۔ انہیں اتنی خوشی دوں کہ باہمی کے دکھ ان کے لیے خواب بن جائیں۔ میں پوری کفن سے پرہیز رہا۔ میں نے نہ تو اپنے پرانے کپڑوں کی پروا کی۔ نہ ہی مجھی یہ دیکھا کہ میرے ساتھیوں کے پاس کتنے خوب صورت فائل اور بن ہوتے ہیں۔ وہ ایک وقت میں کتنے میسجے خرچ کر دیتے ہیں بس مجھ پر تو جیسے ایک دھن سوناسی۔ جی جاتا ہی دن پر لگا کر اڑ جائیں اور وہ وقت جلد آ جائے جب میں اپنی ماں کی آرزو کی تکمیل کر دوں

مگر ہڈی امیری بد نصیبی۔ دیکھیں جب میں میڈیکل کے آخری سال میں تھا تو میری پیاری ماں کا انتقال ہو گیا۔ وہ بیمار تھیں مگر انہوں نے مجھے بھی نہیں بتایا۔ وہ بیماری کی حالت میں بھی میرے لیے محنت کرتی رہیں مگر جسم کی عمارت اندر سے بہت کھوکھلی ہو چکی تھی۔ ان کا عزم ہی تھا جو انہیں یہاں تک لے آیا کہ میں آخری سال میں پہنچ گیا۔ مگر پھر وہ چلی گئیں۔ شاید میں بکھر جاتا۔ بالکل ٹوٹ جاتا۔ تعلیم ادھوری چھوڑ دیتا مگر ماموں نے بتایا میری ماں کی وصیت تھی کہ میں اپنی تعلیم ضرور مکمل کروں، بس پھر میں نے ماں کی وصیت کو دل میں اتار لیا۔ اور ایک روز میں ڈاکٹر بن گیا مگر مجھے دوش کرنے والا کوئی نہ تھا۔ قبرستان جا کر ماں کی قبر پر پھول چڑھا کر دتا اور دوسروں کا بھی کرتا رہا۔ آج اس واقعے کو تین سال گزر چکے ہیں۔ مگر میرے دل کو کسی چل قرار نہیں آتا جس جب آرام دہ مہتر پر سوتا ہوں تو مجھے ماں کی مشقت اور تھکا ہوا کمر و جسم یاد آ جاتا ہے۔ تب نیند آنکھوں سے اچاٹ ہو جاتی ہے اور میں ماضی میں کھو جاتا ہوں۔“

ڈاکٹر شمس کی کہانی سن کر ہڈی کی آنکھوں میں نمکین پانی تیرنے لگا تھا۔

”کاش میں اس عظیم عورت سے مل سکتی۔“ اس نے بے ساختہ اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔

”مجھی میری ماں بہت خوب صورت تھی مگر پھر دن رات کی مشقت نے اس سے سب کچھ چھین لیا۔ مگر میرے لیے تو وہ دنیا کی حسین ترین عورت تھی۔ وہ عظیم ماں تھی اور دنیا کو دیکھو بڑی اودھ ممانی جو بھی مردوں کو اپنے گھر رکھنے پر راضی نہیں تھیں جنہیں یہ بھی برا لگتا کہ ہم ان کے گھر کے اسٹور میں بڑے رہتے ہیں۔ ہم تو وہ وقت کی روٹی بھی اپنی محنت کی کمائی سے کھاتے تھے مگر پھر بھی ممانی اور ان کے بچوں کی آنکھوں میں ہمارا وجود بڑی طرح چمکتا تھا۔ میری ممانی کو پورا یقین تھا کہ میں بھی ڈاکٹر نہیں بن سکتا۔ وہ کہا کرتی تھیں ایسے بچکے مسکے چھوٹے چھوٹے کام کرنے والے اگر ڈاکٹر بننے لگے تو جھوٹو، قیمت کے آثار ہیں اور جب میں ڈاکٹر بن

گیا تو وہی ممانی میرے صدقے واری ہونے لگیں۔ اب اس گھر میں میرے لیے بہت جگہ ہے۔ بقول ممانی ان کی بیٹی تو میری راہ دیکھتی ہے کہ میں کب سرگودھا سے جہلم آتا ہوں، مجھے شدید نفرت ہے ان دو خالوں سے مگر میں نے بھی ان کے ساتھ سخت رویہ اختیار نہیں کیا۔ میں تو جہلم صرف ماں سے ملنے جاتا ہوں۔ اس کی قبر پر پھول چڑھاتا ہوں اور دل کی ساری باتیں اس سے کرتا ہوں۔

ہڈی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر اتنی دیر میں بٹنی نے پھر کوئی بگڑا شروع کر دیا تھا۔ انوری کا بچہ بھی گری سے گھبرا کر رو رہا تھا۔

”جہلم! ذرا اس کا منہ تو دھلا دے۔ گری سے تڑپ رہا ہے میرا بچہ!“

”اسکی دریا آئے گا تو جی لگوا دیتا۔“ جمیل نے مشورہ دینے کے بعد بٹنی کو دیکھا جو شکوے سے کہہ رہی تھی۔

”اتنی دیر سے تم کھڑی کے سامنے بیٹھی ہو۔ اب میری باری ہے۔“

شکوہ اٹھانے میں چاہتی تھی مگر خالہ انتری کی ڈانٹ نے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ بٹنی جھٹ اس کی جگہ پر بیٹھ گئی اور شکوہ کچھ پریشان کنی کھڑی ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”بیٹھ جاؤ یوں نہ اٹھائے کھڑی کیوں ہو۔“ خالہ نے ڈانٹا تو اسے بٹنی کی چھوڑی جگہ پر جمیل کے برابر میں بیٹھنا پڑا۔

جمیل نے نظر پھیر کر اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ تو وہ گھبرا کر ادھر ادھر بھڑوں کو دیکھنے لگی۔ شکوہ کیا کوئی ادھر متوجہ نہیں تھا۔ سب روتے ہوئے کاکے کو دیکھ رہے تھے جبکہ جمیل خچلا ہونٹ شرارت سے دبائے اس پر نگاہ جمائے بیٹھا تھا۔

شٹاس نے اس کی یہ شرارت اور لڑکی کا گھبرانا دیکھ لیا تھا۔ اور جب شکوہ اٹھرا کر ادھر ادھر دیکھ رہی تھی تب نگاہ ڈال کر شٹاس کی طرف اٹھ گئی۔ بہت شرم آئی اور اشارے سے جمیل کو بتایا۔ جمیل نے شٹاس کی طرف دیکھا دونوں ہنس پڑے۔

”کیا ہوا کیوں ہنس رہے ہو؟“ خالہ انتری کو دوسروں کے معاملات میں بہت جلدی دیکھی تھا ہو جایا کرتی تھی۔

”لو جی اصل سین تو دیکھ نہیں سکیں اب جو مصوم کی ہنسی دیکھی ہے تو اتنا تجس ہو رہا ہے خالہ! آپ ایک بہت خوب صورت سین نہیں دیکھ سکیں۔ وہ تو ایسا تھا کہ آپ اس پر بیٹھی بیٹھے بٹھائے دو گھنٹے کی تقریر کر سکتی تھیں۔“

”اس کا مطلب حملے! کیا ہوا تھا اور تو نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟“

”کیسے بتاؤ اور کیوں بتاتا؟“ وہ مسکرایا۔ شکوہ گھبرا کر تھی کہیں وہ کچھ ایسی بات نہ کر دے جو خالہ سب کچھ جانیں اور ہو جائے پھر اس کی شامت کا آنا، خود بھی غلطی نہ کریں گی گھر جا کر اماں کو بھی بتائیں گی۔

”خالہ! میں ادھر آ کر آپ کے برابر میں بیٹھ جاؤں۔“ وہ جمیل کے قریب سے اٹھنا چاہ رہی تھی۔

”کیوں ادھر کیا تکلیف ہے؟ اتنی گرمی میں ہم پہلے ہی اتنے لوگ بڑے بیٹھے ہیں۔ تجھے ہاتھ نہیں گون سی خالی جگہ نظر آئی ہے۔“

”اماں؟ دیکھیں تو آموں کا بار! بٹنی خوشی سے چلائی۔

”تم تو ایسے خوش ہو چکی ہو جیسے تمہاری نظر پڑتے ہی یہ آموں کا بارنگ بھلا اور ہوجائے گا۔“

”رب سامیں خیر کرے آج کل کاڑیوں کے حادثے بہت ہو رہے ہیں۔“ خالو نے غصے سے آدھ بھر کر ایک نخوس سے تاثر کے ساتھ کہا۔

”گاڑیوں کے ہی نہیں ویسے بھی بہت حادثے ہو رہے ہیں۔“ جمیل نے معنی خیز انداز میں شکوہ کو دیکھ کر کہا۔ اس کا دل زور سے دھڑکا اور چادر کو چہرے کے تھوڑا آگے کر کے بیٹھ گئی۔

”لو یہ شکوہ تو خالو جی سے بھی پردہ کرنے لگی ہے۔“ سامنے چونک وہی بیٹھے تھے۔ اس لیے جمیل نے ان کے بارے میں کہا۔ خالہ اور آپا انوری نے

وقت شکوہ دیکھا اور بولیں۔

”اے بے گناہ! اتنی قوم تیری مانی ہے اری ہاں کون سے لپے، لپٹے بیٹھے ہیں جو اتنی گرمی میں تم سے نہ لپٹ لیا ہے۔ ہمارا تو دیکھ کر ہی دم اٹھ رہا ہے۔“

”میرا تو اپنا سانس لینا محال ہو رہا ہے۔“ اسے لپٹ لپٹائے دیکھ کر جمیل نے منہ بنایا۔

”شکوہ باجی انیشین آ رہا ہے کہو تو تمہارے لیے ہل خرید لوں۔“ بٹنی نے اس ساری بات میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ وہ تو بس کھڑکی سے باہر کا نظارہ آنکھوں میں سمونے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔

”کون سی بوتل لو کی زہری یا آب حیات کی؟“ جمیل نے پوچھا۔ بٹنی نے جواب نہیں دیا۔ کندھے پر لٹکائے کوئلن پرس سے پیسے نکالنے لگی۔

شٹاس کب سے جمیل کی باتیں سن رہا تھا۔ یہ لڑکا اپنی بیٹی سے بہت کم بڑھا لکھا اور خوش گفتار دکھائی دیتا تھا۔ شکوہ بیٹنی کا بھی باقی کی خواتین سے ذرا مختلف خاموشی سی دہلی پھل تازک نقوش والی لڑکی تھی۔ شٹاس اور ہڈی ان دونوں میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گئے تھے۔

انیشین آ گیا۔ بٹنی نے مرٹھ کی بوتل اور ساتھ میں ہسٹ کا پیکنٹ خرید لیا۔ جمیل نے دیکھا تو خوب

دلچسپی لیا۔

”ہاں تمہیں بیٹھا کھانے کی ضرورت بھی بہت ہے۔ شاید اس طرح ہی کوڑا بہت ہو جائے۔ ویسے رائیجھے بھی کھانا مرٹھ اور کیم والے ہسٹ کیسے لگتے ہیں؟

”تمہارے پاس اپنے پیسے بھی ہیں جمیل بھائی! نو ذرخیلو۔“ اس نے بڑے مروت کی کھینچ کر دی۔

”کیا خیال ہے کھانا کھائیں؟ بھوک لگ رہی ہے۔“ الیاس بھائی نے ایک زور دار انگڑائی کے ساتھ کہا تھا۔

”واہ جی بھائی جی! کیا انگڑائی ہے سچ اگر بھینس بھی دیکھ لے تو شر با جائے۔“

الیاس بھائی کا لالہ رنگ، بھاری بھدا جسم جمیل نے غلط نہیں کہا تھا۔ بھینس شرماسکتی تھی۔

”ادھر دو ذرا میں بھی چکھوں! انہوں نے لک کر بٹنی کے ہاتھ سے بوتل پھینک کر منہ سے لگائی۔ بٹنی نے برے برے منہ بناتے ہوئے مدد طلب نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔ وہ بھی فوراً تیار ہوئیں۔ الیاس بھائی سے اچھے لگیں۔

”خالہ ذرا سی چھی ہی تو ہے۔ تمہاری بیٹی کی تو جان ہی لٹکنے لگی ہے۔“

”ذرا سی چکھنے میں ہی آدھی کر دی ہے تم نے۔“

”بوتلیں، ٹھنڈے شریت، لیووں پانی پیچنے والے اب ٹرین میں بھی آگے تھے شٹاس کو پیاس لگ رہی تھی۔ اس نے کوک خریدی یا ہاتھ میں لی تو نظر خالہ انتری پر پڑی۔ وہ ادھر ہی دیکھ رہی تھیں اور ان کے یوں دیکھنے سے ہی شٹاس کو خیال آیا۔ اس وقت وہ اکیلا نہیں ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی ہے اور یہ خاتون شاید یہی اندازہ لگانے کو گھور کر دیکھ رہی ہیں کہ اس کے لیے بھی کچھ خریدنا یا خود ہی چڑھا جاتا ہوں۔

”کیا لیں گی آپ؟“ اس نے ہڈی سے پوچھا۔ ”کچھ نہیں۔“ اس نے مختصر کہا کہ اس کے پاس کئی جتنی رقم بھی جسے وہ بیچا بیچا کر خرچ کر رہی تھی اب پانچویں جاب کا مسئلہ حل ہونا تھا یا نہیں تو ایسے میں وہ کوئی فضول خرچی کہاں کر سکتی تھی۔

”کوک ہی کے لوں آپ کے لیے بھی؟“ شٹاس نے پھر پوچھا۔

”بہت شکر یہ کر۔“ وہ اس سے کچھ کہے لے سکتی تھی۔ ”دیکھیے اس وقت ہم دونوں ایک ہی میز پر ہیں۔ ایک ہی جگہ جا رہے ہیں۔ اگر ان خاتون کو شک پڑ گیا کہ میں نے غلط بیانی سے کام لیا ہے تو ابھی آپ کو اٹھا کر یہاں اپنی لاڈلی بیٹی کو کھانا دیں۔“

وہ سرکاری اور خالہ انتری کی طرف دیکھا تو اپنی وہ ادھر ہی دیکھ رہی تھیں۔ شٹاس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی کوک اسے پکڑا دی۔ اور خود دوسری خریدنے لگا۔

جمیل نے شکوے سے پوچھا۔ ”بوتل بیوگی؟“ اس نے جواب نہیں دیا تھوڑا اور سٹ کر بیٹھ گئی۔

”یہ میری بات کا جواب ہے؟“ جمیل کچھ روٹھ

کر بولا۔
 ”اگر سب کو بلاؤ گے تو میں بھی لی لوں گی۔“
 ”اچھا جی، اب کل کو میں پوچھوں گا مجھ سے شادی کرو گی تو کہنا اگر سب سے کرو گے تو مجھ سے بھی کر لینا۔“
 ”تم دونوں نے کیا کھسر پھسر لگا رکھی ہے؟“
 انوری آیا نے نوٹس لیا۔
 ”کچھ نہیں۔ میں اسے کہہ رہا ہوں، اس لڑکی نے پرنس کتنا خوب صورت پہن رکھا ہے، ایسے اچھے پرنس ہمارے شہر میں ملتے نہیں ہیں یا آپ ہی لوگوں کو نظر نہیں آتے۔“
 اس کا اشارہ ہڈی کی طرف تھا۔ انوری نے بغور اس کا سوٹ دیکھا پھر منہ بنا کر بولیں۔
 ”لو بھلا، یہ بھی کوئی ڈیرا ہے اور رنگ بھی کسے ہلکے ہلکے۔ نہ ہم تو جوانی میں ہی بڑھوں والے رنگ نہیں پہن سکتے۔“
 ”جوانی میں ضروری تو نہیں کہ بندہ بالوں ہی بن کر پھرے۔“
 ”جیل! تم دو جماعتیں کیا پڑھ گئے ہو، تمہاری سوچ مت سب اسی ہو گئی ہے۔ کوئی بات ہم سے نہیں ملتی۔“
 ”میں تو شروع سے ہی آپ لوگوں سے مختلف ہوں۔ یادیں پڑوس میں رہنے والی پھوپھو عیدین کہا کرتی تھیں، مجھے تو لگتا ہے یہ بچپان لوگوں کا ہے ہی نہیں۔ کسی پڑھے لکھے کی اولاد انہو ا کر لی ہے۔“
 ”اے انہیں تو بکواس کرنے کی عادت تھی۔“
 ”میں پوچھتا ہوں، رونی کیا سامان زیادہ کرنے کے لیے ساتھ رکھی ہے۔ اتنا وقت ہونے کو آیا، ابھی تو کھانے کا دور دور تک کوئی پروگرام نہیں ہے۔“ الیاس بھائی کی سوچ پر کھانا سوار تھا۔
 ”الیاس بھائی! یہ بھی دیکھ لیں، سفر کتنا لمبا ہے، اگر ابھی سب کچھ جٹ کر گئے تو پھر بانی کا سفر آپ کس کے سہارے پر کاٹیں گے۔“
 ”فکر نہ کرو، یہاں راستے میں کچھ ایسے اسٹیشن

بھی آتے ہیں جہاں کا کھانا بڑا اچھا ہے اور پھر اسٹیشن سے آکر ریٹ بھی تو لینا ہے کہ نہیں؟“
 کے ساتھ ہی ان کے منہ میں اپنی بھری آیا۔
 ”اگر آپ میں سے کسی کے خالو پیسے ہیں آج ہی نہیں، سوئےن حلوے کا بھی کریت خرید لیں جیل نے بے پروائی سے کہا۔
 ”اماں اماں! آموں کا ایک کریت تم بھی لینا۔ گھر جا کر کھائیں گے۔“ بھتی نے اختر کی خال مشورہ دیا۔
 ”زندہ بچ گئے تو کچھ کھائیں گے۔ دیکھو یہ صبح سلامت منزل تک پہنچتا بھی ہے یا نہیں۔“ خال کے دل سے وہم نہیں جا رہا تھا۔
 ”تم نے کیا محسوس باتیں شروع کر رکھی ہیں اگر اچھا نہیں بول سکتے تو خاموش رہو۔“ ان کی اختر صاحبہ نے ڈانٹا۔
 ”کیا کروں، صبح سے آٹھ بج رہی ہے۔ میں ٹال رہا تھا۔ مگر جب ڈبے کی چال دیکھی تو گیا فٹبی اشارہ ہے جو مجھے ہوا ہے۔“
 ”خالو! اگر ایسا ہی ڈر پڑا ہے تو پھر جا کر دوسرے ڈبے میں بیٹھ جائیں۔“ جیل نے بات باتوں سے ہیزا رہو کر کہا تھا۔
 ”لاؤ، میرے صے کا کھانا نکال دو۔ چلا جاؤں گا۔“
 ”تو یہ ہے، حد ہو چکی ہے بزدلی کی۔ بیٹی اور بیٹی ادھر بیٹھی ہیں اور خود دوسرے ڈبے میں جا رہے ہیں۔ خال اختر کی کو ان کا یہ فیصلہ بے حد اگوار کیا تھا۔
 ”خالو جی! ادھر ہی بیٹھو۔ سب مل کر کھا کھائیں گے۔“ جیل نے تو اسے گھر میں کے ساتھ۔“ الیاس بھائی نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ بڑا بڑا کر رہے۔
 ”شو! چل اٹھ کر کھانا نکال۔“ الیاس بھائی کے کہنے پر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
 ”اعتنا نہ، کچھ گرا نہ دینا۔“ الیاس بھائی کافی فکر مندی کے عالم میں سانس روکے اسے دیکھ کر ڈبے نکالتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

”تم لوگوں نے کہاں جانا ہے؟“ خالہ اختر کی ہڈی سے پوچھا۔
 ”سر کو دھا۔“ اس نے شاس کی طرف دیکھا پھر بے بسی بولی۔
 ”ہم بھی سرگودھا جا رہے ہیں۔ میری پھوپھی بیٹی کی شادی ہے۔ اب بندہ پوچھے ایسی گرمی میں شادی کرنے کی کیا مصیبت پڑی ہے۔ ایک دو مہرہ جاؤ گے تو کون سی قیامت آجائے گی۔ پر جی کہا کریں، میری پھوپھی نے سارے کام ہمیشہ غلط کر دیے ہیں اور جس جگہ شادی کر رہے ہیں وہاں اس مہر میں سے کوئی راضی نہیں ہے۔ بہادری سے اور شہ جوڑا ہے لڑکے کا۔ ہم نے بڑا کہا اپنی شکو میں اس بات کی کمی ہے۔ اس جیل کو سرگودھا بھیجا کہ ہمارے پھوپھی کو سمجھاؤ وہ شو کا رشتہ لے کر نواب کے پاس پہنچ جائیں۔ باپ نہیں ہے اس کا، پر اس کی بیٹی بلکہ جیل سرگودھا میں ہی تھا کہ رشتہ ملے۔ اور یہ منگنی کی مصالحت لگا کر واپس آ گیا۔“
 شاس اور ہڈی اس منگنی کی وجہ اچھی طرح سمجھ گئے۔ دونوں نے جیل کی طرف دیکھا اور مسکرا دیے۔
 ”خیر سے کتنا عرصہ ہو گیا ہے شادی کو؟“ اختر کی ہڈی کا اگلا سوال سن کر ہڈی اچھل ہی پڑی جبکہ ادھر جیل ہی دھچکی تھی۔
 ”شادی تو.....“ ہڈی نے بچ بولنا چاہا مگر اس پہلے شاس نے کہہ دیا۔
 ”یہ دوسرا مہینہ ہے۔“
 ”دوسرا مہینہ؟“ انہوں نے سر سے پاؤں تک ہل کر دیکھا پھر بولیں۔ ”غضب خدا کا شادی کو دوسرا مہینہ ہاتھوں میں چڑیاں، نہ گلے کاں میں زیور اور کھنٹیں تو دو چار انگوٹھیاں ہی چڑھائیں۔ یہ تمہارا مہی ایسے بڑے جلے رہیں کچھ نہیں کہتا۔“
 اب تو انوری، شو اور بھتی بھی ادھر متوجہ ہوئی۔
 ”اور سب کی سب بڑی دھچکی سے اس کی تو بلی کو دیکھ رہی تھیں۔ جس کا لباس سادہ تھا اور زیور نام پر ناک میں ایک لوگ تک نہیں تھی۔ ادھر

ہڈی سے نہیں اٹھایا جا رہا تھا۔ اسے شاس کے یوں کہہ دینے پر غصہ بھی آیا تھا اور شرم بھی۔
 ”اہل میں ہم دونوں جا رہے ہیں۔ اس لیے زیور وغیرہ نہیں پہنیں۔“ شاس نے وضاحت کی۔
 ”اے تو اس وقت کون سی ڈیوٹی پر ہو تم؟“ انوری نے مذاق اڑایا جبکہ اختر کی خالہ ہڈی کو سمجھاتے ہوئے بولیں۔
 ”عورت کو زیور گہنا پہننے کے رکنا چاہیے۔ اس سے روپ بڑھتا ہے۔ اب تم اپنی صورت دیکھو، کیسی اداس اور اجڑی لگ رہی ہو اور اچھے اور انوری کو دیکھو، شادی کے اتنے برس بعد بھی کیسا روپ ہے ہمارے چہرے پر۔“
 ان کی یہ بات سن کر خالو نے آگے ہو کر خالہ اختر کی چہرے پر روپ تلاش کرنے کی کوشش کی پھر کام ہو کر اس ڈنگے کی طرف دیکھنے لگے، جس کا ڈھکن بھائی الیاس نے ابھی ابھی اٹھایا تھا اور سوچی کے حلوے کی خوشبو یہاں وہاں پھیلا دی تھی۔
 ”کھانا کھائیں گے آپ لوگ؟“ الیاس بھائی نے شاس سے پوچھا۔
 ”اس نے شاشکی کے ساتھ شہر یہ ادا کر کے پیش کش لوٹا دی۔“
 ”بھابی تو کھائیں گی، خالص دیسی سبزی سے بنایا ہے یہ حلوہ۔“ انہوں نے کہا اور پھر تھوڑا اٹھا کر منہ میں رکھ لیا تھا۔ کھاتے ہی سرور آ گیا۔ انہیں دیکھ کر بھتی حرکت خالو نے بھی کی۔ جیل نے برتن بھائی الیاس کے ہاتھ سے لے کر اپنے پاس رکھ لیا بولا۔
 ”میتھا بعد میں کھایا جاتا ہے۔ آپ لوگ آغاز ہی میٹھے سے کر رہے ہیں۔“
 ”او چھوڑو، یا، ان اصولوں کو۔ میں تو کہتا ہوں بندے کا جس طرح جی جاوے وہ کھائے، کھانے میں یہ پابندی اب مجھے اچھی نہیں لگتی۔“
 ”جیل نے شو سے کچھ کہا۔ وہ پراشے کباب اور اٹھ کے نکال کر پیٹ میں رکھنے کی پھر یہ پیٹ جیل نے شاس کی طرف بڑھا دی، اس نے انکار کیا تو بولا۔
 ”میں جانتا ہوں آپ تکلف سے کام لے

رہے ہیں۔ سفر بہت لمبا ہے، کچھ کھائیں اور پھر اس
رشتے کے بارے میں سوچیں جو آپ دونوں کے
درمیان ابھی اچھی قائم ہوا ہے۔“
اس کی آواز دھیمی اور شرات سے پرستھی شمس
نے حیرت سے اسے دیکھا تو مسکرا دیا اور بولا۔
”میں تو پہلے ہی سمجھ گیا تھا مگر کھرا میں نہیں،
خالہ سے نہیں کہوں گا۔“ شمس نے ہنس کر پلیٹ اس
کے ہاتھ سے لے لی اور بولا۔
”بہت شارب ذہن ہے آپ کا۔ سچ تو یہ کہ
مجھے آپ بہت اچھے لگے ہیں۔ سوچ رہا ہوں
ایڈریس لے لوں اور اس سفر کے بعد بھی آپ سے
رابطہ رکھوں۔“
”ضروری تو میرے لیے بہت خوشی کی بات
ہے۔ آپ میرا ایڈریس لے لیں اور اپنا ٹھکانہ دے
دیں۔ اب تو رابطہ رہے گا اور یہ بتائیں کباب کیسے
بنے ہیں پسند آئے آپ کو؟“
”کیوں آپ نے بنائے ہیں۔“ شمس مسکرایا۔ جیل
نے شگ کی طرف آنکھ سے اشارہ کیا پھر بولا۔
”ایک ہی بات ہے۔“
”ناں، کیا ایک بات ہے ساری محنت ہم عورتوں
نے کی اور اب تم لوگ کہہ رہے ہو۔ ایک ہی بات ہے۔“
باجی انوکھو کھلا سرچ پہنچا تھا اس بات سے۔
”یہ حلوہ میری بیوی نے بنایا ہے، وہ حلوہ بڑا
اچھا بنائی ہے۔“ بھائی الیاس نے ایک بار پھر حلوہ پر
حملہ کیا۔
”جی ہاں بھائی جی نے یہ شادی کی ہی اس لیے
تھی کہ ان کے حلوے کی بڑی شہرت سن رہی تھی۔“
جیل کی بات پر بھائی الیاس بڑے بھرپور
انداز میں مسکرائے پھر بولے۔
”میں صرف حلوے کی بات نہیں۔ وہ سہی پائے
چھو لے اور تمہاری بنانے میں بھی جواب نہیں دیتی۔“
”زن مرید ہے پورا۔ چنانچہ بیوی نے کیا
گھول کر بلا دیا ہے، ہمارے میاں نے یوں بھی
ہماری تقریریں نہیں کیں اور تمہارے میاں کو دیکھ کر تو

لگتا ہے اسے سرے سے تم میں کوئی دلچسپی
نہیں، قصور تمہارا بھی ہے یوں اجڑے طے
رہتی ہو دیے کیا کرتا ہے تمہارا میاں؟“
خالہ اختر کی اپنی سیٹ سے اوجھرنے لگی
سوال کر رہی تھیں۔
”ڈاکٹر ہیں۔“ اس نے مری مری آواز
جواب دیا اور چپکے سے ایک نظر شمس پر ڈالی۔
تو یہ ساری باتیں نہیں سن رہا، شکر کیا وہ جیل کے
باتوں میں لگا ہوا تھا۔
”اچھا ڈاکٹر ہے؟“ خالہ اختر کی انداز
سناٹن تھی بولیں۔ ”میں تو پہلے ہی پہچان گئی تھی
ڈاکٹر ہے یا پھر وکیل، اے بی بی! ڈاکٹروں کے
تو نہیں بھی کام کرتی ہیں تم ذرا ہوش میں رہا کرو
اپنی آنکھیں کھلی رکھو۔“
”خالہ! کیوں ان کی ہنسی کھینچتی زندگی کو
کرنے لگی ہو۔“ جیل نے ایک نظر گھبراہٹ سے
پر ڈالی اور پھر مسکراہٹ دیا کہ خالہ اختر کی سے کہا۔
”تم چپ رہو۔“ انہوں نے بڑی جوش
ڈانٹا پھر دوبارہ ہنسی کی طرف متوجہ ہوئیں۔
رسالہ کھول کر درمیان سے ہی کوئی افسانہ بڑھنا شروع
دیا۔ خالہ کو اس کی یہ حرکت بہت بری لگی۔ منہ ہاتھ
انوری کی طرف دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں دونوں
کے درمیان گفتگو ہوئی جس کا کباب باب یہ تھا کہ
خاصی بددماغ سے البتہ میاں لے کر خارج والا ہے۔
”اماں! ملتان کب آئے گا؟“ جیل نے کہا
سے انصاف کرتے ہوئے برقرار اس سے سوال کیا۔
”کیوں کیا سرگودھا کے پتھر ایسے ملتان اتنے
ارادہ کر لیا ہے اگر یہ بات ہے تو اچھا ہے۔ شگ
چاری کو بھی اپنی سیٹ واپس مل جائے گی یہاں
چاری بڑی تنگ ہے۔“ وہ شگ کی کھراہٹ اور
سمٹانے سے محظوظ ہو کر کہہ رہا تھا۔
”مجھے وہاں سے سو دن حلوہ اور تھکے خریدنے ہیں
”دونوں ہی کھانے کی چیزیں، تم کھانے
کے علاوہ بھی کچھ سوچ لیا کرو۔“ جیل نے سخت برا

کہتے پہنچنے کے لیے خریدنے ہیں۔“
اس نے وہ باتیں دیکھ کر تپ کے بناتے بھی
”اس نے ہنسی کے ہنسی کے ہنسی اور بڑے
سوال کر رہی تھیں۔
”ڈاکٹر ہیں۔“ اس نے مری مری آواز
جواب دیا اور چپکے سے ایک نظر شمس پر ڈالی۔
تو یہ ساری باتیں نہیں سن رہا، شکر کیا وہ جیل کے
باتوں میں لگا ہوا تھا۔
”اچھا ڈاکٹر ہے؟“ خالہ اختر کی انداز
سناٹن تھی بولیں۔ ”میں تو پہلے ہی پہچان گئی تھی
ڈاکٹر ہے یا پھر وکیل، اے بی بی! ڈاکٹروں کے
تو نہیں بھی کام کرتی ہیں تم ذرا ہوش میں رہا کرو
اپنی آنکھیں کھلی رکھو۔“
”خالہ! کیوں ان کی ہنسی کھینچتی زندگی کو
کرنے لگی ہو۔“ جیل نے ایک نظر گھبراہٹ سے
پر ڈالی اور پھر مسکراہٹ دیا کہ خالہ اختر کی سے کہا۔
”تم چپ رہو۔“ انہوں نے بڑی جوش
ڈانٹا پھر دوبارہ ہنسی کی طرف متوجہ ہوئیں۔
رسالہ کھول کر درمیان سے ہی کوئی افسانہ بڑھنا شروع
دیا۔ خالہ کو اس کی یہ حرکت بہت بری لگی۔ منہ ہاتھ
انوری کی طرف دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں دونوں
کے درمیان گفتگو ہوئی جس کا کباب باب یہ تھا کہ
خاصی بددماغ سے البتہ میاں لے کر خارج والا ہے۔
”اماں! ملتان کب آئے گا؟“ جیل نے کہا
سے انصاف کرتے ہوئے برقرار اس سے سوال کیا۔
”کیوں کیا سرگودھا کے پتھر ایسے ملتان اتنے
ارادہ کر لیا ہے اگر یہ بات ہے تو اچھا ہے۔ شگ
چاری کو بھی اپنی سیٹ واپس مل جائے گی یہاں
چاری بڑی تنگ ہے۔“ وہ شگ کی کھراہٹ اور
سمٹانے سے محظوظ ہو کر کہہ رہا تھا۔
”مجھے وہاں سے سو دن حلوہ اور تھکے خریدنے ہیں
”دونوں ہی کھانے کی چیزیں، تم کھانے
کے علاوہ بھی کچھ سوچ لیا کرو۔“ جیل نے سخت برا

حاصل کر لیا۔
”اتنے لوگ ہیں یہ۔“ شمس نے مسکراتی آنکھوں
کے ساتھ ہنسی کی طرف دیکھا۔ اور دوسرے سے کہا۔
جواب میں وہ کچھ نہیں بولی۔ سرگودھا اچھا کیا۔
”زندگی یوں تو نہیں گزرتی، تہا اور اداسی، کیا خیال
ہے آپ کا؟“ ان لوگوں کی باتیں شمس کو ایک ہی اور
روشن راہ دکھائی گئی۔
”میرے خیال سے کیا ہوتا ہے ہوگا تو وہی جو
قسمت میں لکھا ہے۔“
”مگر یہ بھی سچ ہے کسی حد تک قسمت ہمارے
ہاتھ میں بھی ہے، ہم اپنے عمل سے اپنی زندگی خوب
صورت بھی بنا سکتے ہیں اور بد صورت بھی۔“
”وہ لون ہوگا جو خود اپنے آپ کو برباد کرے۔“
ہنسی نے اس کی بات سے اتفاق نہ کرتے ہوئے کہا۔
”اپنی سچ ہے۔ خود سے دشمنی جانتے ہو بھٹے نہیں
کی جاسکتی مگر ہمارے غلط فیصلے ہی ہمیں تمام عمر کے
افسوس میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اسی لیے سیانے کہتے ہیں
پہلو تو پھر بولو۔ ہنسی ہم ایک دوسرے کے لیے بالکل
اچھی ہیں۔ مگر ہم میں ایک بات مشترک ہے اور وہ ہے
ہماری تنہائی اور تنہائی زندگی کا بہت بڑا دکھ ہے، دکھ
انسان کو انسان کے قریب کر دیتے ہیں۔ اگر آپ میری
بات پر غور کریں بغیر جلی جاؤ گی تو یقین کرو، مجھے تمام عمر
افسوس رہے گا۔ صرف اس لیے نہیں کہ آپ نے مجھے
ٹھکرا دیا بلکہ اس لیے بھی کہ آپ خلوص کی قدر نہیں کر
سکیں اور دنیا کی جھیل میں پھرا لیا رہ گئی۔“
اس کے لیے میں سچائی اور گہرائی تھی۔ یہ پہلی نظر
کی محبت کی بات نہیں تھی۔ یہ تو ایک سے حالات تھے جو
انہیں ایک دوسرے کے اتنے قریب لے آئے تھے۔
”آپ تو کامیاب ڈاکٹر ہیں آپ کے لیے
رشتوں کی کیا کمی۔ ایک سے ایک خوب صورت
امیر لڑکی آپ کو مل سکتی ہے جبکہ میں نہ تو خوب صورت
ہوں اور نہ ہی امیر۔“
”آپ میرے لیے تو بہت خوب صورت ہیں،
میں ایسی لڑکی کو لے کر کیا کروں گا جس کا چہرہ تو حسین

بھائی صاحب کا کھر ہے وہ کون سا سمندر پار رہے ہیں۔

”بات سمندر پار کی نہیں ہے۔ بات میرے دل کی ہے۔“

”دیکھو نانہہ۔“ بلال نے خود کو تھوڑا اٹھنڈا کیا۔

”اگر گرد خانے ہمیں ایک چیز دی ہے تو۔۔۔“

”خدا کا خوف کریں بلال وہ کوئی چیز نہیں ہے میری اولاد۔ میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔“ نانہہ نے بات مکمل نہ ہونے دی۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ بلال نے اپنے جذبات کو کچھ قابو کیا اور لسا سانس کھینچ کر بولا۔

”دیکھو، اللہ تعالیٰ نے ہمیں چار بچے دیے ہیں۔ اور بھائی صاحب خالی ہاتھ ہیں۔ اگر خیرا، بھائی اور بھابھی کی کوکود میں ڈال دیں تو ہمارے پاس خیرا، شاہ میرا اور شاہ نیل تو ہیں ناں اور ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ کو

”اوسر آؤ۔ یہاں بیٹھو اور میری بات غور سے سناؤ۔“ بلال نے نانہہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس لایا۔

”اگر تم تھوڑا دل بڑا کرو تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ نانہہ تو رہی ہو سب کتنے خوش ہیں۔ اسی بھی یہی بات تھی اور بھائی، بھابھی انہیں تو لگتا ہے جیسے نبوت الہی کی دولت ملنے والی ہو اگر تم مان جاؤ تو۔“

بلال نے بڑی امید سے نانہہ کی طرف دیکھا۔

”اس کے تاثرات میں ذرا براہ تبدیلی نہ آئی وہ بس خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ اب بلال رنج ہوا اور ذرا تیز لہجے میں بولا۔

”اب کیا تم میں کھگھنایا ڈالے بیٹھی ہوئی ہو۔“

”میرا خیال ہے کہ میں آپ کو جواب دے چکی ہوں اور پھر اب بھی وہی جواب ہے یہ ناممکن ہے۔“

”جواب کچھ ممکن ہے بس اسے تمہاری ضد ناممکن بنا رہی ہے۔“

بلال کے ضبط کا پیمانہ کم ہو گیا۔

”خدا کہاں بلال! یہ تو میری التجا ہے۔“ نانہہ کہہ رہی تھی۔

”مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ ساتھ تو

خالہ اختر نے پوری آنکھیں گھما کر پھر بدلی کے چہرے پر گاڑ دیں اور بولیں۔

”ابھی تو کہہ رہے تھے دوسرا امینہ ہے۔“

بدلی نے گڑبڑا کر جمیل کی طرف دیکھا وہ مسکرا کر بولا۔

”خالہ ان کے ہاں سا لگہرہ جمنیوں کے حساب سے منائی جاتی ہے۔“

”اب ہم ایسے اونیسی نہیں ہیں، مجھے تو پہلے ہی شک تھا یہاں شیاہ کچھ نہیں ہوا۔ دل میں کچھ کالا ہے۔“

”تو اور کیا نہ زور نہ لگتا۔ ایسی ہوتی ہیں بھلاہ نہیں۔“

باقی انوری نے بھی وار کیا۔

”پڑھی لکھی دلہنیں ایسی ہی ہوتی ہیں اور دو مہینے والی بات تو شرما کر ڈاکٹر صاحب نے کہہ دی تھی۔“

اصل میں دوسرا سال ہے ان کے پیادہ کو۔“

خواتین کو جمیل کی بات پر یقین نہیں آیا وہ کچھ مشکوک بنی تھیں اور جمیل ان سے کہہ رہا تھا۔

”بہت مبارک ہو اب آپ میں واقعی محبت بھی ہو چکی ہے، جیسی تو دنیا والے نظر بول رہے ہیں۔ یہ گھرے پیار اور خوب صورت محبت کی نشانی ہے۔“

آپ ان نظروں کی پروا مت کریں، میرے اور شو کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دیں۔ ہماری محبت چھلے پھولے اور کامیابی سے ہمتا رہے۔“

”ہماری دعا میں آپ کے ساتھ ہیں۔“

دونوں نے یک زبان ہو کر اس شخص لڑکے کو دیکھا۔

سفر تو چند گھنٹے کا تھا مگر کھانا دیکھا دیکھا دیکھا دیکھا۔

اس سفر میں تمام عمر کا سفر مل گیا۔ اچھا دوست ملا اور زندگی کے رنگ بدلنے لگے، سیکے سیکے خیال پر رنگوں کی جگہ شوخ چمک دار زندگی کی نوید دیتے رنگوں نے لے لی اور ان رنگوں کی تازگی نے چہروں اور روح کی ساری محسوس دور کر دی۔ موسم اب بھی وہی ہے مگر ہوا میں جس اب تک آتی ہیں تو گرم نہیں ہوتیں۔ یہ سحر محسوس ہوتی ہیں اور یہ سارا عجاظ محبت کا ہے۔

ہو مگر دل میرے درد کو سمجھنے سے قاصر ہو۔ وہ دولت میرے کس کام کی جس کے ساتھ سکون نہ ہو۔ مجھے تو ایسا سا گھبراہٹ ہو جیسی صبح اور جذبات رکھتا ہو۔“

نیل دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب تو لڑکی کو سمجھا رہے ہیں، اس کی طرف مائل ہیں۔ مگر وہ کچھ بے یقین ہے شاید جھجک رہی ہے، وہ اپنی سیٹ سے اٹھائیں کے پاس بدلی کے سامنے آکر اہوا اور بولا۔

”غلوں کی قدر کریں اور خوب صورت لمحوں کو ہاتھ میں لے کر مٹی اس زور سے بند کر لیں کہ یہ لمبے ہمیشہ کے لیے قید ہو کر رہ جائیں۔ میں یہ مشورہ پورے غلوں سے دے رہا ہوں، آپ سوچ رہی ہوں گی

”تو کون میں خواہنا؟ ایسی بات نہیں ہے، اصل میں، میں تو ہر کسی کی بھلائی چاہتا ہوں۔“

”سب کا دوست اور دشمن کسی کا نہیں۔ آپ کو کہیں اور اچھی دوست کچھ کر مشورہ دے رہا ہوں مجھے پورا یقین ہے آپ دونوں بہت خوش رہیں گے۔“

بدلی نے نکلیں اٹھا کر شمس کی طرف دیکھا۔ وہ امید اور یقین کے ساتھ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

بدلی نے مسکرا کر سر جھکا دیا۔ شمس نے کچھ آنکھوں کے ساتھ جمیل کی طرف دیکھا وہ بس پڑا اور بولا۔

”ڈاکٹر صاحب! آپ نے تو عمر کتابوں میں گنوا دی ہے۔ جبکہ ہم کتابوں کے ساتھ ساتھ چہرے بھی پڑھتے رہے ہیں اور اس لیے پورے یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ سوئی صدر اسی ہیں۔“

”کیا واقعی؟“ شمس نے براہ راست بدلی سے جواب چاہا۔ وہ بولیں یہ بات کبھی جھجک رہی تھی۔

”جیل نے کہا۔“

”وقت مت گنواؤ لڑکی۔ بلکہ وقت کی قدر کرنا سیکھو۔“ تب اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”آپ دونوں کو بہت مبارک ہو۔“ جمیل نے پرجوش انداز میں خاصی اونچی آواز میں کہہ دیا۔

”کس بات کی مبارک باد؟“ سب متوجہ ہوئے۔

”آج ان کی شادی کی سالگرہ ہے۔“ اس نے بات بتائی۔



یہ عمل پسند آئے اور.....

نامہ بات کا سننے ہوئے تقریباً چیخ کر بولی۔

”بلال! آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حرا کے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہم اس کی کمی باقی بچوں سے پوری کر لیں گے۔“

”بلال! آپ کیوں نہیں سمجھتے، وہ میرے جسم کا حصہ ہے۔ اگر جسم کا ایک حصہ کٹ جائے تو باقی جسم اس کی کمی پوری نہیں کر سکتا۔“

نامہ کی آواز شدت جذبات سے پھٹ سی گئی۔

”بس! میں ایسا کچھ نہیں ہونے دوں گی چاہے اس کے لیے مجھے آخری حد تک کیوں نہ جانا پڑے۔“

میں آخر تک لڑوں گی چاہے تم مجھے اپنی زندگی سے کیوں نہ نکال دو مگر میں اپنی جی کی کوئی نہیں دوں گی۔“

نامہ آنکھوں میں سیلاب لیے کمرے سے نکل گئی۔ اور اپنے جیسے ہکا بکا شوہر چھوڑ گئی۔

بلال تقریباً صوفے پر گر سا گیا۔ یہ نامہ اس کی

من پسند فرماں بردار بیوی کیا کہہ رہی تھی۔ کیا ان کا

تعلق اتنا کمزور تھا۔ وہ ایسی تو نہ تھی وہ تو اس کی ہر

خواہش بن کہے جان جاتی ہر بات یوں مانتی جیسے

اصل ہو۔ اس کا پیار، غصہ کوئی چیز اس پر اثر کیوں

نہیں کر رہی تھی۔

وہ اسے کس مشکل میں ڈال گئی تھی۔ اس کی سمجھ

میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اگر ایک طرف من

چاہی ہو جی سی تو دوسری طرف باپ جیسا بھائی تھا۔

بس نے زندگی میں صرف دیا ہی تھا۔ مانگا کچھ نہیں تھا

اور اب اگر مانگ ہی لیا تھا تو وہ کیسے انکار کرتا۔

بھائی صاحب کی شادی کو بارہ سال ہو گئے تھے

مگر ابھی تک اولاد کی خوشی سے محروم تھے نہ تو اکثر

چھوڑے اور نہ ہی عامل با بے مگر سب بے سود۔ آخر

تھک کر انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی کے سامنے

اپنی جھولی پھیلائی تھی۔ تو وہ کیسے انکار کرتا؟ یہ ایسا

نہیں تھا کہ اسے اپنی اولاد سے محبت نہ تھی۔ مگر بھائی

کی محبت کا پلڑا زیادہ بھاری تھا۔

بھائی بھی وہ جس نے باپ کی کمی محسوس نہ

ہوئے دینی تھی۔ ہر چیز مانگنے سے پہلے مہیا کی تھی۔

سوچ سوچ کر دماغ درد سے بھرنے لگا۔

اور دوای کی تلاش میں جوں ہی بچن کی طرف

لگا تو سیز جیوں پر ہلکی زبردستی میں اسے نامہ نظر

جائے اور دوای کا ارادہ موقف کرتے ہوئے اس

ایک بار پھر بات کرنے یا پھر محبت کرنے کا فیصلہ

اور جیسے اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

باتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر جیسے نئے سرے

نہیہ باندھنے لگا۔

”دیکھو نامہ میں یہ کب کبہ رہا ہوں کہ ہم

نامہ نے اس کی بات درمیان سے کاٹ

اور تھکے ہوئے لہجے میں بولی۔

”میں تو یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ اب میری زندگی

پر سکون ہے۔ اب اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی مگر

یہ بھول گئی تھی کہ اکثر بیٹیاں ماؤں جیسی قسمت

پیدا ہوتی ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ بلال نے نامہ بھنے والے انداز

میں دیکھا۔

”میں بہت چھوٹی تھی چھ سال یا ڈیڑھ سال

کی۔“ نامہ نے دھیرے سے کہا۔

”ہمارے گھر میں بھی بالکل ایسے ہی حال

تھے۔ ہمارے تایا بے اولاد تھے اور بد قسمتی سے

ان سے بہت محبت تھی۔ اتنی محبت تھی کہ اس میں

اپنی اولاد کو بھی بھول گئے۔ پاپا نے مجھے تایا کی گود میں

ڈال دیا۔ مجھے یہی بتایا گیا کہ وہ میرے والدین ہیں

سب ٹھیک رہا۔ وہ میرا احاطہ کے زیادہ خیال رکھتے

کسی چیز کے لیے نہ ترنا پڑا اور نہ کوئی خواہش دیا

پڑی۔ میں آٹھ سال کی تھی تب چاہیں گیا ہوا ایک

تایا اور تائی کو اپنا گھر نامہ لگنے لگا۔ انہیں

کاروبار اور چاندی کے لیے وارث اور بڑھاپے

لیے ہمارے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ اور

میں ان کی بہنو بن گئی۔ جب بابا لوگوں نے منع

چاہا تو انہوں نے بس اتنا کہا۔

”مجھے لگتا ہے کہ تم لوگوں کی نظر میرے کاروبار

پر ہے۔“

بابا خاموشی سے وہاں سے اٹھ آئے مگر

میں بھی ساتھ لے آئے۔ میرا خیال تھا کہ تایا

اس بات کو نہیں ہونے دیں گے۔ وہ مجھ سے دور نہیں

کے گرد و شاہد اسی انتظار میں تھے۔

وقت گزر رہا تھا کہ اب دوسری شادی ہو گئی اور

وارث بھی مل گیا۔ میں اسے بہن، بھائیوں اور

اس کے گھر آ گئی۔ نئے اسکول میں ایڈمیشن ہو گیا

ہوتے۔ کپڑے، کھلونے ہر چیز نئی آ گئی۔ کچھ

ادب سب کچھ معمول پر آ گیا۔ لوگ اس واقعہ کو

لے لگے بابا اور تایا کے تعلقات ختم ہو گئے۔

والوں کو سب ٹھیک نظر آنے لگا۔

مگر اس واقعہ کا ہم کردار تو جیسے کسی کو نظر ہی نہ

اس سب میں میں کہا تھی؟ میں نے کیا محسوس

کیا میرے دل پر کیا گزری؟ کسی کو اس بات سے

کلیں رکنا نہ تھا۔ اوپر سے تایا اور تائی کا رویہ جیسے

ایسا ایک جہت کے لیے اجنبی ہو گئی اور میرے گئے

اب باپ بہن، بھائی اور شاہد ان کے لیے بھی۔ کئی

سال ان سب کے دل میں کتنی جگہ نہ بن سکی۔

بلال بتائیں مجھے کہ کیا آپ اس بات کا تصور

کرتے ہیں کہ آپ کے ماں، باپ بدل جائیں

اپنی کے آٹھ سال جنہیں آپ اپنا سب کچھ محسوس

کرتے ہیں وہ برائے ہو جائیں۔ اجاگ نہایا جائے کہ وہ

کچھ نہیں کھتے تو آپ کس کرب اور تکلیف

کس کے لیے اس کا درد محسوس کر سکتے ہیں۔

”میں بالکل نہیں.....“ وہ رک کر خود ہی

دل۔

”آپ انہوں کے دکھ کو بھی خود محسوس نہیں

کرتے۔ انہوں میں اگر کوئی گھائل ہوا تو وہ میں تھی۔

میں لوں تھا جسے میری بھری دنیا میں اکیلی رہ گئی ہوں

میں بے گھر تھی۔ اس گھر میں میرے بہن

میں تھے میرے جیسا ماں باپ تھے مگر میں کسی کے

میں کو نہیں سمجھتی تھی۔ اس گھر میں تو مجھے جگہ مل گئی مگر

میں زندگی کسی کے دل میں جگہ نہ بنا سکی۔ میں جو

اس کی سب سے ڈین اسٹوڈنٹ تھی ایک کلاس

میں دو سال لگانے لگی۔ میں جو تکیوں کی طرح اڑتی

تھی۔ ایک دم سہمی گئی اندر سے خالی ہو گئی۔ کتنے

سال اس درد، تکلیف سے نکلنے میں لگے۔ آپ سوچ

بھی نہیں سکتے۔ رفتہ رفتہ تایا کی جگہ سے تعلقات سمجھی

بحال ہوئے تقریباً سب کچھ پہلے جیسا ہو گیا۔

”اگر نہیں بدلا تو میرے اندر کا موسم تھا۔ ساسری

دوریاں سٹھ گئیں۔ نہ ہوا تو وہ میرے اندر کا

خلا تھا یہ خلا تب کم ہونا شروع ہوا جب میری آپ

سے شادی ہوئی۔ آپ کی لوجہ اور محبت اس خلا کو باقی

رہ گئی۔ اور اب ہوتا میرے اندر کا درد کم ہونے لگا۔ مگر

جب آپ نے حرا کو بھائی صاحب کی گود میں

ڈالنے کی بات کی تو مجھے لگا وہ حرا نہیں میں ہوں جو

ایک بار پھر آزمائش سے گزر رہی تھی۔“

نامہ باقاعدہ کچھ بولیں سے زور ہی تھی۔

”بلال! آپ نے ایک بار مجھے بھری ہوئی کو سمجھنا

سے اب دوبارہ وہ دم ہواؤں کے سپرد مت کریں۔

یہ مجھے ڈالنے جائیں گی۔ اب مجھ میں نہ ہمت ہے

اور نہ برداشت کا حوصلہ۔“

اس نے بلال کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

”خدا را یہ ظلم مت کریں۔“

بلال جیسے ایک دم ہوش میں آیا اور بے سار خستہ

اس کے جڑے ہوئے ہاتھ پکڑ لیے۔

”تم کیا کر رہی ہو۔ بس چپ کر جاؤ۔“

”نہیں پہلے آپ وعدہ کریں ایسا کوئی فیصلہ نہیں

کریں گے جس کے لیے مجھے ایک بار پھر بل صراط

سے گزرنے پڑے۔“ نامہ نرمے ہوئے لہجے میں بولی۔

”ماں میرا وعدہ ہے ایسا کچھ نہیں ہوگا۔“ بلال

نے نامہ کو بازوؤں میں پیچھے ہونے کہا۔ ”جیسے ستم

چاہتی ہو سب دیا ہی رہے گا۔ اب کوئی دکھ ہمارے

پاس نہیں آئے گا۔“ حقیقتاً آج بلال نے نامہ کے

گرم کو اپنے دل پر محسوس کیا تھا۔

رہا تھا کہ بھائی صاحب کو دوسری شادی کے لیے رضا

مند کرنا مشکل تو ہے مگر نامہ نہیں اور اگر ایسا نہ تھی ہوا

تو وہ ایک بار پھر نامہ کی کہانی نہیں دہرائے گا۔



وقار

عظیم

پاکستانی یوٹوبسٹ



گل ارباب

ڈاکٹر

مقام

سب سے چھوٹے نہیں ہوتا

کہا دیتی ہیں کہ بٹیا، اس گھر کو کبھی باؤا کا گھر نہ بھٹا، وہ ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر لاڈ سے بولی تو مور جانہ نے دھکا دے کر پرے ہٹایا۔
”تیرے یہ ہی ڈرامے تو مجھے پسند نہیں۔ یہ قصوں کہانیوں والی زندگی صرف کتابوں میں ہی ملتی ہے۔ ایسی زندگی ڈھونڈنے لگے گی تو پاؤں میں ہی نہیں دل پر بھی چھالے پڑ جائیں گے۔“
وہ مور جانہ کی بات سن کر ٹھٹھکا کر ہنس دی اور ان کی گھوڑیاں نظر انداز کرتے ہوئے شریر لہجے میں بولی ”وہیے تم کھا کر بتا میں مور جانہ! اگر ایسی اچھی نہیں۔ ہر ملک کے ملاوٹ چین کے کھانے ہوتی ہیں۔ ملائیشیا کے قومی کھانہ۔ ہر چیز اس میں دی دنیا سمیت کراس کتاب میں سائی ہوئی ہے۔“
وہ ذہن پر زور دے کر سٹگتا لگی۔

”چھوڑ دے پٹینے اس اللہ ماری کتاب کا پچھا، ہزار بار کہا ہے کچھ گھرداری سیکھ لے، پرانے حقیقت میں بیٹھی ہے اور ذرا سا تکیہ لگنے سے اس گھر جاتا ہے تجھے، تیرے داہی نے خانہ ماں نہیں دینا بھینس۔“
پٹینہ نے ڈائجسٹ بک کے نیچے بڑے سلیقے پر لایا گھر کہہ کر نفسانی طور پر بیٹیوں کو یہ

”سو نات چاندی نہ کوئی محل جان من
تھہ کو میں دے سکوں گا۔۔۔۔۔“

اب کی بار مور جانہ نے تھکے اٹھا کر لشکارے
مارتا ڈا بجٹ نکالا اور اسے مارنے ہی لگی تھیں کہ وہ
ترپ کر چیل کی طرح چھین اور ان کے ہاتھ سے
ڈا بجٹ کھینچ کر بیٹے سے چنایا۔

”دیکھ لے اس مانی کی بیوی کو، کہیں چوٹ
شوٹ تو نہیں لگ گئی۔ اگر لگ بھی گئی ہوگی تو اس نے
لبے بالوں کو جھکوا دے کر کہتا ہے۔ جا تجھے معاف کیا
مارنے والے۔“

وہ سرورق پر مسکراتی حرامانی کی تصویر پر نری
سے انگلیاں پھیرتے ہوئے حیرت سے ماں کی
طرف دیکھ کر بولی۔

”واہ مور جان! خود تو ڈراے قلمیں سب
دیکھیں اور مجھ غریب کا ڈا بجٹ پڑھنا گوارا نہیں۔
نہ آپ پڑھنے دیتی ہیں نہ ہی داہی کے سامنے پڑھ
سکتی ہوں۔ اچانک نہیں پڑھتے ہوئے دیکھ بھی گئیں
تویوں گھورتے ہیں جیسے ان کی نوازی ڈی میں نے
کہیں چھپائی ہو۔“

مور جانہ اکثر داہی کی نوازی کی ڈیبا چھپا لیتی
تھیں اس وقت تک، جب تک کہ داہی برداشت کر
سکتے تھے، دوسری صورت میں کسی کو بیچ کر بازار سے
دوسری منگوا لیتے یا وہ ان کے مسلسل سرور پر ترس
کھا کر ڈیبا سامنے رکھ دیتیں۔

”یاد ہے نا، گل بانو کو اس کے شوہر نے طلاق
کیوں دی تھی؟“ مور جانہ نے طنزیہ انداز میں پوچھا
تو اسے وہ سب یاد کر کے ہنسی اٹھی۔

”وہ تو سراسر ظلم کیا تھا اس یوسف خان لالہ نے
گل بانو بھائی پر۔ اس میں ڈا بجٹ پڑھنے والیاں
ویسے ہی بدنام ہو گئیں۔“

وہ ڈا بجٹ دوبارہ سے تکیے کے نیچے رکھ کر
پوئی تو مور جانہ نے اسے گھورتے ہوئے جواب میں
خ انداز میں کہا۔

”یوسف خان کا قصور نہیں تھا۔ وہ صبح چار بجے

ساری رات کا سفر کر کے ٹرک لایا اور پانچ
سامان اتارتا رہا۔ پانچ بجے گھر آکر سو گیا
ساڑھے چھ بجے نئی نوٹی بیکم نے اس کتاب میں
کہانی کی ہیروین بن کر اسے اٹھانے کے
گرم چائے کی پیالی میں اس کی انگی ڈیویدی
اسے شرارت کہنے والی دہن بیکم کو توجہ دیا
میاں کو اٹھانے کا یہ طریقہ افسانوی ہے لیکن
پتا کہ افسانے کی ہیروین پیالی میں چائے چٹی
کر پانی اور دودھ ڈالتی ہے، پڑے سے بچنے کے
اور پیڈروم کے درمیان ایک بڑا سالادونج حائل
اور پانچ منٹ اسے اپنے میک اپ کو ٹھیک کر
میں بھی لگتے ہیں۔ جب وہ میاں کی انگی چائے
ڈیویدی سے جگاتی ہے تو چائے کی بلی کی شیم گری
سے سکون ملتا ہے۔ جبکہ یہاں پہلے ڈیویدی شہر کی
پسند کی کھوکھ کے چائے بنتی ہے۔ دو پیالی دودھ میں
پتی ڈال کر اتنا ابا لو کہ خبر سوئے شہر کی انگی
چل جائے۔ چائے تھما س ہے ڈال دیتے ہوئے
اندازہ تو ہوا ہوگا کہ اگلی ہوئی چائے اور پھان
بچ ہے لیکن پھان بھی انسان ہوتے ہیں بے
تخت جان ہوتے ہیں۔“

مور جانہ کی بات سن کر وہ پھر ہنسنے لگی۔

”مور جانہ آپ نے تو نہیں دیکھا لیکن اس دن
یوسف لالہ کی انگی پر جو ڈا بجٹ پڑھا تھا وہ
ایک ایک کو دکھا رہے تھے اور گل بانو بے جا
شرمندہ اپنی ہی بغل میں منہ چھپا کر بیٹھی تھی
”ہاں افسانوں کی لڑکیاں تو پھر یوں ہی کرتی
ہیں نا؟“

مور جانہ کے طنز پر وہ پوچھ بیٹھی۔
”آپ کو کیسے پتا کہ افسانے کی لڑکی کیا کرتی
ہے؟ کبھی کبھی پتا بھی نہیں پڑھی پھر بھی نہ جانتے
کیوں ساری مائیں افسانوں کی لڑکیوں سے
واسطے کاہر رکھے ہوئے ہیں؟“

”بھئی نہیں مگر اندازہ تو ہے نا۔“
وہ بھی تو مور جانہ کی پیشین گوئی بھی ماں۔

”کل بانو کے ہاتھ میں بھی تو ہر وقت یہ ہی
کتاب ہوتی تھی۔“ انہوں نے ڈا بجٹ کی طرف
الٹا کر تے ہوئے کہا۔

”مور جانہ! اس کے عمل سے تو نہیں لگتا کہ اس
نے ڈا بجٹ پڑھے ہی ہیں۔ پڑھنے والیاں کھیتی
مرد ہیں اور پتی بھئی ہوں، جتنا بندہ پڑھنے سے سیکھتا
ہے اتنا جینے سے بھی نہیں سیکھ پاتا، مطلب یہ کہ زندگی
ملائی انگی جلائے پڑو نہیں دی تھی۔“

مور جانہ نے اپنی اور جی کے پلو سے ہاتھ میں
کلائے شیشے کی دھندلاہٹ صاف کی اور اپنے ڈھلتے
من کو سرت بھری نظروں سے دیکھنے لگیں۔

”ہاں تو وہ کون سا حقیقت پسندی والا کام کیا
تھا اس نے۔ افسانوی ہی تھا نا۔ ارے دیکھ کر ٹھنڈی
ہی نا کہ یوسف خان کو گھٹک کا انکیشن۔ لرزے
والے بخار میں ابھی اس کی آنکھ کی ہی تھی کہ گل بانو بی
لی سرتاج کے منہ سے لاف بھڑا کر بولیں۔

”سرتاج چائے پی لیں۔“ اس دن کے بعد
چائے میں انگی ڈیوئے سے توبہ کر لی تھی کیونکہ
سارے گھر میں جو اس کے ہاتھ میں چائے کی پیالی
دلیا، انہی انگلیاں چھپانے لگتا تھا۔ اس بے خوف
نے اپنے لیے بیکے بالوں سے جھپٹے ٹھنڈے پانی کے
قلم اس لرزے کے بخار میں تھے مریض پر یوں
گرائے جیسے گرمی کی شام ہم کچے آٹھن میں مٹی پر
پانی کا چھڑکاؤ کرتے ہیں۔

مور جانہ کو حال ہی میں انفیکشن کی وجہ سے بخار
واہ تھا اور انہوں نے چار چار کمبلوں میں گھس کر بھی
گھن نہیں پایا تھا، اس لیے بات کرتے ہوئے، انہیں
ٹھنڈے جھرجھری سی آتی تھی۔

”ہاں، تو اس میں گل بانو کا اتنا قصور تو نہیں تھا
کہ طلاق ہی دے دیتے وہ۔“

”ہاں ہاں۔ ایک سو تین بخار میں لرزے کی
حالت میں تیرے داہی پر سے کبل بٹا کر میں بالوں
سے پانی سیدھا ان کے منہ پر پڑاؤں تو وہ ہیر کی طرح

اجھل کر ٹپ ٹپ برے پانی گانا تو نہیں شروع کریں
گے بلکہ سدا ہی کریں گے جو یوسف نے کیا۔“
”داہی کی اتنی ہمت؟“

وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی تو مور جانہ قریب آئیں۔
”یہ تم کوئی جادو وغیرہ تو نہیں سیکھ رہی ہو جو
بڑبڑاتی رہتی ہو؟“ مشکوک نظروں سے دیکھتے
ہوئے سوال کیا۔

”میں مور جانہ! اس ڈا بجٹ میں بہت سارے
دلفیے بھی ہوتے ہیں۔ میں اچھے رزلٹ کے لیے وظیفہ
پڑھتی ہوں۔“ وہ بچوں کی طرح انہیں سمجھا رہی تھی۔
”کوئی ایسا وظیفہ ہے جو بیٹی سے ڈا بجٹ کا
نشر چھڑا دے؟“

ان کا معصومہ بن کر پوچھنا پیشین گوئی نہ کیا گیا لیکن
وہ بتا کچھ کے بات ختم کر کے اندر چلی گئی۔ جاتے
ہوئے صحن میں پڑی چار پیالی سے ڈا بجٹ اٹھانا
نہیں بھولی تھی۔ اس کے پسینہ پڑے ناول سالم کی نئی
قسط آئی تھی اور وہ بے قرار تھی کہ کچھ مزید ناقابل
یقین واقعات پڑھنے کو ملیں گے۔

کھلتے ہوئے سنہری مائل گورے رنگ، اونچے
لبے قد کے ساتھ جھکی آنکھوں اور سنہرے بالوں والی
پیشین گوئیں ہی سے بہت پڑے لکھے اعلا عہدوں پر
فائز لوگ اچھے لگتے تھے۔ اس پاس کے سارے مرد
پڑھ لکھ کر اپنی زمینداری وغیرہ کرتے تھے۔ وہ چاہتی
تھی کہ اس کی شادی جس سے وہ وہ ان سب مردوں
سے جدا اور منفرد ہو۔ اعلا تعلیم کی ڈگری کے ساتھ اس
کے نام کے ساتھ اعلا افسر بھی لکھا ہو۔

وہ ہزار خوبیوں کو نظر انداز کر کے آس پاس کے
سارے لڑکوں کو پسند کر رہی تھی۔

”توبہ ہے ودانہ! تم شہباز لالہ سے شادی پہ
کتنی خوش لگ رہی ہو مشکل پرائیوٹی بی اے پاس
ہیں وہ۔“ وہ اپنی چچا زاد دوا کو پچھڑا رہی تھی۔

”میرے لیے تو جب تک کوئی اعلا تعلیم یافتہ
بہت بڑا آفسرنہ آیا ہیں نے شادی وادی نہیں کرنی۔
بندے کے پاس اعلا تعلیم کی ڈگری نہ ہو تو سب کچھ

ہوتے ہوئے بھی شہر نظر آتا ہے۔ وہ اپنے آئینہ میں ہر دو بارے میں دیکھتے ہوئے کہتی۔
 آج بھی ڈائجسٹ پڑھتے پڑھتے تھک کر سینے پر رکھتے ہوئے وہ اسے تصویر کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔
 وہ جو اس کی فینڈس چرانے آیا تھا اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر واپس چلا گیا۔

☆☆☆

”پیشینہ! مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“ وہ ابھی رچرنگ کھول کر نوٹس دیکھنے کی سعی کر رہی تھی۔ اس کی پہلی گھونٹ نے رازدارانہ انداز میں قریب آ کر کہا تو اس کی خیالات کی دنیا میں ہلچل مچ گئی۔ وہ مسلسل جو سوچتی آ رہی تھی اسے لگ رہا تھا وہ سب کچھ ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ چند دنوں سے اسی ایک مسئلے کے انتظار میں ہی بااس کی طرف دیکھتی تھی آج وہ بول پڑی تھی۔ اس سے بڑی بات کوئی نہیں تھی۔ اس کے آس پاس جیسے گھنٹیاں ہی بجنے لگیں۔

”یقیناً یہ مجھے اپنے مندرجہ بھائی کا یہ پیغام دینا چاہتی ہے کہ اسے مجھ سے پہلی نظر میں ہی محبت ہوئی ہے اور وہ اپنی جان کو ہمارے گھر بھیجتا چاہتا ہے۔ اتنی آسانی سے تو کوئی دولت یا نالہ کی بیرونی نہیں مانتی۔ میں بھی پہلے تو ذرا بے تحاشے شخص سے دکھاؤں گی پھر اس کے بھائی کی خودکشی کی دھمکی اور گھونہ کی منت سماجت پر مان جاؤں گی۔“

وہ تصور میں از رنگ خان کی گہری نیلی آنکھوں کے حرم میں دوڑتے ابھرے سوچ رہی تھی کہ گھونہ کی آواز نے اسے خیالوں کی حسین وادی سے بچھ کر سیدھا حقیقت کے تپتے صحرا میں پیچیدہ دیا جہاں دشمنات امیدوں کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے اب اللہ جانے دونوں میں جیت کس کی ہوتی ہے اگر غرضے جیت گئے تو میں ہار جاؤں گی اور امیدیں جیت گئیں تو خدائے اپنی موت آپ ہی مچ جائیں گے۔

”کہاں ہو یا ایک راز کی بات کرنی تھی مجھ سے۔“ وہ شدید قسم کے اشتیاق کو دبائے کی کوشش میں اور لا پرواہ نظر آنے کی اداکاری کرتے ہوئے اور

ایک ننگ کر گئی۔

”ٹھیک ہے، تجھے دیکھی نہیں تو میں نہیں بتاتی۔“ اسے احساس ہوا کہ تجھ کو ایک ننگ کم کرنی تھی اس لیے نوٹس بیک میں رکھ کر اشتیاق ظاہر کیا۔
 ”بول دے اب۔“ مجھے تجھ سے ہورہا ہے۔“
 اس کی دھمکی لکھ لکھ تقریریں کر گئی تھی گئی غیر متوقع بات سن کر پیشینہ نے گال لال ہو گئے۔
 ”یار! میرے بیک میں دو کر کرے رکھے ہوئے ہیں، کہیں اسکیلے پیٹھ کر ان نندیلوں سے چھپ کر کھاتے ہیں۔ اوکے؟“ وہ خود شروع سے ہی بہت سے نندیلی تھی۔

آج پہلی بار اسے کھو دا پہاڑ اور نکلا چوہا والی کہادت ٹھیک سے سمجھ میں آئی تھی۔ دو چار مہر کے گھونٹ اوپر نیچے پیتے ہوئے وہ اس کے ساتھ چل پڑی۔
 دونوں کالج کے لان میں قریب ایک صدی پرانے برگلہ کے پیڑ تلے بیٹھ کر باتیں بھی کرتی جا رہی تھیں اور منہ بھی چل رہا تھا۔ پہلی چالی لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے وہ بھائی کے قصیدے پڑھ رہی تھی اور وہ جو پہلے ہی اس کے ستارن میں سے تھی مزید اپریس ہو رہی تھی۔

اچانک گھونہ کے سامنے رکھا پیٹ کو اٹھا کر لے گیا اور گھونہ بے اختیار کپکپ کے چپچپے بھانکے کی پیشینہ پیٹ کپڑے پھینکتے پھینکتے پڑی ہوئی تھی۔ اب کو اس سامنے لگے جاس کے پیڑ پر بیٹھا تھا۔ نظروں سے گھونہ کو گھور کر دیکھتے ہوئے جیسے پوچھ رہا ہو کہ اسے کس روپ کی چیز کے لیے ایسا نندیوں والا رویہ؟ تم انسان بھی نہ۔

”یہ بتاؤ، کیا ارادے ہیں۔ بھائی تو باہر سے آ گیا ہے اب کچھ ہلا گلا بھی کرنا ہے یا نہیں؟“ اسے خود ہی کریدنا پڑا۔

”ہاں یار! ارادے تو نیک ہیں لیکن اب دیکھا ہے کہ لالہ کیا کہتے ہیں۔ داجی اور مور کوئی نے لال سے کہہ دیا ہے کہ خاندان کی جولا کی آپ پسند کریں گے ہم اسے بیاہ لائیں گے۔ جلدی فیصلہ کر کے بتاؤ کیونکہ اب ہم مزید انتظار نہیں کر سکتے، چٹ مٹ گئی۔“

ہلکا ہوا کر رہی تھی۔

”تو انہوں نے کیا جواب دیا؟“
 اب کی بار وہ اندھا اشتیاق نہ چھپا پائی۔
 ”انہوں نے کل تک کا وقت مانگا ہے فاسل اب دینے کے لیے۔ لیکن ایک بات میں نے لوٹ کی ہے یار!“

وہ پرسوج انداز میں اب بھی درخت پر بیٹھے کوئے کو گھورے جا رہی تھی۔
 ”وہ کیا؟“ جلدی سے پوچھ کر وہ اپنی جلد بازی پر شرمندہ ہو گئی۔

”وہ یہ کہ لالہ جب سے آئے ہیں، اسی مقصد سے لڑکی کی تلاش میں خاندان کے کئی گھروں میں جا چکے ہیں، کہیں چائے پر اور کہیں کھانے پر لیکن جس دن جلا لقمہ لوگوں کے گھر سے واپس آئے ہیں۔ کچھ کھوئے کھوئے رہے رہے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے ان کا کچھ کم ہو گیا ہو۔“ وہ عیام سے لہجے میں یہ بات کر کے دوسرا ایک کھول رہی تھی۔

گھونہ کی بات سن کر اس کا دل کچھ زیادہ ہی چڑی ہو گیا اور اسے دھڑکنے لگا تھا۔ ہمیشہ سے بہت بڑے لیے اور اعلا عہدوں پر فائز لوگوں سے وہ متاثر ہوتی تھی اور گھونہ نے اسکول اور کالج میں اپنے بھائی کی تحریکیں کر کے اسے غائبانہ اس کے پسندیدہ ترین لوگوں میں شامل کر رکھا تھا۔ اس کی کوئی بھی نئی کامیابی پیشینہ سے ضرور شیئر کرتی تھی وہ اسی کی زبانی اسے علم ہوا تھا کہ بھائی بہت قابل اور سختی بھی ہے، سارے خاندان میں کوئی ایسا نہیں تھا۔

”ارے تمہارا چہرہ کیوں اس قدر لال ہو رہا ہے کہیں بخار یا خورق تو نہیں؟“
 وہ جبریاتی سے اس کے سرخ گالوں کو ہتھیلی سے ہموار دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”نہیں یار! ایسے ہی شاید چوہ تیز ہے۔“ اس نے تپتے ہوئے گالوں کے ٹھٹھے رنگ چھانے کے لیے اپنے نیچے کر لیا اور اس سے دو قدم اگے چلے گئی۔

☆☆☆

مکینا

بہنوں کا اپنا مہمانہ

لاہور

فروری 2020 کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

فروری 2020 کے شمارے کے ایک بولی

ہر گھر کے لیے ماحولیات کا

☆ ”روشن ہونیں یادوں کی شمعیں“ رمال کا کردار

☆ ”وہ اک ستارہ مہربان“ رشما کا مکمل دل

☆ ”کھانا بپا رہے“ ساسی کی کاکل بول

☆ ”واسی“ مریم ہادیہ کا مکمل دل

☆ ”اے عشق قضا نہ کرنا“ شفیق انور کا ناول

☆ ”تیرے نام کی ٹھوکر“ کنیز زہرہ کا ناول

☆ ”یادِ نوبھار“ میوش طالب کا ناول

☆ ”عشاءِ بختی“ عزیز ایوب، اقرار الیاس، فیض مصطفیٰ

☆ ”سیا عالم اور گفتہ شاہ کے فسانے“

☆ ”اسیرِ عشق“ سدرۃ الحسنی کا سلسلہ وار ناول

☆ ”امید صبح جمال“ ام مریم کا سلسلہ وار ناول

☆ ”اس کے علاوہ“

پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں، انشاء ناہ، عید کے پکوان، مہندی کے رنگ اور وہ تمام مستقل سلسلے جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں

☆ فروری 2020 کا شمارہ آج ہی اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب کریں

کلائی میں موجود کانچ کی رنگ برنگی چوڑیوں سے کھیلنے ہوئے وہ ان کی چمن چمن سے لطف نہیں لے سکتی تھی کیونکہ باہر کے سارے موسم اور مظاہر اندر کے اچھے موسموں کی تازگی سے مشروط ہوتے ہیں۔ اس رات بھی وہ بچھکی کئی راتوں کی طرح بے چین رہی۔ اسے نیند ہی نہیں آ رہی تھی۔ پہلی پہلی بار دل نے دھڑکننا سیکھا تھا۔ بھی جاتی آنکھوں کے خوابوں میں نئے نئیوں والا شہزادہ ازدرک خان سفید گھوڑے پر بیٹھ کر اس کے دروازے پر آتا تو بھی وہ دلہن بنی سرخ اور سفید پھولوں سے مزین جگہ عروسی میں اسی شہزادے کی منتظر بیٹھی کھوکھٹ کی اوٹ سے سچے سچے کمرے کا جائزہ لیتی۔ ایک خواب تو اس کی جذبات سے مزین آنکھوں میں جیسے ٹھہر سا گیا تھا وہ شہزادے کی بانہوں میں بائیں ڈالے سر سبز شاداب وادیوں کی بیکر کر رہی تھی یکا یک ایک پہاڑ سے گرتے جھرنے کے قریب کھلے سرخ اور گلابی پھولوں میں سے سب سے حسین پھول کا انتخاب کر کے شہزادہ محبتوں کے غمار میں دو بے نشین اور نشیلمے لہجے میں کہتا ہے۔ ”جانم! اس پھول کی آتی اوقات نہیں کہ یہ تمہاری حسین زلفوں میں سج کر اپنی قیمت بڑھائے لیکن میری خواہش ہے کہ میں یہ پھول ان ریشمی زلفوں کی نذر کروں۔

وہ شہزادہ اس کی زلفوں میں پھول سماتا ہے تو وہ پھول کی تیز اور حراکنیز خوشبو سے مسحور ہو جاتی ہے۔ لیکن جلد ہی اسے احساس ہوتا ہے کہ یہ خوشبو تو اس کے محبوب شہزادے کے ہاتھوں کی ہے پھول تو اس کے سامنے قطعی بے وقت ہے۔

فضا میں چھٹی روتی کا سبب اس کی آنکھوں کی چمک اور ہواؤں سے سرگوشیاں کرنی جلتے رنگ اس کی ہنسی کی بدولت ہے۔

وہ جانتی آنکھوں کے خوابوں کو اپنی آنکھوں کا اثاثہ سمجھ کر ہلکوں کا پہرہ لگاتے دیکھتا دنیا دنیا سے بے خبر ہو گئی تو وہ پھر سے خواب میں آ گیا۔

”تم تھی حسین ہو چینی۔ یہ تمہاری ریشمی زلفیں تھیں

چاہتا ہے ان کو اوڑھ کر سو جاؤں اور پرکھی نہ انھوں۔“ اس نے شر باتے ہوئے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”یوں تو نہ کہیں نا ازدرک خان“ وہ اٹھ اٹھا ہوئے بولی۔

”تمہارے لب لعلیں سے نکلا ہوا میرا نام معتبر ہو گیا ہے۔ یقین کرو، مجھے تو خود پر رشک آ رہا ہے۔“

”چشمینے! اٹھ بھی جا بیٹا!“

ماں نے اس کی پیشانی پر ہونٹ رکھے تو وہ تڑپ کر بولی۔

”ایسا تو نہ کریں یہ گناہ ہے۔“ مور جانے نہ جھنجھوڑا ”کیا دل بول رہی ہو اب اٹھ بھی جاؤ۔“ وہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ بیٹھی مگر خواب کا سرور ابھی تک جسم و جاں کو اپنے حیرت منجنے جکڑے ہوئے تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے انگڑائی لی اور ماں کے گلے لگ کر ان کا گل چوم لیا۔

”تمہاری آنکھوں کی لالی کئی دنوں سے چغلیاں کھا رہی ہے کہ تم نے شہزادی بھائی کی ذات ڈانچست پڑھے ہیں۔ دیکھو میری بیٹی! یہ لالی خواب بچتے ہیں اور ان خوابوں کی خریدار معصوم لڑکیوں کے تعبیروں کے تعاقب میں نکل پڑتی ہیں۔ ایک لڑکیوں کے انتظار میں ہی شکاری گھات لگاتے لگتے ہوتے ہیں ان شکار بولی کی پہچان یہ ہے کہ خوابوں سے بھی حسین تعبیروں کے لالچ کا دانہ ڈال کر محبت کا جال بھینکتے ہیں۔ اس جال میں پھنسا ہوا ہی سب سے پہلا خرچ وہ شکاری عورت کا گاتے ہیں بلکہ گاتے بھی نہیں ہیں، چھین لیتے ہیں۔

پھر نہ آنکھیں روتی ہیں نہ خواب اور نہ ہی تعبیروں کی امید۔“ مور جانے کو تو مروج چاہے تھا اس کی کہاوتوں پر سارا الزام لگاتے کا۔ بھی یوسف اللہ کی بیوی کی طلاق۔ کبھی یمینو کی شادی نہ ہونے سبب اور کبھی اپنی چچا زاد بہن کی بیٹی کی پسند کا رشک ہونے پر خود ہی کا الزام۔ ان سب کی وجوہات الگ تھیں، جس مشترک تھا تو ان ساری لڑکیوں کا

البت پڑھنا۔ وہ آج کوئی جواب دیے بغیر نظر میں آتے ہوئے کانچ کے لیے تیار ہونے چل دی۔ لالی کی پھٹی حس کسی طوفان کی خبر پا چکی تھی۔ ایسی لالی کی لالی اور پھر غیر متوقع خاموشی طوفان سے لالی اس کی خبر دے جاتی ہے۔ وہ دل میں اٹھتے اٹھتے کے طوفان پر قابو پانے کی کوشش کرتے اٹھتے اس کا بستر ٹھیک کرتے نکلیں۔

☆☆☆

”آج دیر کر دی تھی تم؟“

وہ بڑی بے قراری سے کانچ کے گیٹ کے کمرے میں گھونڈی راہ دیکھ رہی تھی، اس کے اندر ایک کمرہ کی بے چینی نے پھیل ہی چامھی تھی۔ اسے اس مور ہوا تھا جیسے برسوں میں خون کی جگہ خواہشات کی دلدلی ہوئی ہے، جس اس کے دل کی دھڑکیں دھڑک رہی ہیں۔

”ڈانچست میں کتنا مزہ آتا ہے ایسے سبز جگہ ہوتے۔“ اس کے اندر سے کسی نے صدا لگائی وہ مسکراتے ہوئے گھونڈا کے بند ہونٹوں کی طرف دیکھنے لگی، ان لبوں پر تلے کیوں لگے ہوئے ہیں؟

”سوری بار! تمہیں انتظار کرنا پڑا۔ اصل میں ازدرک اللہ منہ اندھیرے ہی واک کے لیے نکل گئے ہیں، ان ہی کا انتظار کر رہی تھی۔“ وہ ازدرک خان کے نام کے ساتھ مزید کچھ سنتا چاہ رہی تھی لیکن گھونڈے کچھ نہ کہا۔

وہ چپکے چپکے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتی رہی۔

”جانے کیا کہا ہوگا ازدرک نے؟ یہ منہ سے کچھ پھوٹی ہی نہیں ہے کھائی نے کس لڑکی کا نام فاضل کیا ہے۔ آج سے قبل گھونڈے سے کبھی اتنی بری نہیں لگی تھی اس وقت لگ رہی تھی۔

”بھوتی کہیں کی۔“ وہ اس کے گلابی چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑاتی۔

پھٹی کا وقت ہوا تو جیسے گھونڈے کو کچھ یاد آ گیا وہ اٹھتے ہوئے مڑ کر عام سے انداز میں بولی۔

”شام کو ہم سب آرہے ہیں تم لوگوں کے گھر۔“ اور ایک بڑا خوب صورت ساسر پرانز ہے جو تم سب کو حیران کر دے گا اور تمہیں تو بہت ہی خوشی ہوگی۔“

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور پوچھتی، اس کی گاڑی نکل چکی تھی، وہ دھڑکنوں کے خوشگوار گیتوں پر سر دھتی خوابوں کے اڑن گھوڑے پر بیٹھ کر محبت کی حسین اور پراسرار وادیوں کی یہ کوکل چکی تھی۔

”دل چننے ہے کیا جاناں! یہ جاں بھی تمہاری ہے۔“ گنگناتے ہوئے اس نے دھوپ میں جھکتے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اطمینان بھری لمبی سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

پشینہ اپنے والدین کی اکھوتی بیٹی تھی جبکہ بھائی دو تھے اس کے بابا اور تایا جنہیں وہ بڑے داجی بھی تھے ایک ہی گھر میں رہتے تھے، کھاتے پیتے خاندانی لوگ تھے ان کے علاقے کی اچھی روایات میں سے ایک روایت یہ بھی تھی کہ..... شادیوں کے بعد بھی بھائی اپنے پورشن بنا کر ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ جوائنت فانی خستہ نے سب ہی رشتوں کو جوڑ رکھا تھا، خاندان ٹوٹے نہیں تھے بلکہ آج بھی مشران خاندان کے بڑے بیٹے کو بنایا جاتا تھا، جس کے ہر فیصلے پر سب راضی رہتے۔ ان دونوں بھائیوں اٹلس خان اور عسکر خان کی ایک چھوٹی بہن شاہ گل میں جو دوسرے شہر میں بیانی ہوئی تھی۔ ان کے شوہر کا اچانک ہارٹ اٹیک سے انتقال ہو گیا تھا اور اس کے دو بیٹے ہی اب ان کی بیوی کا سہارا تھے۔ بھائی ہر طرح سے بہن کی دل جوئی کرتے لیکن وہ شوہر کے مرنے کے بعد بہت اداس رہنے لگی تھیں۔ ہمیشہ تھی سمراتی اکھوتی بہن شاہ گل کو اس طرح اداس دیکھنا بھائیوں اور بھابیوں کو دکھی کر دیتا تھا لیکن ان کے کس میں کچھ نہیں تھا۔

بڑے داجی عسکر خان کی ایک ہی بیٹی دو دانہ تھی، اللہ نے بڑے داجی کو تین بیٹے دیے لیکن بچپن میں ہی وہ ایک پر اسرار بیماری کا شکار ہو کر فوت ہوتے رہے۔ دو دانہ کی پیدائش پر سب کے دل غدشات سے بھرے

ہوئے تھے کہ جانے یہ پہنچتی ہے یا نہیں۔ اس کو معمولی بخار بھی ہو جاتا تو والدین اس کے ماتھے کی حرارت ہل میں کئی کئی بار چیک کرتے۔ لیکن وہ پوری طرح سے ایک صحت مند بچی تھی۔ یوں تو وہ پشیمینہ سے دو سال بڑی تھی لیکن دونوں میں بہت دوری تھی۔ پشیمینہ کے دونوں بھائی چھوٹے تھے اس لیے بڑی بہنیں انہیں زیادہ لطف نہیں کرتی تھیں۔ ان دونوں کزنز کی ساری دلچسپیاں یکساں تھیں سوائے ڈائجسٹ ریڈنگ کے۔ دو دانشور تھیں اور میک اپ وغیرہ سے دلچسپی بھی جبکہ پشیمینہ کو ساری چیزوں سے پہلے ڈائجسٹ پڑھنے کا شوق۔ بلکہ جنوں تھا۔ چھوٹے بھائی چھیڑتے۔

”اگر چہیں نہ بنا کر دے تو اخبار والے سے کہہ دوں گا اس مہینے سے ہمارے گھر ڈائجسٹ دینے بند کر دے۔“

وہ دانت کچکاچی چپس کی پلٹ لا کر اس کے سامنے رکھ دیتی۔ بھی چائیس کی قربانی تو بھی پسندیدہ ڈرامے کے دوران اسی قسم کی دھمکیوں سے ڈر کر ریویوٹ الی کے ہاتھ میں دے کر بورنگ کرکٹ دیکھتی پڑتی۔ سارے گھر والوں کو اس کی دھمکی رگ معلوم بھی ڈائجسٹ کے لیے اس سے سارے کام کر دائے جاتے۔

”شام کو گولڈن اور از رک لوگ آرہے ہیں بی بی گل نے فون کیا تھا کہہ رہی تھیں کہ لالہ اور وہ بھی آئیں گے۔ لالہ تو کہیں آتے جاتے نہیں ابھی خراب صحت کی وجہ سے۔ ضرور کوئی خاص بات ہوگی۔“ پشیمینہ کی مورجانہ نے شام کی چائے پر بتایا۔ وہ لوگ کھانا چائے وغیرہ سب ایک ہی جگہ پر بیٹھ کر آکھٹے کھاتے پیتے تھے۔

”کچھ بنانا ہے تو ابھی سے بتا دوں چاچی! ہم فری ہو کر گولڈن سے کپ شپ کریں گے۔ مہمانوں کے سامنے بچن میں۔ گھر رہنا اچھا نہیں لگتا۔“ پشیمینہ کے کہنے پر سب مسکرا دیے۔

”میں کون سا گولڈن سے صدیوں بعد ملو گی ایک بی کاٹن اور ایک بی کلاس میں ہوتے دونوں۔ لیکن شاید تمہیں یہ بات یاد نہیں رہی ہے نا؟“

”ہاں ہم تو کالج پڑھنے کے لیے نہیں گئے شپ کے لیے ہی تو جاتے ہیں نا؟“

”جتنے نمبر لگے ہو ریٹس میں، اس سے کہی لگتا ہے کہ کپ شپ کے بعد ازراہ مذاق کوڑی بہت پڑھائی بھی ہوئی جاتی ہوگی۔“

وہ پیچھے مڑی اور ماں کی طرف یوں شکایتی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔

”تم بھی بروٹس؟“ ذہن دول میں ایک ہی خیال بار بار اکر رہا تھا۔

”سو فیصد میرا ہاتھ بائٹنے ہی آرہے ہیں وہ لوگ، اب مورجانہ سے کیسے کہوں کہ خرے نہ دکھائیں۔ بیٹی تو دل و جان سے پہلے ہی ان کے بیٹے کی ہو چکی ہے۔“

وہ سوچتے ہوئے جیسی مسکراہٹ یوں سے ہٹا ہی نہیں پار رہی تھی۔

اسے پچھلے ہفتے کی وہ شام اچھی طرح یاد تھی جب وہ داغی دروازے کے قریب ہی ایلیڈیرا کے پودے کو پانی دے رہی تھی۔ ہاتھ میں پانی کا پت پکڑے پکڑے اس نے دروازہ کھولا۔ باہر گاڑی کھڑی کر کے وہ اندر داخل ہوا۔

”کون ہیں آپ؟“

اس نے سر سے پاؤں تک محو رہے ہوئے پوچھا۔

”از رک خان ہوئی آپ کی رشتہ کی خالہ کا بیٹا اور گولڈن کا بھائی۔“ وہ بڑی محنت سے اپنا تعارف کر رہا تھا۔

بے شمار کہانیوں اور تاؤ پر پڑھے، وہ سارے سین کیے بلند و بالا اس کی آنکھوں کی دلیز پر آکر بیٹھنے جا رہے تھے۔

”کتنا خوب صورت ہو گیا ہے۔ یہ اس نے بچپن میں دیکھا تھا از رک خان کو لیکن کسی کی ایسی بھی کایا پلٹ سکتی ہے، اسے یقین کرنا دشوار لگ رہا تھا۔

ارے آپ وہی از رک ہیں نا جسے چوٹی جیسے منہ اور بڑے بڑے ذیلیں کی وجہ سے سب ڈوڈو بھائی کہتے تھے؟“

اس کے پر اشتیاق مگر بے وقوفانہ سوال پر جو جوابی منہ ہاتھ

اس احساس ہوا کہ وہ کچھ غلط کہہ گئی ہے۔

”اور آپ وہی چنگی ہیں نا جو سارے خاندان میں مشہور تھی۔“ چشیاں کاٹنے کی وجہ سے؟“ اس نے اس کی ادھار نہیں چھوڑا تھا۔

مورجانہ اسے بتاتی تھیں کہ وہ بچپن میں بہت شرارتی تھی لیکن بھی یہ نہ بتایا کہ وہ اس قدر بد مزاج تھی کہ لوگوں کو چشیاں بھی کاٹا کرتی تھی۔ یہ تو انکشاف ہی نہ ہو گیا تھا۔

”ڈوڈو بھائی کی..... اودہ سوری از رک صاحب! آپ بہت بدل گئے ہیں، اس لیے پہچان نہ پائی۔“ وہ اسے اندر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے مہذب انداز سے بولی۔

”کاش میں بھی جواب آپ کو یہ کہہ سکتا۔“ وہ خوش دلی سے مسکرا کر چوٹ کر گیا۔

ہاتھ میں پکڑے پکڑے بائپ کو دیکھ کر وہ اس کی پشت پر نظر کر جتا چنگی بھی لگا لگا لیا افسانوں کے ہیروز جیسا مٹی برادون موسیچل تلے مسکراتے گلابی لبوں اور لمبیر لب وچکے والا شخص اس کے دل کو بھگا گیا تھا۔

”سوچوں میں کتنی۔“

”سین پورا نہ ہونا۔ وہ پوچھتا کیسے کرتی ہیں آپ اتنا مشکل کام؟“

میں معصوم لہجے میں کہتی۔

”کون سا کام؟“

وہ بائپ کی طرف اشارہ کرتا۔

”عسے دیتی جاتے ڈھیروں پودوں کو پانی؟“

میں ہل کھاتے ہوئے بائپ اس کی طرف پکڑ کر پانی کی دھار اس پر چھوڑی اور پہلے سے بھی زیادہ بھول پن سے اس کے سونے کے کف نکلس سے مزین سفید کاشن کے کلف لگے کرتے کی اکڑ لگاتی پانی کی دھار کو دیکھ کر کہتی ”ایسے۔“

وہ اپنے ہاتھ میں پکڑے پانی کے بائپ پر نظریں گاڑے سوچ رہی تھی۔ سر جھٹک کر خیالات سے چمکا رہا پاتے ہی بائپ والا کام پھر کسی وقت پر مؤخر کر تے ہوئے اپنا چلیخیک کر کے وہ چند منٹوں

بعد از رنگ روم میں داخل ہوئی تو سب ہی چائے پی رہے تھے، اس کے دونوں چھوٹے بھائیوں کے ساتھ کپ شپ لگاتے ہوئے وہ بڑوں کے ساتھ بھی بہت مؤدب انداز میں بات کر رہا تھا۔

ایک بی کے لیے اس نے نظریں ملیں تو پشیمینہ کے دل کی دھڑکنیں بڑے ترتیب ہی ہوئیں۔

وہ ایک طرف صوفے پر بیٹھی دزدیدہ نظروں سے چائے کے تھرموس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی ”یہاں تو پرفیکٹ رومینک اور افسانوں والا سین بنا تھا لیکن شاید میں کچھ لیٹ ہو گئی یا چائے کچھ زیادہ ہی جلدی آگئی ہے۔“

”پشیمینہ بیٹا! بھائی کو گرم چائے ڈال دو۔“

مورجانہ کے کہنے پر وہ جھل کی طرح چائے کے تھرموس پر چھینی لیکن اس سے پہلے کہ اسے کپ پکڑاتے ہوئے اس کے ہاتھوں کی انگلیاں پشیمینہ کے ہاتھوں سے مس ہوتیں اور وہ اس لطیف احساس کو اپنے رگ و پے میں دوڑاتا ہوا محسوس کرتی جو آج تک رومینک سینز میں پڑھائی تھا وہ بول اٹھا۔

”بھیں بی بی جان! میں پورے دن میں ایک کپ چائے ہی پیتا ہوں۔“ اس کے سارے رویس والے سین پر مٹی ڈال دینے سے وہ مایوس کی دوانہ کے ساتھ جا کر بیٹھ گئی۔

”ہیر دو چائے پر چائے پی لیتے ہیں اور سرگٹ پر سرگٹ پھونک ڈالتے ہیں۔ ہر سین میں دو ہیرو ہیروئن کے علاوہ تیسری چائے لازمی ہوتی ہے۔“

دوانہ بڑی سی ادھر مٹی سر پر سلپتے سے لیے خاموش بیٹھی تھی۔

”ظالم ایسا میک اپ کرتی ہو کہ جب تک کوئی آدمے گزے کا صلیے سے نہ دیکھے شہر ہی رہتا ہے کہ میک اپ ہے یا قدی رنگ و روپ؟“

وہ سنجیدہ سی بیٹھی دوانہ کی نقل میں گھر کر کھر پھر کر نکلی۔

”میری دعا ہے تیرے ہونے والے میاں کی نظر کمزور ہو اور جب جب تو میک اپ کرے تجھے

اس کی ٹینک چھپائی پڑے جیسے مور جانہ میرے داجی کی نواں چھپائی گئی ہیں۔“ ودانہ کی گھوریاں اسے کہاں چپ کر سکتی تھیں۔

ڈائجسٹ کی ہیروں جتنی بھی بوٹکیاں مارتی مایہ منڈی اٹھتی۔ ہیرو اسے ہی پسند کرتا ہے۔ عجیبی ہوئی سنجیدہ اور پر وقار لڑکیوں کے مقابلے میں۔ اس کا تو اسے پورا یقین تھا کہ اس کی شرارت بھری کھسر پھسر پر بھی وہ کتنی موچھوں تلے غیر محسوس سی مسکان ضرور اس کے لبوں پر پھیلی ہوگی جو ہر ہیرو کے لبوں پر ہیروں کی بوٹکیوں سے پھیل جاتی ہے۔

”ڈگری تو بہت بڑی ہے اور تم نے محنت بھی بہت کی۔ اتنے برس انگلینڈ میں رہنا پر دیس میں اینڈل سے دوری کی تکلیف سہنا یہ آسان کام نہیں ہے بیٹا۔“ وہ بڑے داجی کی بات سن کر بڑی مشکل سے زبان کو دانتوں تلے دبا کر خود پر کنٹرول رکھنے میں کامیاب ہوئی تھی۔

ورنہ جی تو چارہ ہاتھ کران سے پوچھے۔
”بڑے داجی! آپ نے کب انگلینڈ کی سرزمین دیکھی۔ وہاں گوری گوری گلی ٹانگوں والی پیاری پیاری میوں کے ہوتے ہوئے کوئی بدذوق ہی بور ہو سکتا ہے اور یہ ہیرو نظر آنے والا بندہ بدذوق تو نہیں ہے جی نہیں لگ رہا۔“ وہ ودانہ سے دھیرے دھیرے کہہ رہی تھی۔

”شہزادے شہزادیاں جن کی ہم کہانیاں پڑھتے اور سنتے رہے ہیں وہیں رہتے ہیں۔ پھر وہ ملکہ الہجہ۔ ہائے ہم نے تو ملکا میں فقط تاش کے پتوں پر کیا کہانیاں میں دیکھی اور پڑھی ہیں۔ شہزادہ چارلس تو بڑھا ہو گیا ہے لیکن لیدی ڈانا کے پرنسزم شہزادے بیٹے ہائے۔ ایسے پر یوں اور شہزادوں کے دیس میں بھلا کون تکلیف سہہ کر رہتا ہوگا وہاں تو راحت ہی راحت ہوگی۔“ ودانہ اس کی نشتری پر بڑی مشکل سے چہرے پر تجدیک قائم رکھ پائی۔

”پیشینہ بیٹا!“
مور جانہ نے اسے کھسر پھسر کرتے دیکھ کر آنکھوں کے اشارے سے حواسوں میں واپس آنے

کا سگنل دیا تو وہ گڑ بڑا ہی گئی۔
اسے احساس ہوا کہ چپ ہو کر بھی اس نے بوٹکیوں کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔ سوچوں کی وادی میں کھوئے پھرتے وہ حقیقی دنیا میں سامنے رکھی پلیٹ سے بے خیالی میں کچھ درمیں پانچواں سوسہ اٹھالے لگی تھی، جب کہ چار سوسے پورے اس کے منہ میں غائب ہو چکے تھے۔
”ختم کرو۔ کیا کہیں گے یہ کسی عیدی بھوکی لڑکی ہے۔“

ودانہ نے بھی اسے کہنی ماری۔
”اب تو چانس بنے ہی ہے۔ میں جانتی ہوں میری بے وفائیاں ہی اسے بھاجا جائیں گی۔“ یہ بات اس نے صرف سوچی تھی۔

”اوہ اچھا تو تمہارے ارادے اپنے گاؤں میں رہ کر پریکٹس کرنے کے ہیں۔ یہ تو بہت ہی اچھا فیصلہ ہے۔ ہم سب اس میں جو بھی بددکھیں ضرور کریں گے۔“ وہ تو صرف اتنا چاہتی تھی کہ میڈیکل پڑھ کر آیا ہے۔ گونڈا اپنے بھائی کی قابلیت اور اہلیت کی اکثر تعریفیں کرتی رہتی تھی۔

”جی کا کاجی! میری کوشش یہ ہوگی کہ آپ اپنے علاقے میں ہی ایک بڑا ہسپتال بنائوں اور اپنے لوگوں کو علاج کی سہولیات فراہم کروں۔“ وہ تو پہلے ہی اس کی شان دار شخصیت کے سحر میں کھوئی ہوئی تھی لیکن باقی سب بھی اس کے خیالات جان کر اس کے ماترین میں نام لکھوا چکے تھے۔

”ہسپتال کے لیے زمین میں دولی گا اور باقی بھی جو مدد چاہیے ہوگی۔ میں ہر وقت حاضر ہوں۔“ اس کے بڑے داجی تو جیسے اس سے بہت ہی زیادہ ماتر ہو چکے تھے

”شاباش ہے بیٹا! بقول تمہارے اسنے اچھے اچھے ہسپتالز سے جنہیں کام کرنے کی آفر مل چکی ہیں لیکن تم پھر بھی اس پسانہ گاؤں میں ہی کام کرنا چاہتے اس سے بڑی بات کیا ہوگی؟ آج تک کی تو جوان اعلا تعلیم حاصل کرنے کے بعد سب سے پہلا

کام ہی یہ کرتے رہے کہ گاؤں سے منہ موڑا اور شہروں کے ہنگاموں میں کھولے۔ یہ سب تمہارے والدین کی تربیت کا کمال ہے۔ شاباش ہے ان پر جو ایسا بیٹا بننا۔“ داجی بھی تعریف پر مجبور ہوئے حالانکہ وہ جانتی تھی اس کے داجی بہت ہی کم کسی کی تعریف کیا کرتے تھے۔

پیشینہ کی بیٹی اندر ہی نہیں ہو رہی تھی۔
”جیسے اب اجازت دیں، داجی کا حکم تھا کہ آپ لوگوں سے مل کر اپنے مقصد سے آگاہ کروں اور یہ بھی بتاؤں کہ مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہر وقت رہے گی کیونکہ یہ کام اکیلا میں نہیں کر پاؤں گا۔ بزرگوں کا ساتھ اس میں برکت ڈالے گا۔“

پیشینہ نے دیکھا، اس کے داجی لفظ بزرگوں پر پہلو بدل گئے تھے۔ انہوں نے اپنی طر شدہ موچھوں کو کھڑکڑ کر مزید اوپر کرتے ہوئے شاید خود کو یہ کہہ کر تسلی دی تھی کہ ”بھڑکوں“ کہنا ان کے بڑے بھائی اور بھابی کی طرف اشارہ تھا۔

بڑا سا ذرا کچھ دم جسے مور جانہ بیٹھک کہتی تھیں اس کے اٹھ کر جانے سے پیشینہ کو غالی سا لگنے لگا تھا۔
”ماشائے بڑا قائل پچر ہے۔ یہ دونوں تالائق بھی اس بچے سے کچھ کیسے تھ تو کامیابی ان کے قدم ضرور چومے گی۔“

داجی دونوں بیٹیوں کو ازکر خان کے ساتھ دروازے تک جاتا دیکھ کر بولے تو پیشینہ نے یوں غرور سے سر اٹھایا جیسے یہ تعریف اس کی ہوئی ہو۔

☆☆☆

آج پھر ان کے ڈرائنگ روم اور مور جانہ کی بیٹھک میں غفل جچی تھی۔

پیشینہ نے گاڑی کی آواز سن کر سن گن لینے کے لیے کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکا تو بڑی سی سفید چادر میں بلبوس گونڈ کی ماں اور چھوٹی سی کالی شال اوڑھے ان کے پیچھے گھونڈے جگرے سے اندر داخل ہو رہی تھیں۔ مرد دجرے میں ہی بیٹھ گئے تھے۔

شاید ذرا بیورو کے ساتھ آئی ہیں کیونکہ ازکر خان سید حامد اندر ہی آتا لڑکے کے نہ آنے سے تو خشک

یقین میں بدل گیا تھا کہ یہ لوگ رشتے کے لیے آئے ہیں، اس کے دل میں اٹھل پھٹھل ہو رہی تھی شریلی مسکراہٹ خود بخود ہونوں پر جم گئی تھی۔ آنے والے وقت کا تصور اسے ہواؤں میں اڑا رہا تھا۔

”اے کہاں کم ہو شہزادی؟“ گونڈا سے یوں گم سم گئی طرف متوجہ نہ دیکھ کر چوہری تھی۔

”کچھ نہیں گونڈا آپ لوگوں کے لیے کھانے کا انتظام کیا ہوا ہے۔ اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔“
ہوئے والی منہ ہے، ذرا سی عیدی ہے تو کیا ہوا۔ شادی کے بعد اتنا کھلاؤں پلاؤں گی کہ اس کا ندیدہ پن ختم ہی ہو جائے گا۔

اتنی عزت افزائی پر گونڈہ ہوتی چہرہ لیے منہ کھولے اسے گھورنے لگی۔

”آپ؟ تم نے مجھے آپ کہا۔ مجھے تو اپنے بے گناہ کانوں پر یقین ہی نہیں آ رہا۔“

وہ شریلی کی مسکراہٹ لبوں پر سجائے بلیتے سے اوڑھے دوپٹے میں روزانہ سے بالکل مختلف لگ رہی تھی۔
”ودانہ آتی کدھر ہیں؟“

اس کے احتضار پر وہ اسے ودانہ کے کمرے کی طرف لے گئی۔ اس کی طبیعت خراب تھی۔ اس لیے وہ کمرے سے باہر نہیں نکلتی تھی۔

مور جانہ کی بیکار پر وہ گونڈہ کو ودانہ کے کمرے میں چھوڑ کر خود پلیٹ آئی۔

”چائے کے بعد کھانا اور پھر توبہ رکھنا ہے۔“ مور جانہ نو کروں کو ہدایات دے رہی تھیں۔

”تم اندر جا کر ان کے پاس بیٹھو۔ بی بی گل تمہارے بارے میں پوچھ رہی ہیں۔“
وہ دل ہی دل میں اترائی۔

”ہاں اب تو ضرور پوچھیں گی۔ بیٹے کے دل کی ملکہ جو بن گئی ہوں۔ اچھی طرح جانتی ہیں کہ میرے ساتھ اچھا سلوک ہی بیٹے کو ان سے جوڑے رکھے گا۔ پہلے تو کبھی سیدہ منہ بات ہی نہیں کی انہوں نے میرے ساتھ۔ ہمیشہ ناک منہ چڑھائے ملتی تھیں۔“ وہ محسوس ہی لڑکی سوچوں کے پرندے کو

آرزوؤں کے آسمان پر لمبی اڑان کے لیے چھوڑ چکی تھی۔

”بس لالہ! اب میری جھولی میں یہ جتنی ہیرا ڈال دیں۔ میں جانتی ہوں، نازوں ملی اولاد کی اور کے دامن میں ڈال دینا بہت مشکل فیصلہ ہے لیکن یہ تو زمانے کی ریت کے ساتھ ساتھ اللہ کا حکم بھی ہے اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت بھی۔ میں آپ کا احسان آخری دم تک یاد رکھوں گی۔“ وہ لب لباب کی آواز سن کر وہیں کھڑی ہوئی۔ وہ بہت ہی عاجزی سے دانی سے اس کا ہاتھ مانگ رہی تھیں۔

”اصل میں میری بہن نے بھی اپنے بیٹے کے لیے ودانہ کا رشتہ مانگا ہوا ہے لیکن میں نے اس سے کچھ وقت مانگا ہے سوچنے کے لیے، آپ سے بھی ہمیں سوچنے کے لیے کچھ وقت مانگنا چاہیے تھا کیونکہ یہ فیصلہ جلد بازی میں کرنے سے ہمیشہ نقصان کا خدشہ ہوتا ہے لیکن تمہارا بیٹا اتنا قیامت اور سعادت مند ہے کہ اس کے رشتے پر اگر میں سوچنے کے لیے وقت مانگوں تو میرا سرا سچے کے ساتھ زیادتی ہوگی۔“

”لیکن خان جی! شاہ گل کو کیا جواب دیں گے؟“ بیوی نے یاد دلایا تو وہ چند لمحوں پر سوچ انداز میں کسی غیر مرئی چیز کو گھورتے رہے پھر اطمینان سے بولے۔ ”میں بہن کو خوش کرنے کے لیے اپنی بیٹی اور گاؤں کے بایسوں کے مستقبل سے نہیں کھیل سکتا، فی الحال اسے خبر نہیں ہونے دیں گے۔ وہ ایبٹ آباد سے آئے گی جب رو برو ساری صورت حال بتا دوں گا وہ اپنی بیٹی سمجھ کر سوچے گی تو میرا فیصلہ سچ لگے گا اسے۔“

وہ دھڑکنوں کے شور پر قابو پانے کی ناکام کوشش میں لگی ہوئی تھی کچھ نہ سمجھ پائی کہ بات کیا ہے۔ ”شاہ گل نے تو اس کا رشتہ نہیں مانگا تھا، شاید جینی کی اہمیت بڑھانے کے لیے بڑے دامی ہوئی کہہ رہے ہیں۔“ اس نے جیسے خود کو سلی دی۔

”تم چاروں کا مشترکہ فیصلہ از رک خان بیٹے کے حق میں ہے۔“ پشینے بچے کو بلاؤ کہ سب کا منہ بیٹھا کرے۔“

بڑے دامی کی آخری بات پر وہ چونک گئی۔ ”اب بڑے دامی کو دیکھو، عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کی عقل گھٹتی جا رہی ہے۔ کوئی شرم جیابھی ہوئی ہے۔ مانا کہ میں بچکی ہوں اور اس رشتے پر خوش بھی بہت ہوں لیکن اتنی بھی بالکل نہیں کہ اپنی بی بی بات کی ہونے کا شکائب کو کھلانے کا حق جاؤں۔“

سب ایک دوسرے سے گلے ملتے ہوئے مبارکبادیں دے رہے تھے۔ وہ جلدی سے وہاں سے بھاگ گئی۔

”پشینے بچے! ودانہ کبھی اندر بھیجوا اور تم خود بھی آ جاؤ۔“

”ودانہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ تو سر ہانڈے لپٹی ہوئی تھی۔“ اس نے دھیسے لچھے میں جواب دیا اور نظریں جھکا کر ہاتھ پر رکھ لئی۔

”پشینے بچے! ودانہ کو ہاتھ سے پکڑے اندر سے باہر لا رہی تھی۔“

پشینک میں سبھی بیٹھے تھے۔ ودانہ بھی سر جھکا کر آکر بیٹھ گئی اور ودانہ کے بالکل ساتھ بیٹھی تھی۔ ”میری بچی! طبیعت کیسی ہے؟“

”امجد اللہ اب ٹھیک ہوں۔ معمولی سر درد تھا، گلوں کی مٹھی باتوں نے درد کو بھگا دیا ہے۔“

پشینے نے جبرانی سے ودانہ کے چہرے کی طرف دیکھا کہ کتنی مٹھ تو نہیں کر رہی۔ گلوں کے ہاتھ بالکل پند نہیں کی سبھی اسے پختی ناک والی کتھن کی سی، کتھن کا کتھن کی سی ایک دن قہقہے لے آئے گی پاکستان میں۔ لیکن اس وقت اس کے ہونٹوں پر نرم کی مسکان اور آنکھوں میں میز پر رکھی مٹھائی کی پلیٹ کو کھورتی گلوں کے لیے پیار کا سندرمو جڑن تھا۔

”میرے خیال میں ہم اللہ کرتے ہیں۔“

گلوں کی ماں کے اس طرح کہنے پر پشینے بھی گئی کہ ابھی چھوٹی سی سلیپین کر س گئی تھی اور مٹھائی شاید بعد میں۔ اس کی نظریں مسلسل جھکی ہوئی تھیں۔ اسے دامی اور بھی بیڑوں سے شرم آ رہی تھی۔

”بیٹا گلوں! انگلی لاؤ۔“

انہیں شاید پوری امید تھی کہ آج باں ہو جائے گی۔ اسی لیے تو پوری تیار سے آئے تھے ہستی سرکاری گلوں پر س انگلی کی ڈبیر کال کر لائی اور اس کے قریب بیٹھی ماں کے ہاتھ میں پکڑا دی۔

”ہمم اللہ کرتے ہیں۔ اجازت ہے لالہ جی؟“ انہوں نے بڑے دامی کے اشارت میں ہٹے سر کی طرف دیکھ کر ہاتھ آگے بڑھایا۔ پشینے نے شرماتے ہوئے سیدھا ہاتھ ابھی گود سے اٹھایا ہی تھا کہ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر ودانہ کی کلائی پکڑی اور پیار سے اس کا ہاتھ چوم کر اس کی انگلی میں انگلی پہنادی۔

ایسے موقعوں پر کہانیوں میں سر پکراتے ہیں بہت سر پر کرنی محسوس ہوتی ہے یا آس پاس دھماکے ہونے لگتے ہیں لیکن وجد کے پرچے پل بھر میں کیسے اڑتے ہیں اسے ابھی خبر ہوئی تھی۔ وہ بمشکل اسے گلوں کے سطح پر رکھ کر مبارک سلامت کی ملی جلی آوازوں میں اسے اپنا نام بھی بار بار سنائی دے رہا تھا۔

”پشینے! مٹھائی کھلاؤ سب کو۔“

”پشینے! بہن کو اندر لے جاؤ۔“

”پشینے! سنو تو۔۔۔۔۔۔“

پشینے۔۔۔۔۔۔ پشینے۔۔۔۔۔۔

وہ افسانوں میں بھی ایسی صورت حال پر آنسو بہانے والی نازکی پشینے کیسے اتنا بڑا دھچکا برداشت کر سکتی ہے؟ ہوش ہونے سے پہلے اس نے دیکھا کہ

ودانہ رونے ہوئے اسے پکار رہی تھی۔ باقی سب بھی اس پر ہنسنے ہوئے بار بار پریشانی سے پوچھ رہے تھے کہ اسے کیا ہو گیا ہے؟

☆ ☆ ☆

”مجھے تو اب معلوم ہوا ہے کہ میری چھوٹی بہن مجھ سے اتنی محبت کرتی ہے۔“

آنکھیں کھولنے پر ودانہ نے محبت بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

”یار! ابھی تو صرف مٹھائی ہوئی ہے شادی میں

بہت وقت ہے اور تم ہو کر ابھی سے بے ہوش ہو رہی ہو ایسا نہ ہو شادی کے وقت لوگ ڈھونڈنے لگیں اور تم میرے جانے کے غم میں بالکل ہی مہین ہو کر غائب ہو جاؤ۔“

پشینے نے آنکھیں بند کرتے ہوئے اطمینان بھرے انداز میں ایک ٹھنڈی آہ بھرے ہوئے سوچا۔ ”شکر ہے کہ خوشی تو ہاتھ سے نکل گئی مگر میری عزت بچ گئی ورنہ سب لوگ کیا سوچتے میرے بارے میں کس قدر شرمندہ ہوتی میں ان سب کے سامنے۔“

☆ ☆ ☆

مورجانہ اس کے سر ہانڈے بیٹھی ہاتھ میں تھپتھپ پکڑے کچھ پڑھنے میں مصروف تھیں۔ ان کی تھپتھپ کے دانے تیزی سے گر رہے تھے۔

”میں جانتی ہوں، پورے گھر میں تم دونوں لڑکیاں ایک دوسرے کے دکھ دکھ کی ساسھی نہیں بھی ہو اور سہیلیاں بھی۔ باقی دونوں لڑکے تو باہر کے ہیں۔ اس لیے صدمہ تو لازمی ہوگا۔ پہلے سے کوئی اطلاع بھی نہیں تھی کہ ذہنی طور پر تیار ہوتے۔ سب اچانک ہوا تو تمہیں ودانہ سے دوری کے اندیشے پریشان کر گئے گلوں از رک کی بہن ہے۔ لیکن تمہاری بچپن کی سہیلی بھی تو ہے۔ اس نے تمہیں بھگ بھی نہ پڑنے دی اس بات کی۔ اگر پہلے سے کچھ آئیڈیا ہوتا تو میری بیٹی یوں اچانک بہن سے بچھڑنے کا سوچ کر فٹنشن نہ لیتی۔“

مورجانہ اس کے چہرے پر پھونک مار کر بولیں تو پشینے دل سے اک ہو کر سی آگئی۔

”کیسے افسانوں میں بہر دون کی ماں بنا کہے اس کے دل کی ساری باتیں سمجھ جاتی ہے اور بڑی بڑی فلسفیانہ باتیں کرتی ہے۔ اپنی عمر کے حاصل شدہ تجربات سے اسے آگاہ کرتے ہوئے یہ احساس دلائی ہے کہ دنیا میں کوئی ہے جو اس کے درد سے واقف ہے۔“

”اب یہ پیاروں والی شکل نہ بناؤ! اور مٹھائی بانٹو۔ بہن کی خوشی کو خوشی کی طرح سناؤ ورنہ کچھ اس بے چاری کا کترا ہوا چہرہ رونے والی شکل ہو رہی ہے۔“

”ہائے ماں کی پیٹھ بھی بیٹی کے دل تک نہ ہوتو دوسروں سے گلے کھیا؟“

”ودانہ میری بہن بہت مبارک ہو یہیں یہ نیا رشتہ از رک خان کا نام۔“ ودانہ کا چہرہ واضحی اتر اہوا تھا اور آنکھیں بھی سوچی ہوئی تھیں۔ وہ دل پر جبر کرتے ہوئے اٹھی اور اسے گلے لگا کر بولی تو ودانہ کے ساتھ مورجانہ بھی مسکرائیں۔ لیکن کوئی آنکھ نہ دیکھ پائی کہ ان کی آنکھوں کے کونے نم ہو گئے تھے۔ یہی انہوں نے چپکے سے اپنی اوڑھنی کے کونے میں جذب کر لی تھی۔ جو جس میں تھا وہ ہی کر سکتا ہے انسان۔

☆☆☆

دودن وہ کالج نہ چاکی۔ اس دوران کی باراس کے دل میں یہ خیال آیا کہ ڈائجسٹ میں لکھے افسانوں والی پتویشن اس کے ساتھ بھی ہو گئی ہے۔ کسی ناول کی کہانی میں اگر نوٹ نہ ہوتا تو اسے مزہ ہی نہ آتا تھا۔ وہ ایسا بورنگ کہانی اکثر درمیان میں چھوڑ کر کوئی اور پڑھنا شروع کر دیتی تھی لیکن اب یہ سوچ رہی تھی کہ رادوں پر کیا کر رہی ہوگی ایسی صورت حال میں؟ کسی دوسرے کی زندگی کی کہانی کے جو موڑ پڑھنے والے کو مزہ دیتے ہیں۔ وہ کرداروں کا دل چیر کر کہانی میں ڈھلتے ہوں گے۔ اس نے خود کو یہ کہہ کر بار بار تسلی دی کہ یقیناً اب اچانک ہی دن از رک خان سر اہلے گا اور اپنی محبت کا اظہار کر کے گلے کا گلے میں نہ گھر والوں کے سامنے پیش نہ کیا تھا مگر وہ ودانہ سمجھے بس ذرا غلطی نے محرم سے مجرم بنادیا۔ وہ ڈوٹ کر پھرے گا اور مجھ سے میری رضامندی مانگے گا۔ میں محبت کا اظہار نہیں کروں گی اور اسے سمجھاتے ہوئے اعلاظری کا مظاہرہ کروں گی اور دل پر پتھر رکھ کر کہوں گی میرے خاندان کی عزت اور ودانہ کی خوشیاں مجھ سے قربانی مانگ رہی ہیں۔ وہ چونک کر پوچھے گا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو؟ میں آنکھوں میں آنسو بھر کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے فقط اتنا ہی کہوں گی مجھے بھول جاؤ اور ودانہ سے شادی

کر لو اس میں بہت سارے لوگوں کی بہتری ہے۔ وہ سارے ڈائجسٹ اسے یاد تھے جو ایسے مونوں پر ہیر پتیز بولی ہیں لیکن ایسا موقع تو آتا نا۔ اب اک نیا انتظار شروع ہو گیا تھا اس نے خود کو سوچوں کے پتھر سے آزاد کرتے ہوئے سائیکل پر پڑے کچھ نئے اور کچھ پرانے ڈائجسٹ اٹھا کر دیکھنے کے بعد اپنا پسندیدہ ناول کھولا اور تیسری بار پڑھنے لگی۔

☆☆☆

”ارے تمہیں کیا ہو گیا تھا اس رات؟ ایک دم بے ہوش ہو کر گر گئی تھیں اور سارے کمر کو پریشان کر دیا تھا اور مجھے تو ذہل سیٹھن تھی۔ ایک تو مٹی کی ٹیلی یوں بے ہوش ہو کر گر گئی اور دوسرا اس مٹھائی کا افسوس ہو رہا ہے جو پلیٹ سے میرے پیٹ تک نہ پہنچ پائی۔“

وہ دودن بعد کالج آئی تو پلاس سوال ہی اس اندیہ مستی نے یہ کیا۔ گلو نہ کی شکل اسے بالکل اچھی نہیں لگ رہی تھی اسے یہ کم از کم گھر والوں کے سامنے میرا نام لے دینا چاہیے تھا۔ بدی کے نام پر دھبہ ہوئی ہیں ہیر وڑکی ایسی بیٹیں۔

”مبارک ہو بھائی کی مٹھائی کی۔ بہت خوش ہوں میں اس رشتے پر۔“ وہ سمجھ نہ سکی کہ وہ خود کو پیشہ دلا رہی ہے یا اسے۔ اس نے نظریں چرا کر ہاتھ میں پکڑی کتاب چھول لی تھی۔

”اوہ تو یہ خوشی والا ہے ہوش ہوتا تھا؟“ گوند نے انگریزی کی ایک سیدھی کرکے اس کے سامنے رکھ دی جو بے خیالی میں اس کے سامنے اٹھی بڑی تھی۔ ”یہ تو مجھے پتا ہے کہ تمہاری انگریزی کی گزور ہے لیکن اتنی گزور ہے یہ ابھی انکشاف ہوا ہے۔“

”ہاں تو اس میں دکھ کی تو کوئی بات نہیں تھی نا؟“ وہ اس کی انگریزی والی چٹ نظر انداز کر گئی۔ گوند بیک میں سے سیب نکال کر کھانے لگی۔ ”مجھے لالہ نے منع کیا تھا کہ یہ بات تمہیں نہیں بتانی کیونکہ وہ سب کو سر پر انداز دینا چاہتے تھے۔“

اف صدیوں کی بھوکی۔ پشیمین بڑوادی وہ کڑچ کڑچ کر کے یوں سیب کاٹ رہی تھی جیسے چٹائی بار کا

رہی ہو یا جیسے چوہا کوئی پتھر رہا ہو۔ پشیمین کا دل چاہا اولوں ہاتھوں سے اپنے کان بند کر لے یا اس کا بھانڈا پھینا۔

”پوری بات بتاؤں تو لالہ نے سیدھا سیدھا ودانہ آپ کی کام لیا۔ بقول ان کے شادی کے لیے پڑے خاندان میں ان کے برابر کی لڑکی دوسری کوئی نہیں۔ اصل میں لالہ کو ودانہ آپنی پہلی نظر میں ہی بہت اچھی لگی تھیں۔ ہائے ان کی خوب صورتی اور گریں ماشاء اللہ۔“ اس نے جیسے دھما کر کر دیا تھا کسی دھماکے کرنے والی مٹھائی ہے ان کی؟ پہلے ماں نے میرے سر پر بم گرایا اب بہن بھائی مل کر پرچوں کے بھی پرچے اڑا رہے ہیں۔

سارے افسانوں والے متوقع اتفاقات کی امید لپٹ گئی، آس بحرے خیالات غلط ثابت ہو گئے تھے اب اسے یقین ہو گیا کہ کسی غلط فہمی کی وجہ سے از رک خان اور ودانہ کا رشتہ ٹھیک ہوا بلکہ وہی اس کی پسند تھی۔ گوند مسلسل ودانہ کی خوب صورتی کی تعریفیں کر رہی تھی اور اسے سب ہضم نہیں ہو رہا تھا۔

اس کی تعریفیں سن کر وہ پہلو بدل کر رہ گئی۔ اب اسے کیا بتانی کہ ساری خوب صورتی اس کے ماہرانہ ہاتھوں کے اس کمال کی بدولت ہے جس سے وہ گھر بیٹک فیشن اور میک اپ کرتی ہے۔ ورنہ تو دن کی روشنی میں بغیر میک اپ کے اس کی ہلکی ہلکی نکلی بیزر مونچھیں جسے وہ رواں سمی تھیں۔ کٹے مساموں سے ہما کٹتے بلیک ہیڈز اور آنکھوں تلے پڑنے کا لے حلقے دیکھ کر تمہارا بھائی ضرور اسے ودانہ خان سمجھ لیتا۔ اور گریں کا پوچھتا ہے تو مجھ سے پوچھو اندر کی بات۔ ہالوں کی طرح خوب شوپ کرتے ہوئے چائے پینے والی لڑکی مہمانوں کے سامنے کیسے خود کو بدل لیتی ہے۔ کوئی گھر میں ہوتا مگر کوا ایک ایک دانہ چرے پر ایسے تاثرات لاکر نرا کرت سے اٹھاتی ہے کہ جیسے نمکو نہ ہو بھاری پتھر ہو اور دیکھنے والا اسے سمجھ سکا کہ اسے سوچ کر نہیں کہتا کہ اب اس سموسے کو پلیٹ سے اٹھانے کے لیے کہیں کریں مگر ان کے کی فرمائش نہ کر

دے نازک حسین۔ اسے ان دنوں ودانہ میں بہت سی خرابیاں نظر آنے لگی تھیں۔

”ہاں یہ تو ہے۔ اس خوب صورتی اور گریں کے ساتھ ودانہ اپنے والدین کی اگلی بیٹی بھی ہے اور بڑے ذاتی کے ساتھ وہ اپنی ماں کی ساری جائیداد کی اکیلی وارث بھی تو ہے۔“ اسے جانے کیسے یہ خیال آیا اور مٹھ بھرے انداز میں خیال کا اظہار بھی کر دیا۔

گوند ان کی گہرائی۔ ”از رک لالہ کہتے ہیں۔ شادی کے بعد میں ودانہ کو کئی مومن کے لیے الگ کینڈل لے کر جاؤں گا۔“ ”ہونہرے نانوے فیصد پاکستانی دہلیوں کی طرح سوات یا مری سے آگے کے تو خواب بھی نہیں دیکھے ہوں گے اس بے چاری نے۔“ وہ جل کر سوچ رہی تھی۔

”تو یہ تو بچی زندگی کی شروعات انگریزوں کی شکلیں دیکھ کر نہیں کرنا چاہیے۔ میری تو جب شادی ہوگی میں اپنے شوہر کے ساتھ عمر کے لیے مکہ مدینہ جاؤں گی۔“

کسی طرح تو اسے نچا دیکھا کر اندر کا غصہ نکالنا تھا۔ گوند اس کی بات سن کر شرمندہ نظر آئی شاید اسے افسوس ہو رہا تھا کہ یہ خیال پہلے اسے یا اس کے قابل بھائی کو کیوں نہیں آیا؟ وہ جان بوجھ کر گوند کو نظر انداز کرتے ہوئے سائی لڑکی کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

☆☆☆

”ارے کیا ہوا، کیوں اس طرح خیر بھانے جا رہے ہیں؟“ وہ ڈائجسٹ ہاتھ میں پکڑے اپنے پسندیدہ قسط دار ناول کی ورق گردانی کر رہی تھی جس کی سائیکل لاسٹ قسط اس ماہ کی تھی۔

”تمہیں تو ودانہ بی بی! میں روتی نہیں رہی۔“ حالانکہ وہ ڈائجسٹ اسی لیے کر رہی تھی کہ بڑھنے کے ساتھ ساتھ دکھ ہوئے دل کا بوجھ بھی ہلکا کرتی رہے گی۔ رونے کے لیے اسے کوئی بھانا تو چاہیے تھا۔

”ویسے ہی کہانی پڑھ کر انھیں بیگم لگی تھیں۔“ بھانہ بتایا۔
”تم خوش تو ہونا؟“ وہ چوکی۔
”کس بات پر؟“

اس نے لال کال چھپانے کے لیے چہرہ نیچے کر لیا۔

”ازرک خان سے میری معافی پر؟“
وہ ڈانچٹ رکھ کر سیدی ہو گئی۔

”بہت خوش ہوں، اتنے بڑے ڈاکٹر ہیں۔ تم بہت خوش نصیب ہو ورنہ عسکر خان..... کیونکہ وہ خواہ صورت بھی ہیں اور سب سے بڑی بات کہ رشتے دار ہیں۔“ لہجہ عجیب سا تھا۔
ورنہ مسکرانے لگی۔

”رشتے دار تو شہباز خان بھی ہے ازرک تو دور بار کی رشتے کی خالہ کا بیٹا ہے لیکن شہباز لالہ۔ وہ تو مٹی پھونچ کر بیٹا ہے؟“

اس کا جی چاہا، پچھلے لے کہ وہ تو تمہیں پسند بھی تھا لیکن وہ بات بدل رہی تھی۔

”اے دلعزیز کرو یا راپرائی غلطیاں بھول جانا چاہئیں وہ بھی ایک غلطی ہی تھا میری بچی عمر کی۔“

”اچھا۔ ایک ہفتے میں تم ماشاء اللہ سے کیا کھا کر سمجھ دار ہو گئی ہو مجھے بھی بتا دو۔“ پچھلے ہفتے کی بچی عمر اچانک بچی عمر میں کیسے بدل گئی؟

”اچھا چھوڑ دو یا اس موضوع کو۔“ وہ لا جواب ہوئی تو تیز اسرا منہ بناتے ہوئی۔

”سنو! اک راز کی بات بتاتی ہوں۔“
اس کے راز دار شانہ انداز پر پشیمند چوکی۔

”انہوں نے بیچ کیا تھا کہ مجھ سے بات کرنی ہے۔ میں تمہارے کمرے میں تمہیں پڑھانے کا بہانا کر کے آیا کروں گی اور چند منٹ ان سے بات ہو جائیگا کہ کیونکہ گھر میں تو ہر وقت مور بلی ہی اور دا جی دووں میرے آس پاس ہی موجود رہتے ہیں۔“

پشیمند کے دل میں اک ہو گئی تھی۔
تو اب مجھے یہ سب بھی سہنا پڑے گا ہے

شیریں بانو کے پچھلے دنوں پڑھے ناول کے وہ سبق اسے یاد آ گئے جن میں وہ اپنے محبوب کی معافی پر اسے مبارک باد دیتے ہوئے اپنی سے آپ بہت لگی ہیں کہ میری دوست جیسی لڑکی آپ کو مل گئی ہے۔

اور جواب میں وہ نمونہ اس سے فرمائش کرنا ہے کہ وہ میرے فون پر بات نہیں کرنی کہ کھر سے اجازت نہیں ہے۔ آپ اپنے فون پر میری بات کرا دیں پھر وہ دو گھنٹے تک بے بسی ان کی گفتگو سننے پر مجبور ہو جاتی ہے کیونکہ اپنا چالیس ہزار کاموبائل فون اس ساتھ محبوب کے ہاتھ میں چھوڑ کر تو وہاں سے نہیں نکل سکتی تھی۔

”کیا سوچے لگیں؟“
وہ ڈانچٹ کی دنیا سے واپس لوٹی۔

”ٹھیک ہے یا ر! جب جی چاہے میرے کمرے میں بات کر سکتی ہو۔ لیکن گفتگو اخلاق کے دائرے میں رہ کر ہو تو بہتر ہوگا۔ مجھے بے آبی لو یا اور جوابی لو یا تو بہت ہی چپ لگتے ہیں۔“

”اوکے؟“
ورنہ مکمل سی گئی۔

”ابھی کہہ رہے ہیں کہ بات کرو۔“
پشیمند نے کندھے اچکاتے ہوئے ہاتھ ٹپکا کر پڑے ڈانچٹ میں سے ناول کا صفحہ موڑ کر چھوڑا اور احوال زریں کا صفحہ کھول کر خود کو مصروف ظاہر کرنے لگی کیونکہ کان اسی طرف تھے۔ ناول مکمل توجہ مانگ رہا تھا جو وہ اس وقت تو بائبل نہیں دے سکتی تھی۔ کچھ ساعتوں میں ہی ساعتوں کو پھٹکا ہوا لا جا لگائے لگا۔

”جی جی۔ بہت خوش ہوں۔“ اس رشتے پر۔
ارے نہیں..... میں اتنی خوب صورت کہاں؟ تو تو آپ کا حسن نظر ہے۔“ دوسری طرف سے تعریفی کلمات سننے کو ل رہے تھے قیقا مکمل کا اندھا ہے۔

وہ پھر سے جمل بھن گئی۔ ”سچ بولو تا کہ طرح طرح کی کریوں لو شہزاد اور خدیجہ تک سے شہزاد ہیں۔“

تیس منٹ ان کی بات ہوئی اور وہ ایک ہی سنہری قول پر نظریں جمائے بیٹھی رہی۔ آنکھوں کے آگے دائرے سے تانچے لگے تھے لیکن وہ توجہ ادھر

اگر نہ کہانی۔

”کیا کہہ رہے تھے؟“

دہلی دہلی سی مکان ورنہ کے ہونٹوں کے بالے سے جھلکنے کے لیے تاریخی۔
”وہی تعریفیں اور شہزاد کے منصوبے، اپنے لہو اہوں کی راہ گزر پر وہ ہاتھ پکڑ کر منزل کی طرف بڑھنا چاہتے ہیں۔“

وہ مغرور سی گردن اٹھائے اسے یوں دیکھ رہی تھی جیسے شہزادی کثیر کو دیکھتی ہے
”شہباز خان کا کیا ہوگا؟“

پشیمند نے جیسے ہوئے انداز میں سوال کیا تو وہ ہلک سی۔

”پھر سے شہباز خان؟ اگر بہت ہمدردی ہے تو تم کر لینا اس سے شادی۔“ ورنہ کے مکتوب پر وہ اور اس کے دل میں بولی۔

”مگر وہ تو تم سے محبت کرتے ہیں اور رشتہ بھی کتنی رکھا ہے تمہارے لیے۔ ہم تو ہمیشہ سے بہن بھائی والے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔“

اس سوال پر وہ مسخر اڑانے والے انداز میں اس سے مخاطب ہوئی۔

”کہاں وہ پہل کی اے پاس شہباز خان اور وہ کہاں یہ باہر سے پڑھ کر آنے والے ڈاکٹر ازرک خان انتم خود سوچو، وہ میرے قابل ہے؟“

”مکمل تک تو تم شہباز خان کی تعریفیں کرتے ہو مکمل تھیں۔ یاد ہے کیا کہا تھا۔ پنڈت ہے، خانہ دانی ہے، زمین جاں دہی ہے بس ایک کی ہے کہ پروفیشنل ڈگری نہیں ہے اس کے پاس۔“

”آج کیوں یاد آ رہا ہے وہ؟“ وہ ناگوار سی بولی پشیمند نے فون اسے پکڑا دیا۔

”خود ہی دیکھو، شاہگل کا بیٹا وہ کل شام تک بیٹھ گیا میں کی اور جب انہیں یہ خبر ملے گی کہ ان کے بیٹے کی لہو اور بڑے ماموں کی انکو لاڈلی بیٹی جس کے رشتے کے لیے وہ پچھلی بار بھائی کے سامنے دامن پھیلا چکی ہیں اور بھائی نے سوچنے کی مہلت مانگی ہوئی تھی، اس کی

بات کہیں اور بچی ہو چکی ہے تو ان پر کیا گز رہے گی۔ وہ تو سوچنے والی بات پر بھی بڑی سلیکٹ ہیں کہ بڑے دا جی نے کیوں یہ غیر منی والی بات کی ہے؟“

ورنہ کی رنگت متح پڑنے ہی متح ہو چکی تھی۔
”ڈاکٹر تو نہیں پایا ر!“

وہ سہمی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔
”شاہگل کو جواب دینے کے لیے میرے دا جی موجود ہیں۔ یہ ان کا فیصلہ تھا جو میں نے صرف اس لیے دل و جان سے قبول کیا کہ میرے بڑے میرے لیے کوئی غلط فیصلہ نہ کریں نہیں سکتے۔“

”اور اگر یہ ہی بڑے کسی کم پڑھے لکھے، بد صورت لڑکے سے رشتہ کراتے جب دل و جان سے قبول کرتیں؟“

وہ لڑکھائی کی کہ اس سوال کا کیا جواب دے۔
پشیمند دل ہی دل میں اس پوچش پر خوش تھی۔

اسے شاہگل پر بھی غصہ تھا کہ ہمیشہ ورنہ سے پیار کرتیں، اسے غاس توجہ اور تحفے کا تحائف بھی دیتیں اور اس سے نارمل انداز میں ملتی تھیں۔ ورنہ بھی تو جب شاہگل آئیں ان کی بغل میں ہی کسی گھر پھر کر رہتی تھی۔ اسے یہ ڈرامے بازی نہیں آتی تھیں۔ اس کی تو بس ایک اپنی دنیا تھی کتابیں، کہانیاں اور خواب نگر کو اپنی راجدھانی سمجھ کر روزانہ اس کی سیر کوکل جانا۔

”اچھا ہے اب شاہگل کو خبر ملے گی تو احساس ہوگا کہ وہ غلط بندی کو اتنی اہمیت دیتی رہی تھیں ورنہ جو بھی انہیں اپنی دوست اور پھوپھو کے علاوہ اپنا آئیڈیل بھی کہا کرتی تھی حالانکہ اس کی معلومات کے مطابق شاہگل نے بھی کوئی ایسا کام نہیں کیا تھا جو قابل غر یا قابل ستائش ہوتا۔ پیدا ہوئیں جیسے سب پیدا ہوتے ہیں۔ میٹرک تک پڑھا جیسے ان کی ساری ہم عمر لڑکیوں نے سیکنڈ ٹھڑ ڈیوڈن میں میٹرک کیا پھر شادی ہوئی۔ وہ بھی سب شادیوں جیسی عام شادی تھی، بچے ہوئے اور یوں کہانی ختم۔ اب کوئی بھی شاہ گل سمیت ورنہ سے یہ نہیں پوچھتا تھا کہ ان میں آئیڈیل والی بات کیا ہے؟ کیا میٹرک میں بورڈ

ٹاپ کیا تھا؟ زمین پر نہیں سرخ پر جا کر پیدا کیے تھے یا شادی پرستان میں ہوئی تھی۔“

”ہو نہ ہو اب ڈاکٹر ازکر خان کی ماں اس کی آنکھ مل رہی تھی بے کونکہ اس نے ایسا بیانیہ کیا ہے جو کبھی نظر میں اس پر فروغ نہ چکا ہے۔“

وہ اٹھیاں چمچاتے ہوئے خود کو اپنے ہی سامنے پر سکون اور لا پڑا دکھانے لگی۔

”پیشینہ“ وہ کمرے میں اکیلی بیٹی چھت کو
مگھوے جاری تھی۔ یہ دینی پر کوئی ڈرامہ چل رہا تھا
لیکن اس کی توجہ ادھر نہیں تھی۔ ہر چیز سے اس کا دل
اُچاٹ ہو گیا تھا۔ مور جانے اسے کہنے اُلی تھیں کہ کیوں
اکیلی بڑی ہو باہر نکلو، روزانہ کی طرح ہنسو، بولو، چٹائیوں
کے ساتھ لڑو، مگھو۔ احساس تو کہ مگھ میں زندگی کے
سارے رنگ ہیں لیکن اس کے زرد چہرے، متورم
آنکھوں اور بے ترتیب بالوں نے انہیں دھکی کر دیا۔
”جی مور جانے!“ وہ اُٹھیں دیکھ کر کبھی نہ سچی بلکہ
بیزاری نظر ان پر ڈال کر کروٹ کے بل لیٹ گئی۔
”تم سے اک بات کرنی ہے چند منٹ ماں
کے لیے ہیں تیرے پاس؟“

ناقص العقل کہہ کر اس کے گرد ایک دائرہ بنا دیا جاتا ہے۔ جس میں خود کو ہمیشہ محدود کرنے کی پابندی رکھنی پڑتی ہے۔ پھر اس کمزور کے خلاف ہر طرح کا تشویر استعمال ہوتا ہے۔ جسمانی تشدد، ذہنی تاراج، ایک جیتی جاتی انسان نہیں فقط ایک کمزور مخلوق سمجھ کر اسے لوٹا جاتا ہے۔ یہی اس کی آنکھوں میں خواب سا کریم کی اسے عزت کے نام پر اور دوسری محبت کے نام پر خوب ذلیل کیا جاتا ہے۔“

وہ مجھے پیار کرتے تو ان کے منہ سے سواری کی بدبو
آتی کی میں ان سے ملتی تو سانس روک لیتی تھی بلکہ
کاراشرین کل سے کبھی تھا کیا کیلی آیا کریں۔
اوسا تھا لہنے کی کیا ضرورت ہوئی ہے؟“
”وہ چپ ہو گئیں۔ سانس بھولنے کی وجہ سے
لوگ رہا تھا جیسے بہت دور سے دوڑتی ہوئی آئی
ہے۔“

سے پالنے اور پھر کسی اور کا ہوتے دیکھنے سے کہیں
بہتر یہ ہوتا ہے کہ خود کسی آنکھوں کا لاڈلا خواب بن
جاؤ؟“

”مور جانہ! کاش ہم دوسروں کی کہانیوں سے
سبق حاصل کرنے کے لیے یہ کتابیں پڑھا
کرتے۔“ وہ اس سے زیادہ کیا کہہ سکتی تھی۔

”کیا ہماری بس میں ہوتا ہے مور جانہ! کہ
ہم کسی کی آنکھوں کا لاڈلا خواب بن سکیں؟“

اس کے لیے کی حسرت مور جانہ کا دل چیر گئی۔
”خواب بننے سے پہلے تو نے کا حوصلہ جمع کرنا
پڑتا ہے میری بیٹی! اول جانے تو سب آسان ہو جاتا
ہے۔“

”تو نے کا حوصلہ؟“

”ہاں یہ حوصلہ ہو تو ٹوٹ کر خود کو با آسانی جوڑا
جا سکتا ہے۔“ ان کی عمر کا تجربہ بول رہا تھا۔ کئی بار
ٹوٹ کر خود کو جوڑ چکی تھی وہ۔

”مور جانہ خود کو جوڑنا آسان کیسے ہو سکتا
ہے؟“ اس نے بے بسی سے پوچھا۔

”خود کو مکمل سمجھ کر اور مکمل نظر آکر۔“

وہ تڑپ اٹھی۔

”مور جانہ کیسے؟ ریزہ ریزہ ہو کر خود کو کیسے مکمل
سمجھا جا سکتا ہے؟ یہ تو ناممکن ہی بات ہے۔“

وہ بے جا رکے سے بولی تو مور جانہ مسکرا دیں۔
”ناممکن تو ممکن بنانا ہی تو مکمل کرتا ہے عورت
کو۔“ وہ پہلی بار باں کو اندر سے دیکھ رہی تھی۔ ورنہ تو
ہمیشہ وہ ایک خوش باش خاتون نظر آتی تھیں۔

ان کے دونوں ہاتھ باری باری چوم کر وہ ان سے پھر
لیٹ گئی۔ ماں کے سینے سے لپٹی وہ ان کو اکٹھی ہی
جی لگ رہی تھی۔ انہیں لگ رہا تھا اس بچی کا پسندیدہ
مکھو ٹاٹوٹ گیا ہے اور وہ اسے تسلی دے رہی ہیں۔

یہ کہہ کر اور مکھوٹے لاندوں کی مت ر دو۔

”چلو اٹھو! اپنی بار بار پوچھ رہے ہیں کہ چمپنے
کیوں کرے میں کھسی ہوئی ہے؟“

وہ پھینکی سی مسکراہٹ لیوں پر سا کر بال سمیٹتے

ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ گلجے کپڑوں پر طائرانہ نظر ڈالی اور ہر نکل گئی
ماں خاموشی سے اسے باہر جاتا دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

”آپ نے اچھا نہیں کیا لالہ! میری بیٹی ودانہ پر پہلا حق میرا تھا۔ میری حق تلفی کی ہے اور وہ بھی اس طرح کہ مجھے اب سوال میں طے سننے پڑیں گے۔ کتنی اچھی لڑکیوں کو چھوڑ کر میں نے اپنی بیٹی کا ہاتھ مانگا تھا آپ کو کیا خبر؟“
کمرے سے شاہ گل کی تیز آواز آرہی تھی۔
ودانہ نے پشینہ کے ہاتھ چائے اندر بھجوا دی اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی اپنی آنکھیں پھونکی کا سامنا کرنے کی۔

”دیکھو میری بہن! احوالے سے سوچو۔ میں نے یہ اتنا بڑا فیصلہ اپنے نہیں گاؤں کے مفاد میں کیا ہے ایک قابل ترین ڈاکٹر جو باہر سے پڑھ کر آیا ہے۔ وہ گاؤں کے لوگوں کے لیے علاج کی بہترین سہولیات کا خواب دیکھ رہا ہے۔ وہ ہمارے لیے ایک قیمتی اثاثہ ہے۔ اب کوئی عورت دردزدہ میں شہر لے جاتے ہوئے راستے میں دم نہیں توڑے گی کیونکہ گاؤں میں سہولیات سے بھرپور اسپتال موجود ہوگا۔ آدھی رات کو کسی بیمار کو گاڑی کے لیے لوگوں کے دروازے نہیں ٹھکانے پڑیں گے۔

میرے لیے اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ تم تو ایک بڑے شہر کی باسی ہو تم نہیں جانتیں کہ گاؤں والے کیسے شہر تک پہنچتے ہیں۔ اک لمبے کے لیے دوسروں کی جگہ خود کو رکھ کر سوچو تو یہ فیصلہ ٹھیک لگے گا۔“

وہ ہاتھوں میں ٹرے پکڑے وہیں کھڑی تھی ابھی قدم آگے بڑھا رہی تھی کہ پاؤں زمین نے پکڑ لیے۔

”مگر میں کیا کروں اپنے دل کو کیسے سمجھاؤں؟“

”تم ایسا کرو کہ پشینہ کا رشتہ مانگ لو شہباز

خان کے لیے اگلے خان سے۔“

”مگر آپ جانتے بھی ہیں کہ اسے میں.....“
بڑے داہی کی آواز سماعتوں سے گھرائی تو ہل بھر میں اسے ذلت کے احساس نے پسینے پسینے کر دیا۔
وہ شاہ گل کا پورا جواب سننے سے پہلے ہی چائے لے کر اندر آگئی۔

شاہ گل نے مزید کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہوا تھا کہ اسے دیکھ کر خاموش ہو گئیں۔

وہ چائے دے کر تیز قدموں سے باہر آگئی۔
گھر کے درمیان بڑا سالان تھا۔ جس کے دونوں طرف آئے سانسے دونوں بھائیوں کے پورٹن تھے۔

وہ لان میں آکر بیٹھ گئی۔ دونوں طرف کے برآمدوں سے روشنی آرہی تھی۔ وہ یہاں بیٹھ کر سکون سے کچھ سوچتا چاہ رہی تھی۔ امتحانات ختم ہو چکے تھے۔ اب رزلٹ کا انتظار تھا اور جیسا کہ عموں کی قیادت روایت تھی کہ کالج ختم ہوتے ہی لڑکیوں کی شادی کر دی جاتی تھی بلکہ زیادہ تر کا تو میٹرک کے بعد ہی یہ فیصلہ ہو جاتا تھا اور کالج تک جانے کی کوہنہ بھئی نہ آتی تھی۔ یہ تو گاؤں کے قریب کالج بننے کے بعد ہی لڑکیوں کو سہولت ہوئی تھی کہ میٹرک سے آگے پڑھ سکیں۔

کتنی حسین دنیا ہوتی ہے ان کہانیوں اور افسانوں کی، ایک ہیروئن کے لیے چاہنے والے پھر وہ کسی ایک کو منتخب کرنے سے اور اختتام پر دونوں راضی خوشی زندگی گزارنے لگتے ہیں..... میری کہانی میں بھی یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن اس کہانی کی ہیروئن میں نہیں بلکہ ودانہ عسکر خان ہے۔

”کیا ہو رہا ہے چھوٹی؟“ مردانہ آواز سن کر وہ کھڑی ہو گئی۔

شہباز خان اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”کچھ نہیں لالہ! بس تازہ ہوا لینے کے لیے باہر آئی ہوں۔“

”بیٹھو۔“ اشارہ کرتے ہوئے وہ خود بھی بیٹھ

”اچھا نہیں کیا میرے ساتھ تم لوگوں نے۔“
وہ افسردہ تھا۔

”سب نصیب کے فیصلے ہیں لالہ! ہو سکتا ہے آپ کے نصیب میں اس سے بہت اچھی لڑکی لکھی ہو۔ اسے سلی دینی آتی تو وہ خود کو ہی بھجالتی۔“

”مجھے اس سے کم یا زیادہ نہیں بس وہ ہی ہے۔“

”پھر اللہ سے دعا مانگیں خوب رورو کر کیونکہ اللہ بریں بدلنے کی طاقت دعاؤں کو ہی نصیب ہوئی ہے۔“

”تم جانتی ہو کہ میری ہر دعا میں وہ رہتی ہے بلکہ مجھے تو دعا میں مانگنے کا طریقہ ہی اس کی محبت سے سیکھا ہے۔“

میرے لیے سب سے تکلف وہ بات یہ ہے کہ وہ اس رشتے پر خوش ہے، جس کی خبر نے ہی میری آدمی جان نکال دی تھی اور اب بانی کی آدمی اس کی خوشی اور اطمینان نے نکال دی ہے۔

”لالہ! میں نے تو پڑھ رکھا ہے کہ محبت میں محبوب کی خوشی اپنی خوشی سے زیادہ اہم ہوتی ہے۔“

”نہیں، کتابوں میں جو لکھا ہوتا ہے وہ سب سچ نہیں ہوتا۔ محبت میں جدائی اور بے وفائی دو قاتل ہیں۔ دونوں آدمی کو مار دیتے ہیں۔“

ان کے لہجے میں ٹوٹنے والی دل کی کڑیوں کی جہن محسوس ہو رہی تھی۔

”مگر آپ تو پھر بھی زندہ نظر آ رہے ہیں۔“

وہ عجیب سے لہجے میں بولی تو وہ درد دبا کر بولا۔

”ضروری نہیں کہ جو زندہ نظر آ رہے ہوں، وہ زندہ ہوں بھی۔“

وہ اٹھنے لگی۔ اسے اس سے زیادہ غمگین اناٹا لگ ہضم نہیں ہوتے تھے بلکہ کہانی میں جہاں ایسے اداس سین آتے وہ دو چار صفحے پلٹ کر سیدھی پڑھنے سے منہ پھریا جاتی تھی۔

”مجھے مرے ہوئے لوگوں سے بہت ڈر لگتا ہے لالہ اور ابھی ابھی آپ نے خود اپنے آپ کو کہہ دیا کہ آپ زندہ نہیں ہیں۔“ وہ ماحول کی سنجیدگی کم کرنا چاہ رہی تھی

وہ اس کے خوف زدہ ہونے کی ادکاری پر مسکرا دیا۔
”سنو! وہ تو سامنے ہی نہیں آرہی اسے کہنا محبت میں نے کی تھی اس لیے اسے درد بھی مجھے سہتا ہے۔ تم کیوں منہ چھپائے پھر رہی ہو، اگر دل میں کوئی احساس غمات ہے بھی تو یہ بوجھ اتار دو۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی ایک تکلیف وہ مجھ ہی اس کی زندگی میں آئے۔“

”جی لالہ! میں کہہ دوں گی وقتی..... اور فطری بات ہے سب کو علم تھا کہ آپ کا رشتہ آیا ہوا تھا اور سب سے پہلا حق آپ کا بننا تھا۔ اب یہ لوگ خود کو گھٹی ضرورت محسوس کریں گے۔“

وہ روایتی اور افسانوی دن نہیں بننا چاہتی تھی ورنہ ایسے موقعوں پر ٹوٹ کھاتی ہوئی نیکی سازش کر کے سارے معاملات خراب کرتی ہے۔ لیکن وہ ڈائجسٹ کی دیوانی اچھی طرح سے جانتی تھی کہ اس طرح نفرت اور انتقام کی راہ اپنانے والوں کو وقتی کامیابیاں تو ملتی ہیں لیکن اختتام میں وہ وین بن کر ناکام ہی رہتے ہیں، بھی پاگل خانے اور بھی نیل کے علاوہ بھی ایسے مفتی سوچ والے جوئے لوگوں کا انجام برائی دکھایا جاتا ہے اور وہ اچھا انجام جانتی بھی اپنی زندگی کا..... کون والا نہیں، ہیروئن والا انجام۔ وہ اندر جا چکے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھ دعا کے لیے پھیلا دیے اور دل ہی دل میں وہ مانگنے لگی جو سب کے سکون کا سبب بن جائے۔

☆☆☆

شاہ گل کا مزاج قدرے بہتر ہو گیا تھا۔ داہی اور مور جاننے کے علاوہ بڑے داہی، ان کی بیوی اور ودانہ بھی مطمئن لگ رہے تھے، شاید گاؤں والوں کے مفاد نے انہیں خاموش کر دیا تھا۔

بس بے چین تھی تو وہ۔ اسے بڑے داجی کے وہ الفاظ بہت تکلیف دے رہے تھے جنہیں سن کر آئی تھی۔ شہباز خان اسے بڑے بھائیوں کی طرح عزیز تھا۔ وہ اچھی شکل و صورت کا مالک ایک سکھا ہوا انسان تھا۔ شاہ گل کے دو بیٹے تھے۔ ایک چھوٹا شاہ میر خان تھا جو ہمیشہ پڑھائی میں ہی لگا رہتا۔ جب بھی شاہ گل آتیں۔ وہ باپ کے ساتھ گھر میں رہتا تھا شہباز خان بچپن سے ماموں کے گھر میں خوش ہوتا تھا۔

ہوتے ہیں کپڑے کتنوں بھرے اور آنکھوں میں وحشت..... ت..... ت.....

وہ جھینپ مٹاتے ہوئے اول فول بول گئی۔ اس کے کھڑے بالوں اور کٹنوں بھرے کپڑوں کے ساتھ آنکھوں سے غصہ وحشت بن کر نکلا رہا تھا۔

”نہیں نہیں شاہ میر لالہ! پاگل تو اپنے بال بھی دونوں ہاتھوں سے نوچتے ہیں۔“

پشیمین نے وہ اندک ہاتھ پکڑا ہوا تھا جیسے ڈر ہو کر وہ بھاگ جائے گی اور اسے اکیلے ہی شاہ میر کے غصے کو جھٹکنا پڑے گا۔

جائے کیوں شاہ میر خان کو شرارت سوجھی اور اس نے کتاب قریب رکھی میز پر رکھتے ہی دونوں ہاتھوں سے اپنے قدرے لمبے اور گلی بال پکڑ لیے۔ یہ منظر دیکھتے ہی وہ ساتھ میں وہ اندک گھٹینے ہوئے تیزی سے بھاگ گئی۔ جب تک وہ لوگ شاہ گل کے گھر رہے۔ وہ ڈر کے مارے نظروں اٹھا کر اسے نہیں دیکھتی تھی۔

وہ ماضی کے جھروکوں سے کھینچ کر نکلتی تھیں تاریک فضا میں واپس آ چکی تھی۔ وہ اندک بچاؤ نونوں ہاتھ میں لیے اندر داخل ہوئی اور اشارے سے بڑے کراڑک خان کا فون ہے۔ اشارہ اس نے بڑے ہی لوفرانہ طریقے سے دل پر ہاتھ رکھ کر کیا تھا۔ وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”کیا ہے اس لڑکی میں جو بھج میں نہیں ہے، افسانوں اور کہانیوں میں تو سوانحی سوانحی اور عام سی شکل صورت والی ہیروئن کو بھی رانیترو ازم ایک پلٹ خوب صورت ہیرو کے دل کی رانی بناتی ہیں لیکن یہاں تو کسی کو میری خوبصورتی یا میری اچھی بچہ سے کوئی سروکار ہی نہیں۔“

بچپن سے جس نے بھی ہم دونوں کو دیکھا، یہ ہی کہا وہ اندک خوب صورت ہے لیکن پشیمین جو کوشش ہے، وہ کم ہی لوگوں میں ہوتی ہے۔

”ٹھیک ہے میری شاہ گل کی خوب خاطر مدارت کیجئے گا اور میں شہباز لالہ کو ہر طرح سے متاثر

کرنے کی کوشش کرنا۔ اوکے؟“

جب سے رشتے کی بات شروع ہوئی تھی وہ بہاؤ لالہ نہیں کہتی لیکن اب اس بے چارے کو ہر سے لالہ بنا دیا تھا وہ اندک نے۔

”کل شام کو سب کی دعوت ہے میری سرال میں..... تم بھی ذرا تیار ہوا کر جانا۔ آخر کو میری عزت کا سوال ہے۔ وہ اندک سرخان کی ایک ہی بہن ہو۔“ وہ اندک نے ہونے کو کہہ ہی گئی۔

”ہاں تم تیار کر دینا دینا ہی جیسا خود ہوتی ہو ٹوب لپا پوتی کے باوجود یوں لگتا ہے سب نیچرل ہے۔“

”میرے جیسا گلنے کے لیے میرے جیسا حسن بھی تو چاہیے تا میری بہنا۔“ وہ آئینے کے سامنے مغرور انداز میں کھڑی ہو کر خود کو ہر زاویے سے دیکھ رہی تھی۔

”حسن محض پچھلے دورہ ہے۔ یہ جوانی کے پاس بڑھاپے کی امانت ہوتا ہے۔ بڑھاپا اسے لینے یوں چپکے سے آتا ہے کہ پتہ نہ کو اس کے قدموں کی آہٹ بھی سنائی نہیں دیتی۔ حسن کو وقت کے ہاتھوں ہمال ہوتا ہی ہوتا ہے۔ بڑی بڑی کھسار یوں کی گہری گہری باتیں پڑھ کر بھی نہیں اس نے..... کوئی مذاق تو نہیں تھا۔“

وہ اسے دیکھنے لگی۔

”چلو یار مان لیجہاری فلسفیانہ بات۔ ایک تو اس شہباز خان نے ذہنی طور پر تھکا دیا ہے اوپر سے تم بھی مشکل باتیں کر رہی ہو۔“

”ٹھیک ہے، میں کپڑے نکالتی ہوں۔ آخر پہلی بات میری سرال جاری ہوں۔ اب سے پہلے تو رشتے داری اور پھر گلونہ کا گھر سمجھ کر جانی تھی۔ اب اپنی بہن کی سلطنت سمجھ کر جاؤں گی۔“ وہ گل ہی گئی تھی اس بات پر۔ پشیمین نے الماری کھول کر لباس منتخب کیا اور پھر الماری کے خلیے خانے میں لکڑی کی ڈگری پر پناہ سے سجی میچنگ چوڑیاں نکالنے لگی۔

☆☆☆

”کیسی ہیں آپ؟“ وہ حال پوچھ رہا تھا۔ پشیمین نے بہت دعا مانگی تھی کہ اس سے سامنا ہی نہ ہو۔ کسے اچھا لگتا ہے، بار بار زخم چھلتا رہے اور وہ درد سہتا رہے۔

”ٹھیک ہوں۔ خوش باش۔ فٹ فٹ۔“ وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر نظروں سے چرائی۔ اس کی مردانہ وجاہت، نگاہوں کو خیرہ کر دینے والی روشن آنکھیں اور لباس سے اٹھتی پر فیم کی خوشبو۔ ”ایک تو ہمیشہ ہیرو ایسا پر فیم استعمال کرتا ہے جو سانسوں میں اترتے ہی تازگی کا احساس دلاتا ہے۔“ وہ لمبی سی سانس لے کر سوچتی رہ گئی۔

وہ شہباز لالہ کی طرف دیکھ رہی تھی جو تنقیدی نظروں سے اس کا جائزہ لے رہے تھے۔

شاہ گل کی آنکھوں میں پسندیدگی کے ساتھ ساتھ حسرت بھی تھی شاید وہ شہباز لالہ کی تعلیم حاصل کرنے کی خواہش کو مذہدار یوں کے بوجھ تلے دبا کر مارنے کا جرم تقدیر کے ذمے نہیں بلکہ اپنے ذمے لگا رہی تھیں۔ وہ اندک کے دونوں بیٹے قابلیت میں کسی سے کم نہیں تھے۔ وہ سب کھانے کے بعد گپ شپ کر رہے تھے کہ گلونہ اس کے کان میں منمنائی۔

”چلو، میرے کمرے میں چلتے ہیں بزرگوں کی بورنگ محفل سے نکلو یار!“

وہ اسے بازو سے پکڑ کر اپنے کمرے میں لے آئی۔

”تم بیٹھو میں قبوہ اور گڑے کر آتی ہوں پھر گپ شپ کرتے ہیں۔“ وہ اسے کمرے میں۔ چھوڑ کر باہر نکل گئی۔

وہ بوٹی گلونہ کے کمرے میں گئی ایک شیلٹ پر کتابیں دیکھنے لگی۔ کچھ خواتین رانیترو کے ناول تھے جو اس نے گلونہ کو کہہ کر پڑھنے کی تحریک دی تھی ورنہ وہ کسی کی ماری پڑھنے پر سوئے تو تین دن بیتی تھی۔

”ارے یہ کیا؟ یہ تو بی ناول ہے جو پچھلے ایک

جبکہ یہ لوگ جب وہاں جاتے تب بھی وہ ایک طرف کتاب کھولے پڑھتا ہوتا۔ اس کی دوستی کسی کے ساتھ نہیں تھی نہ ہی ذہنی تھی کسی سے، بس وہ وقت ضائع نہیں کرتا تھا۔ شہباز خان اور شاہ میر خان میں صرف دو سال کا فرق تھا۔ شہباز پڑھتا لیکن بہت ہی گھٹنے تلے والی شخصیت تھی اس کی۔ اسی لیے وہ سارے خاندان میں مقبول تھا۔ جبکہ شاہ میر کو سب ہی مغرور، گھمنڈی اور جانے کیا کیا کہتے تھے۔

اسے یاد تھا ایک بار وہ عید پر ایٹ آباد گئے تھے۔ وہاں سے سب نے تقاضا کی جانے کا پروگرام بنایا مگر شاہ میر صاحب اڑ گئے کہ میر کی پچھلیوں کے فوری بعد میٹ ہیں اس لیے وہ نہیں جاتیں گے۔

”وہ اندک یہ شاہ میر لالہ کا ماضی تو ازان کچھ ٹھیک نہیں لگتا؟ اب دیکھو کوئی گلیات کی سیر پر جانے سے بھی انکار کر سکتا ہے صرف اور صرف پڑھائی کی وجہ سے..... میرے تو اگر سالانہ امتحان بھی ہو رہے ہوں تو میں درمیان میں چھوڑ کر چپکے سے نکل جاؤں۔“

وہ اپنی ہی رو میں تیز تیز بول رہی تھی جیسے ہی پیچھے مڑی وہ کتاب سمیت دونوں بازوؤں کو سینے پر باندھے بائبل تربیب ہی کھڑا نظر آیا۔ اس کی آنکھوں میں لکھا تھا۔ شرم کر لڑکی میں نے تمہارا کیا پکاڑا ہے جو میری فیبت کر رہی ہو؟

”شاہ میر لالہ! میں نے آپ کو بائبل تو نہیں کہا پاگل آپ جیسے تو نہیں ہوتے۔ ان کے تو بال بھرے

سال سے گلوں کو پڑھنے کے لیے دے رکھا ہے مگر اس نے اسی وقت دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر تو لے ہوئے کہا تھا۔

”ظالم یہ تو تیرا ہم وزن ہے اسے ختم کرتے ہوئے میرے تو بال بھی سفید ہو جائیں گے اور شاید دانت بھی ٹوٹ کر گر جائیں۔“

وہ ناول میں سے گرے کاغذ کو زمین سے اٹھا
 کر دیکھنے لگی کہ شاید یہاں تک پڑھ لیا ہے اس سب
 لڑکی نے اور یہ کاغذ بطور نشانی درمیان میں رکھا ہوا
 ہے۔

”یہ تو میری رشتگی ہے؟“ افسانہ خدایا اس کے جسم سے جیسے جان ہی نکل گئی، اکثر ناظرین میں پیرس رکھا تھا کہ ہیر وینس دل کی ساری کیفیات ڈائری میں جھپکتی ہیں یا ہیر وکے نام خط لکھ کر ڈائری میں چھپائے رکھی ہیں اور ہیر و جوان کی محبت سے بے خبر ہوتے ہیں، اتفاق سے وہ ڈائری ان کے ہاتھ لگ جاتی ہے جس کے بعد وہ تن من دھن سے ڈائری لکھنے والی کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ ودانہ کی منگی کے بعد جب وہ کالج پہنچی تھی اور اسے گولڈ کی زبانی یہ بتا چلا تھا کہ رات کوئی غلط نہیں نہیں ہوئی بلکہ ازراک خان نے ودانہ کو یہ پسند کیا تھا تب کچھ زیادہ یہ جذبہ پائی ہو کر اس نے رجسٹر سے کاغذ چٹاڑا اور اس سنگدل انسان کے نام خط لکھنا شروع کر دیا تھا۔

جس میں اس نے اپنی دلی کیفیات اور پھر ان سوچوں اور خواہوں کا اس قدر غیر متوقع انجام لکھ کر قسمت سے شکوہ کیا تھا اور اختتام پر ایک پھڑکنا ہوا شعر بھی لکھ دیا تھا پھر جب جی کچھ ملکا ہو گیا تو اس کاغذ کو تہہ کر کے رجسٹر میں رکھ دیا اسے کسی قسم کا خوف نہیں تھا کہ یہ کاغذ کوئی دوسرا پڑھ سکتا ہے کیونکہ اس کے بیک کو کوئی بھی ہاتھ نہیں لگا تھا۔

دو تین دن کے بعد جب اس نے کسی کام کے لیے رجسٹر ہوا تو اس میں سے وہ کاغذ غائب تھا وہ پھر بھی پریشان نہ ہوئی کیونکہ اس نے کاغذ کے نیچے اپنا نام کسی اور کا نام نہیں لکھا تھا، بس مخاطب کو آپ لکھا تھا

اور نیچے اک نامراد لڑکی لکھ دیا تھا۔
 ”اگر کوئی پڑھے گا بھی تو اسے کیا خبر کہ یہ سب
 جبینہ طلسم خان نے لکھا ہے۔“ یہ سوچ کر وہ مطمئن
 ہو گئی تھی۔

اور آج وہ کاغذ گلوٹن کے کمرے سے ملا تو اس کا حال عجیب سا ہو گیا تھا۔

”کیا سوچتی ہو گی گونہ؟ میں کس قدر گئی گزری
 لڑکی ہوں کہ اس کے بھائی کے عشق میں گرفتار ہو کر
 بھی آزاد نظر آنے کی اداکاری کر رہی ہوں؟ کتنی
 گہری ہے وہ کہ سب جان کر بھی انجان بنی پھر رہی
 ہے، وہ کسی کے کھٹکھٹانے کی آواز سن کر تیزی سے
 مڑی۔

”تو آپ نے اپنا اعتراف نامہ یا محبت نامہ دیکھ ہی لیا؟“

ازرک خان کی آواز سن کر وہ حیرت سے اچھل پڑی۔

”یقین کریں، مجھے جب گلہ بنے کہ آپ نے اپنا
کہ اس نے آپ کو گلاب میں بہت سے سجیلا ہے کچھ
لکھتے ہوئے دیکھ کر آپ کے بیک کی حلائی کی اور اس
میں سے یہ کاغذ نکال آیا تو یقین کریں میں حیران
گیا جب اس کاغذ پر لکھی آپ کے دل کی سچی پکار
میرے دل کی دھڑکنیں سے ترتیب کر گئی تب سب
کچھ میرے ہاتھ سے نکل نکلتا۔“

وہ مردانہ وجاہت کا شاہکار، قابل ترین مرد
اس کے روبرو بالکل تریب ہو کر کھڑا ہوا گیا تھا۔ اس
کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ جو بابا کیا ہے۔ بس وہ
منہ کھولے کچھ شرمندہ، کچھ حیران و پریشان سی اسے
فکر کر دیکھنے لگی۔

”تم نے لکھا کہ پہلی نظر میں ہی وہ مجھے اتنا اچھا لگا کہ میں نے اپنے دل کے سارے دروازے اس کے لیے کھول دیے بنایہ سوچے کہ وہ دستک دے گا یا نہیں۔“

پیشینہ کی انفریس زمین پر گڑی تھیں۔ وہ سوچ رہی تھی۔ کاش زمین میں غائب ہو جاؤں۔

”اف میرے خدایا کلو نہ کو بھی سب پتا چل گیا اور اسے بھی جواب ودانہ کے منگتی کی حیثیت میں رہنے والا بہنوئی بننے والا ہے۔“

”آپ کو شرمندہ ہونے کی فطری ضرورت نہیں
 فطری جذبوں کے سامنے ہم بند کی صورت بھی
 بنا دھ سکتے۔ میں آج آپ کے دل کے

اڑے پر دستک دیتا ہوں اور یہ درخواست کی کہ پلڑے ایک بار یہ درکھول کر مجھے اندر آنے میں جانا ہوں، آپ وہی دل میں یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ تو پہلے سے اندر آ رہے ہیں۔ وہ اس کے اتنے قریب آ کر کھڑا ہو گیا تھا کہ اس کے سانسوں کی گرمی پھیندنا اپنے چہرے پر رکھ کر ہی سمیٹ رہی تھی۔ وہ کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر اس کے لیے کی غلطی کر چکی تھی۔ اس نے بھی پوری قوت سے جھنجھکیا۔ پھر ایک غیر متوجہ سائین ہوا۔

ایک دم سے ازگڑ خان نے پشینہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لگا جیسے جلتے ہوئے انگارے سے اس کا ہاتھ چسوا دیا ہو۔ دوسرے ہاتھ میں موبائل فون تھا جبکہ بائیں ہاتھ کے ہاتھ پکڑنے سے بچنے لگا تھا۔

”چھوڑیں میرا ہاتھ۔ پلیز چھوڑ دیں۔“
 نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے تقریباً
 لڑھی ہوئی آواز میں کہا تو ہر افسانے، کہانی، فلم،
 آواز والے ڈائلاگ اس کے منہ سے نکلا۔

”یہ ہاتھ میں نے چھوڑنے کے لیے لوہا
پکڑا پشیمنا طلسم خان!“

پشیمین کا پورا وجود دھیرے دھیرے کانپ
 تھا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چپکنے لگے
 اور وہ سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ لیکن اسے ہمت کرنی
 کیونکہ یہ سب جو چند لمحوں میں ہو گیا تھا۔ یہ بہت
 گھٹایا لگ رہا تھا اسے۔

”ازرک صاحب! میں کوئی ایسی دینی نہیں ہوں۔ آپ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ ایک عزت دار باپ کی بیٹی ہوں۔ اس طرح اگر کے ساتھ اکیلا مجھے کمرے میں کسی نے دیکھ

میرے خاندان کی بہت بدنامی ہو چکی تھی۔ اس لیے برائے مہربانی آپ مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔۔۔۔۔
 ورنہ میں کرے سے باہر نکل جاؤں۔ مجھے لگتا ہے کہ گھونہ بھی اسی سارے معاملے میں شریک ہے ورنہ وہ مجھے یوں کرے میں اکیلا چھوڑ کر خود غائب نہ ہو جاتی۔“ وہ روہا کی ہو گئی تھی۔

”نہیں۔ مگھونے کو اس معاملے کی کوئی خبر نہیں ہے کہ میں تم سے یہ باتیں کرنے یا تمہاری کا فائدہ اٹھانے آیا ہوں اسے میں چاہیے اور اس کریم دے کر آیا ہوں وہ آدھے مٹنے میں ختم کر کے ہی واپس کرے میں آئے گی۔“

وہ ڈھٹائی سے وہیں کھڑا رہا۔ بہن کے
ندیدے بہن کی خبر تھی ایسے بھی۔

”مجھے آپ جیسے تعلیم یافتہ انسان سے اس سب کی توقع نہیں تھی۔ میں تو اس بات پر حیران ہوں کہ آپ نے اتنا عرصہ باہر رہ کر بھی کچھ نہیں سیکھا۔
رہنے اور ان کا احترام، معاشرتی انفرادہ، مذہبی انفرادہ، اتنی تعلیم اگر علم کی روشنی میں کر آپ کو اندر سے منور نہ کر سکی تو کیا فائدہ اس تعلیم کا؟“

وہ صاف بات کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی کیونکہ
بل پر ہمیں وہ موصوم لڑکی عسکری کی بیٹی تھیں۔
گرچہ کبھی نہیں۔ گمنام کے رشتوں کے بھیا تک انجام
اسے یاد آئے۔ سچ حقیقتوں سے پردہ اٹھانی مٹی
کہانیوں کے عنوان اسے لمحہ مٹن کے یاد آ رہے
تھے۔ ایسے موقعوں پر سارٹ اور ڈین لڑکی بننا پڑتا
تھا اور وہ بے وقوفانہ سوچوں سے چھٹکارا حاصل
کرتی تھی، اب باعزت انجام بھی مل جائے اس عجیب
کی کہانی کو۔

”باہر رہ کر میں نے یہی سیکھا ہے کہ بغیر شادی کے بھی رشتہ میں رہا جاسکتا ہے۔ اسی لیے میں نے آپ کو دل کی گہرائیوں سے یہ آفر دے رہا ہوں کہ شادی تو میں آپ کی کزن دانہ سے کروں گا لیکن ہم دونوں زمانے سے چھپ کر ایک دوسرے سے رشتہ میں رہیں گے، میں جانتا ہوں آپ کو اس

کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“
وہ دم بخود کھڑی بے چینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔
”میں آپ کے سامنے آج ایک اعتراف بھی کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے اس لڑکی ودانہ میں کوئی دلچسپی نہیں، ایسی میک اپ کی دوکانیں تو میرے ارد گرد ہر وقت موجود رہتی ہیں۔ جانے کیوں مجھے وہ لڑکی لگتی ہے۔۔۔۔۔۔ اگر مجھ سے میری پسند پوچھی جاتی تو میں تمہارا نام لیتا لیکن۔۔۔۔۔۔“
وہ چپ ہو گیا گھونٹنے تو اسے سب بتایا ہوا تھا یہ بھی کہ لالہ نے خود ودانہ کا انتخاب کیا ہے اسی لیے تو وہ محبت نام کے دانے پر بھوک چڑیا بن کر نکلیں چھٹی۔
وہ لکھ اسے یاد آتی تھی۔۔۔۔۔۔

بات چچی ہے
بات کڑی ہے
بات بھاری ہے
عورت بھوک چڑیا
محبت دانہ گندم کا
اور مرد باہر شکاری ہے۔
وہ سمجھ چکی تھی کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ ودانہ کو اپنا نام دے کر عزت بنانا اور اسے محبت کے نام پر بے عزت کرنا۔

”ودانہ ہر لحاظ سے آئیڈیل لڑکی ہے، مخلص سچی اور حسین ترین۔۔۔۔۔۔ آپ کو اپنی قسمت پر رشک کرنا چاہیے بلکہ اللہ کا شکر ادا کریں۔“ وہ سر اٹھا کر بات کر رہی تھی سامنے والا اسے بالکل بونا لگ رہا تھا۔

”اس میں وہ سب نہیں ہے جو تم میں ہے۔۔۔۔۔۔ لیکن میں مجبور ہوں اور اپنی مجبوری تمہیں بتاتا ہوں اس شرط پر کہ کسی کو اس راز میں شریک نہ کرنا کسی سے کہو یہ بھی تو سب یہی نہیں سمجھیں گے کہ تم جوٹ بول رہی ہو۔ صرف اس لیے کہ بچا زاد بہن سے جلس ہو رہی ہو۔ اس کا اتنے قابل ڈاکٹر سے رشتہ جو ملے ہو گیا ہے۔ سو صرف اس لیے تمہیں اس راز میں شریک کر رہا ہوں کہ تم میری مجبوری سمجھ سکو۔

میرے والد نے وہ قیمتی زمین حاصل کرنی ہے اور تمہارے بڑے دامی کی اور ان کی بیگم کی ملکیت ہے اس کر دوں کی زمین کی وارث ودانہ خان ہے اور ہمیں امید ہے کہ اسپتال کے نام پر وہ زمین جلد ہی مجھے ملنے والی ہے۔ بس اس کے سوا کچھ نہیں تمہاری کزن میں۔“
وہ ساکت سی کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔

اس کی قربت اور جسم سے آتی ہوئی پشیمند سانس رکھنے لگا تھا۔ اس نے لمبی لمبی سانسیں لیں اور خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔
”تو ہاتھ لالہ والے سارے عزائم محض باتیں ہیں؟“ اس نے پوچھا تو وہ عجیب و غریب والے اسٹائل کا قہقہہ لگا کر بولا۔

”پشیمند افسانہ خان! تم بھی بھولی ہو اور تمہارا سارا خاندان بھی۔ میں بھلا اس چوٹ سے گاؤں میں کام کر کے اپنا مستقبل برپا کروں گا؟ میرا دام اتنا بھی خراب نہیں۔ ہاں شادی اور جائیداد ملنے کے بعد ودانہ کو والدین کی خدمت کے لیے بھیج دیں۔۔۔۔۔۔ میں باہر واپس چلا جاؤں گا۔ ہاں تم اگر میرے ساتھ چلنا چاہو تو میں بخوشی سارے معاملات دیکھ لوں گا۔ اسٹوڈنٹس ویز یا آسانی لگتا ہے۔ بس پیسے لگتے ہیں پھر ہم دونوں وہاں پہنچ جائیں گے جہاں کسی کے ہاتھ ہم تک نہیں پہنچ سکتے۔“

وہ یوں بول رہا تھا جیسے دنیا اس کے قدموں تلے ہو اور ہر کام اس کی مرضی سے ہوتا ہے۔
وہ مزید کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اسی اثنا میں دروازہ کھلا اور گھونٹ اندر آئی اس کے ہاتھ میں چاکلیٹ اور ڈسے میں آئس کریم کا باول نظر آ رہا تھا۔ از رک خان نے برا سامنہ بنا گھونٹ کی طرف دیکھا تو وہ جھٹ سے بول پڑی۔

”لالہ! آپ کو شہباز لالہ بلار ہے ہیں حجرے میں۔“
وہ پشیمند پر ایک الوداعی نظر ڈال کر باہر نکل گیا۔ پشیمند قریب رہی کرسی پر جیسے ڈھسے گئی۔ گھونٹ

کا دیدار غظروں سے زمین پر پڑے کاغذ کی طرف تھا، اس کے ماتھے پر بھی پیسے کے قطرے چمکنے لگے۔
”ایسی ہوتی ہیں سہیلیاں؟“ اس نے جھک کر لالہ اٹھایا اور اس کے سامنے لہرا کر سوالیہ غظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تو اس کی نظریں جھک گئیں۔

”میں بہت شرمندہ ہوں پشیمنے۔ یہ سب غلطی ہو گیا۔ میری سب سے بڑی خطا یہ ہے کہ میں یہ کاغذ لالہ کو دکھا دیا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ تمہاری عزت نفس کو بھینس لگے گی۔ لیکن بخدا میرا مقصد بڑا اچھا اور معصوم سا تھا۔ میں جانتی تھی کہ تمہاری محبت کے بارے میں جان کر لالہ تمہیں انہیں لیں۔ میں یہ سب تمہاری محبت میں کر رہی لیکن بعد میں احساس ہوا کہ اس وقت کا وقت گزر گیا ہے۔ لالہ کے مقاصد بہت اونچے ہیں۔ عشق اور محبت ان کے سامنے بالکل ہی حثیت رکھتے ہیں۔ وہ غریبوں کو علاج کے لیے بہترین سہولیات مہیا کرنا چاہتے ہیں۔“

وہ چپ چاپ اسے دیکھتی تھی۔ وہ غیر محسوس انداز میں ہاتھ میں پڑے کاغذ کا گولہ بنا رہی تھی جو اسے میں نہیں چھینک کر اپنے خلاف ثبوت مٹانا پڑتا تھا۔

وہ باہر نکلنے لگی تو گھونٹ نے اس کے دوپٹے کا پلو ہاتھ سے پکڑ لیا۔
”پہلے مجھے معاف کرو گی تب باہر جانے دوں گی۔“
اس نے آہستگی سے دوپٹے کا پلو چھڑا کر کھلے کپڑوں کو اک ادا سے جھٹکتے ہوئے کہا۔
”جانتے معاف کیا۔“ اور اسے ہکا بکا چھوڑ کر اٹھ نکل آئی۔

☆☆☆
”کیسے لگ رہے تھے از رک خان؟“
ودانہ کے کنبے میں اشتیاق تھا۔
وہ ان کی واپسی کی راہ بڑی بے قراری سے

دیکھ رہی تھی۔
”خاہر ہے جیسے ہیں دیے ہی تو لگ رہے ہوں گے۔“ تو جی چاہ رہا تھا، اس گھٹیا انسان کی ہر بات اسے تادے لیکن ودانہ سمیت کوئی اس کی بات کا یقین بغیر ثبوت کے نہ کرتا۔ اس لیے وہ کچھ اور سوچ رہی تھی اور اس سوچ ہر عمل کرنے کے لیے اسے شہباز خان کے فون کا انتظار تھا جو از رک خان کے کمرے آتے ہی کہیں نکل گیا تھا۔

”مطلب کہ حسین۔ پشیمند اور گریس فل؟“
وہ کنبے کو دیں رکھے بیڈ پر بیٹھی تھی۔ ودانہ کی بات سن کر شرارت سے نکل اسے ہارے ہوئے بولی۔
”ہاں جیسا کہ تمہیں لگے ضروری تو نہیں کہ سب کو وہ وہاں ہی نظر آئے۔“

وہ کنبہ سے کمرے کے سینے سے بچھتے ہوئے غمور آنکھیں اس پر جمائے گا نہ تھی۔
وہ سب تو سوہنڑیا
ہائے وے سن موہنڑیا
میں تیری ہوئی
پیاروچ کھوئی۔“
فون بجنا تو پشیمند باہر نکل آئی
”جی لالہ! کچھ پتا چلا؟“ وہ سرکش میں پوچھ رہی تھی۔

دوسری طرف سے آتی آواز کو سنتے ہوئے اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی کہ کوئی بے سب کن نہ رہا ہو۔

☆☆☆
وہ بڑے سے ہال نما کمرے میں چائے کی ٹرے سمیت اندر داخل ہوئی تو بڑے دامی دونوں بہن بھائی کے ساتھ سامنے کچھ کاغذات رکھے بیٹھے تھے۔

”میرا مشورہ نامیں لالہ! تو ابھی اسے باور آف انٹاریٹی نہ دیں۔ شادی کے بعد سب کچھ تو ویسے بھی ودانہ بیٹی کا ہو جائے گا۔ اس لیے شادی ہونے

دیں۔

وہ چائے پیالیوں میں ڈالتے ہوئے تشریف
بھری نظروں سے میز پر رکھے کاغذات کی طرف دیکھ
رہی تھی۔

”میں چاہتا ہوں، جلد سے جلد کام شروع کر
دیا جائے۔ کچھ مہینہ پہلے گا اور وہی پیسے اسپتال کی
تعمیر پر لگائیں گے۔ ایک آخر آئی ہے تمہاری بھابی
کے جسے کی بھری زمین کے چودہ کروڑ دے رہے
ہیں وہ لوگ لیکن زمین اس سے زیادہ قیمتی ہے۔ میں
نے سوچا ہے کہ شام کو ازراک بیٹے کو اس کے والدین
سمیت بلا لیتے ہیں۔ کھانا بھی اچھے کھالیں گے اور
اس موضوع پر بات بھی کر لیں گے۔“

وہ چائے کی پیالی ان کے ہاتھ میں پکڑا کر
پریشانی سے سوچ رہی تھی کہ جیسے وہ چاہ رہا ہے سب
ویسا ہی ہونے والا ہے۔ آج کی لڑکی ہوں۔ میں
مضبوط اور ہوشیار۔ مجھے ہرانا آسان نہیں ہوگا ازراک
خان؟“

وہ ڈائجسٹ ریڈر تھی۔ ڈائجسٹ جس میں
عورت کو ہر طرح سے خود کو منوانے دکھایا جاتا ہے۔
وہی عورت تو اس کی آئیڈل تھی۔ وہ خوابوں کی راہ
گزر رہی تھی۔ حقیقت کی دنیا میں قدم رکھ چکی تھی
اس کے چہرے پر ایک غم تھا۔

☆☆☆

”جی داجی! میرے ایک جاننے والے ہیں جو
الوٹھیں سے آئے ہیں اور وہ یہاں زمین لینے میں
دھچکیں رکھتے ہیں۔ انہوں نے اٹھارہ کروڑ کی آخری
پے میرے خیال میں اس سے اچھے پیسے نہیں مل سکیں
گے۔“

ازراک خان بڑی سنجیدگی سے اندرونی خوشی
چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا تو داجی نے سر
ہلاتے ہوئے فائل بیوی کے سامنے رکھ دی۔ قریبی
صوفے پر ازراک خان کے والدین بھی بیٹھے تھے جن
کے کھلے چہرے اس بات کے گواہ تھے کہ وہ بیٹے
کی عزت افزائی پر بہت شاداں ہیں۔ شاہ گل کے

چہرے پر ہلکے سے ملال کا رنگ نمایاں تھا جسے
چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ آج کی شام
جائداد ازراک خان کے حوالے کرنے کے لیے
گئی تھی۔

”یہاں دستخط کرو دیجئے! اس زمین کی ساری
ازراک بیٹے کے حوالے کر دیں گے تاکہ یہ کام شروع
کرادے۔“
اس سے پہلے کہ وہ دستخط کرتیں شہباز خان
کمرے کا دروازہ کھولا اور اپنے پیچھے ایک ماڈرن کی
بظاہر انگریز نظر آنے والی خاتون کو لے کر اندر داخل
ہوا۔

”شہباز بیٹا! یہ کون ہے؟“ دلیلی پتلی خوب
صورت لڑکی نے چوڑی دار پا جامہ اور لپا سا فریک
پہنا ہوا تھا اور بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔
”ارے ارے آپ اٹھ کر کہاں جا رہے ہیں
بیٹھیں ابھی تو کروڑوں روپے کی جائداد آپ کو ملی
ہے ابھی سے کوشش نہ کرو جناب ازراک خان
صاحب۔“

کمرے میں موجود سب نئی لوگ حیرانی سے
ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ازراک خان کی
تغیر رنگت اور کاہنے ہاتھوں کی لڑش شہباز خان کی
نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکی وہ اٹھ کر کھڑا ہوا تھا۔

”شہباز خانہ! یہ لڑکی کون ہے اور یہاں
کیا کر رہی ہے؟ تم سب کو جواب کیوں نہیں دے
رہے؟“ شاہ گل نے تیرے گھر میں پوچھا تو وہ اس لڑکی
کے ہنسنے ہوئے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔
”یہ لڑکی میری بہن جیسی ہے۔ یہی اس کا ایک
رشتہ ازراک صاحب سے بھی ہے۔ جوہ خود بتائیں
گے۔ کیوں ازراک خان! یہ کیا گئی ہے تمہاری؟“

وہ چپا چپا کر پوچھ رہا تھا۔
”یہ تو میں جانتا ہوں کہ اس سے تمہارا رشتہ
بہت گہرا ہے اور اس رشتے کا کوئی ثبوت نہ چھوڑ کر
بھی تم ایک ثبوت چھوڑ آئے ہو اور وہی زندہ ثبوت
تمہیں اس رشتے کا اعتراف سب کے سامنے کرانے

کا کرے گا۔“ وہ سخت گھبرایا ہوا تھا لیکن بڑی
اس نے اس نے گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش
کی مانی حاصل کر لی تھی۔

”جھوٹ ہے سراسر جھوٹ۔ میں نے اس
الاح نہیں کیا نہ ہی یہ میرے بیٹے کی ماں بننے
والی ہے۔ یہ سب سازش ہے میرے خلاف جو شہباز
خان اور اس لڑکی جو یہ صدیقی نے تل کر رکھی ہے۔“
پشینہ چند لمبے شہباز خان کی مسد کال دیکھ
کر دانہ کا ہاتھ پکڑے کمرے میں آ چکی تھی وہ چاہتی
تھی کہ سب کچھ وہاں اپنی آنکھوں سے دیکھ لے تاکہ کسی

”میں نے کب کہا کہ یہ لڑکی تمہاری بیوی ہے
سارے بیٹے کی ماں بننے والی ہے؟ اور ہاں سب
کہا نہیں کر میں نے تو ابھی اپنی اس بہن کا نام
نہیں بتایا پھر تم کہے جان گئے ہو کہ یہ جویریہ
ہی ہے۔“

وہ لڑ بولایا ہوا تھا منہ بول بالکل سامنے میز پر
اسی طرف ایک دستخط کی بات تھی۔ چین ابھی بھی
اس کی ماں کے ہاتھ میں تھا۔ وہ بھی ان کے ہاتھ کی
دیکھ رہا تھا اور کبھی سامنے کھڑی جویریہ صدیقی
کی طرف مگر سے چہرے کی طرف۔

”شہباز خان! یہ قصہ کیا ہے، جلدی سے بتاؤ
میرا دل بند ہو جائے گا۔“ بڑے داجی نے قریب
پہنچنے والے بھائی اٹلس خان کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ
لیا تھا جو دوسرے ہاتھ سے ان کا ہاتھ سہلاتے
ہوئے بڑے بھائی کو خاموشی دے رہے تھے۔
”مامی! یہ لڑکی آپ کو ساری صورتحال سے
آگاہ کرے گی۔ بولیں جویریہ بہن میں موقع ہے
اپنے بولنے کا۔“

وہ بھائی ہوئی آواز میں بولنے لگی۔
”ازراک خان سے میری ملاقات دو سال پہلے
ہوئی اب اسے ایک جرم میں ملوث ہونے پر اٹھینڈ
کاٹا جانے والا تھا۔ اسے اپنے مستقبل کی قربانی کا
اعتراف اس نے میرے سامنے اپنی مجبوریوں اور

مسائل کا رونا کچھ اس طرح رویا کہ میں باوجود
والدین کی مخالفت کے اس سے شادی کرنے پر راضی
ہو گئی۔ اس نے مجھے اپنی محبت کے جال میں پھنسا کر
خود کو تو بچایا لیکن میری زندگی برباد کر دی۔ نشے اور
دیگر بری عادات کی وجہ سے یہ پڑھائی مکمل نہ کر سکا
اور وہاں کے سارے اخراجات میں کام کر کے
پورے کرتی۔ جب کچھ عرصہ پہلے پاکستان جانے کا
ارادہ کیا تو میں نے ساتھ جانے کی ضد کی لیکن مجھے
بہانوں سے ٹالتا رہا۔ میں بریکنٹ ہوں میری
خواہش تھی کہ ایسی حالت میں مجھے کام نہ کرنا پڑے
میں کچھ آرام کرنا چاہتی تھی اور بقول اس کے
پاکستان میں ان کا خاندان بہت امیر کبیر ہے تو میں
نے سوچا اس کے گھر والے بحیثیت ایک بہادر اور اپنی
آئندہ نسل کی ماں کی حیثیت سے عزت دیں گے اور
وہ آرام بھی جو مجھے چاہیے تھا لیکن یہ مجھے دھوکا دے
کر پاکستان نکل گیا اور مجھ سے کوئی رابطہ نہ رکھا۔
یہاں کا نمبر بھی میرے پاس نہیں تھا مجھے احساس ہوا
کہ یقیناً کوئی کڑ بڑ ہے جو اس نے یوں سارے
رابطے ختم کر کے دیے ہیں۔ میری چھٹی حس کی خطرے
کا سنسل دے رہی تھی۔ میں کٹ کر پاکستان
آجی جوائڈ رہیں اس نے بتایا تھا اس پر مئی تو آشاف
ہوا کہ ایڈیٹر غلط تھا۔ اب میرے پاس کوئی ذریعہ
نہیں تھا اس تک پہنچنے کا۔ ایسے میں میری ایک
پاکستانی دوست نے مدد کی۔ ازراک کے بارے میں
معلومات بھی کروائی رہی اور اپنے گھر میں بھی رکھا۔
اس کے شو پر ایک این جی او میں کام کرتے ہیں اور
شہباز بھائی اس این جی او کے ڈائریکٹر ہیں۔ میں نے
انہیں کل میری بیٹی کے میاں نے ازراک کی تصویر
بھیجی کہ آپ بھی پتھان ہیں شاید ان صاحب کے
بارے میں کوئی معلومات رکھتے ہوں۔“

سب لوگ دم سادھے بیٹھے ہوئے تھے۔ ودانہ
نے چکر اتے سر کو دونوں ہاتھوں سے قہار رکھا تھا اور
پشینہ نے اسے قہار ہوا تھا۔ اس کے لیے یہ صدمہ
بہت بڑا تھا۔

”باقی کی کہانی آپ کو میں سناتا ہوں۔ میں نے جب اعظم صاحب کی بیٹی کی تصویر دیکھی تو حیران رہ گیا کیونکہ وہ تصویر از رک کی بھی اور اس کے ساتھ جو کہانی انہوں نے سنانی، وہ ناقابل یقین تھی میرے لیے۔ میں نے فوری طور پر جویرہ سے کہیں سے فون پر بات کی اور ان سے ساری تفصیل معلوم کر کے جلد سے جلد یہاں آنے کی درخواست کی کیونکہ مجھے اچھی طرح سے اندازہ تھا کہ دیر ہوگی تو ہمارے ہاتھ کٹ جائیں گے۔ زمین اور اسپتال کے نام پر اتنی بڑی رقم انہیں مل گئی تو واپس لینا ناممکن ہو گا اسی لیے ہم نے جلدی جلدی سب کچھ سامنے لانے کا فیصلہ کر لیا۔“

”یہ سب جھوٹ ہے اور صرف شہباز خان کی نہیں اس لڑکی جویرہ کی بھی سازش ہے۔ یہ دونوں مل کر یہ رشتہ ختم کرنا چاہتے۔ ہاں میں اس لڑکی سے واقف ہوں، میرے دوست کی گرل فرینڈ بھی اور وہیں مجھے دیکھ کر یہ لڑکی میرے پیچھے لگی ہوئی ہے لیکن میں نے کبھی اسے لفت نہیں کرائی۔ اس لیے یہ انتقامی کارروائی پر عمل گئی ہے، اسی طرح آپ سب جانتے ہیں کہ شہباز خان بھی ودانہ کے ساتھ رشتے کا خواہش مند تھا تو یہ دو ناکام لوگوں کی ملی بھگت سے رچایا گیا ڈرامہ ہے۔ اس لڑکی سے پوچھیں کہ اس کے پاس ہمارے نکاح کا کوئی ثبوت ہے؟“

وہ پراعتماد انداز میں داہنی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا تو سب ہی لوگ سوالیہ انداز میں جویرہ کی طرف دیکھنے لگے۔

”اس وقت کوئی ثبوت نہیں ہے کیونکہ یہ شاطر آدمی سارے ثبوت ختم کر کے آیا ہے لیکن میں دو تین دن میں سارے کاغذات آپ کے سامنے پیش کر دوں گی۔“

”شادی کی کوئی تصویر تو ہوگی، کم سے کم موبائل میں تو ہوئی جائے؟“

یہ سوال اگلے خانے نے کیا تھا۔

”میں نے آپ کو بتایا یہ سارے ثبوت ختم

کر کے پاکستان آیا ہے، یہاں تک کہ میرے فون کی ساری پیچڑ بھی ڈیلیٹ کی ہوئی ہے۔“ وہ بے بسی سے سب کو دیکھ رہی تھی۔

”جب تک تم کوئی ثبوت پیش نہیں کر دیتی، صرف تمہاری زبان پر کیسے بھروسہ کر سکتے ہیں وہ اتنے بڑے معاملے میں؟“ یہ شاہ گل تھیں۔

”کیا آپ نہیں جانتیں کہ آپ کا بیٹا جھوٹ نہیں بولتا؟“

شہباز خان نے افسوس بھرے انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ چپ ہو گئیں۔ اچھی طرح سے جانتی تھیں کہ بیٹا جو کچھ کہتا ہے۔ وہ سو فیصد سچ ہے لیکن بغیر ثبوت کے اس کی بات کا بھروسہ صرف ماں ہی کر سکتی تھی اور کوئی نہ کرتا۔

معاملہ مشکوک ہوتا جا رہا تھا اور سب ہی کے چہروں پر شش و پنج کی عجیب سی کیفیت نظر آرہی تھی۔

”ہمارے بیٹے کی اچھائی کی گواہی دینے والے بہت سے لوگ ہیں، انہیں غریبے کہہ کر ہم اپنے بیٹے کے والدین ہیں، جس کے دل میں انسانیت کا درد ہے۔ یہ دونوں سراسر جھوٹ بول رہے ہیں۔ میں نے اور نہ ہی آپ دونوں بھائیوں نے یہ بات دھوپ میں سفید کیے ہیں آپ بھی اچھی طرح سے جانتے ہیں اور مجھے بھی یہ معلوم ہے کہ انتقامی کارروائی میں لوگ ہر حد سے گزر جاتے ہیں۔“ از رک کے باپ کی بات پر بڑے داہنی نے اثبات میں سر ہلایا۔

پشیمہ بی بی ساری چویشن کو دیکھ کر کوئی ایسا ناول یا افسانہ یاد کر رہی تھیں جس میں ایسا کوئی تیلن ہو ہو لیکن شدید پریشانی میں اسے کچھ یاد ہی نہیں آ رہا تھا لیکن۔۔۔۔۔

اپنے بڑوں کے چہروں پر پھیلی نری نے اسے ایک فیصلے پر پختہ پایا اور وہ جب کوئی فیصلہ کر لیتی تھی تو اسے اس سے ہٹانا کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہوتی تھی۔

”تو از رک خان صاحب! پہلے تو آپ سے کہہ رہی ہوں یہ بتائیں۔ مجھے تو آپ کے ساتھ کوئی بات نہ تھی میں آپ کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی کرنا چاہوں گی۔ تو آپ سب لوگ جو کہہ رہے ہیں داجی۔ بڑے داہنی آپ میری بات کرنا تو کریں گے نا؟“

وہ سب کے سامنے یوں کھڑی تھی جیسے آج اہمات منوار کر رہی رہے گی۔

”پشیمہ! یہ کیا بکواس ہے تم بیچ میں کیوں بول رہی ہو؟“ مورچانہ نے اسے تنبیہ انداز میں گھورا تو اس نے انداز کرتی ہوئی سیدی از رک خان کے سامنے ہاتھ کھڑی ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں موبائل فون تھا۔

”لوگ اسے گھور رہے تھے۔“

”یہ کیا ڈراما ہے عسکر خان! آپ نے ہمیں یہاں سے عزت کرنے کے لیے بلایا ہے؟“ از رک کا اسے گھورنے لگا۔

”بیٹہ جاو پشیمہ! منہ بند رکھو“

مورچانہ کی آنکھوں میں لکھی تحریر وہ پڑھ کر بھی اچھا بن گئی۔

”آخر تک ہاتھ باندھ کر منہ بند کر کے رہو۔ میں وہ کر رہی ہوں بڑے بڑے دشمنوں کو لڑتی رہے گی عورت؟ نہیں میں باری ہوئی عورت کو جیتنے کی اداکاری کرتے نہیں دیکھ سکتی۔ میں نے جتنا بڑے روایتیوں سے، رمبوں سے اور ظلم سے اس کی آنکھوں میں ایک عزم تھا ایسا عزم اس نے داہنی سمیت سب کو چپ کر دیا۔

اس نے موبائل فون کی داس ریکارڈرنگ مانی شروع کی۔

کمرے میں پھیلی گہری خاموشی میں ان لوگوں کی آواز با آسانی سنی جا سکتی تھی۔

”از رک صاحب! میں کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں آپ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ میں ایک عزت دار باپ کی بیٹی ہوں۔ اس طرح اگر آپ کے ساتھ ایسا مجھے کمرے میں کسی نے دیکھ لیا تو

میرے خاندان کی بہت بدنامی ہوگی اس لیے برائے مہربانی آپ یہاں سے چلے جائیں۔ ورنہ میں کمرے سے باہر نکل جاتی ہوں، مجھے لگتا ہے کہ گھونہ بھی اس سارے معاملے میں ملوث ہے ورنہ وہ مجھے یوں کمرے میں اکیلا چھوڑ کر خود غائب نہ ہو جاتی۔“

”نہیں گھونہ کو اس معاملے کی کوئی خبر نہیں ہے اسے میں ایک کمرے میں چاہئیں اور آکس کریم دے کر اندر آگیا ہوں، وہ آدھے گھنٹے سے پہلے یہ سب ختم کیے بغیر نہیں آئے گی۔“

”مجھے آپ جیسے تعلیم یافتہ انسان سے اس سب کی توقع نہیں تھی۔ میں تو اس بات پر حیران ہوں کہ آپ نے اتنا عرصہ باہر رہ کر بھی کچھ نہیں سیکھا جو تعلیم انسان کے اندر ظلم کی روشنی نہ پھیلا سکے اس کا فائدہ کیا ہوا۔“

”باہر رہ کر میں نے بھی سیکھا ہے کہ بغیر شادی کے بھی ریلیشن میں رہا جا سکتا ہے۔ اسی لیے میں آپ کو دل کی گہرائیوں سے یہ آفر دے رہا ہوں۔ کہ شادی تو میں آپ کی کزن ودانہ سے کروں گا لیکن ہم دونوں زمانے سے چھپ کر ایک دوسرے سے ریلیشن میں رہیں گے میں جانتا ہوں آپ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

میں آپ کے سامنے آج ایک اعتراف بھی کرنا چاہتا ہوں۔ کہ مجھے اس لڑکی ودانہ میں کوئی دلچسپی نہیں۔ ایسی میک اپ کی دکائیں تو میرے ارد گرد ہر وقت موجود رہتی ہیں جانے کیوں مجھے وہ لڑکی پسند لگتی ہے۔ اگر مجھ سے میری پسند پوچھی جاتی تو میں تمہارا نام لیتا لیکن۔۔۔۔۔“

کمرے میں اتنی خاموشی تھی کہ اگر سوئی گرتی تو بھی آواز سنائی دیتی۔ سب ساکت بیٹھے یہ گفتگو سن رہے تھے۔

گھونہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ اس کے دل میں عقیدت کا ایک بت ٹوٹ کر گر رہا تھا لیکن دھڑام سے کمرے کی آواز کوئی نہ سن سکا۔ کمرے میں پشیمہ کی پراعتماد آواز کوئی نہ سنی رہی تھی

”ودانہ پر لحاظ سے آئینہ بیل لڑکی ہے۔ مخلص، بچی اور حسین ترین۔ آپ کو اپنی قسمت پر رشک کرنا چاہیے بلکہ شکر ادا کرنا چاہیے۔“ اس میں وہ سب نہیں ہے جو تم میں ہے۔۔۔۔۔

لیکن میں اسے اپنانے کے لیے مجبور ہوں اور اپنی مجبوری نہیں بتاتا ہوں، اس شرط پر کہ کسی کو اس راز میں شریک نہ کرنا اگر کسی سے کہو گی جی تو سب یہی سمجھیں گے کہ تم جھوٹ بول رہی ہو صرف اس لیے کہ چچا زاد بہن سے جلیس ہو رہی ہو۔ اس کا اتنے قابل ڈاکٹر سے رشتہ جو ملے ہو گیا ہے۔ سو صرف اس لیے نہیں اس راز میں شریک کر رہا ہوں کہ تم میری مجبوری سمجھ سکو۔ میرے والد نے وہ قیمتی زمین حاصل کرتی ہے جو تمہارے بڑے دادا کی اور ان کی بیٹی کی ملکیت ہے۔ اس کو روڈوں کی زمین کی وارث ودانہ خان ہے اور ہمیں امید ہے کہ اسپتال کے نام پر وہ زمین جلد ہی مجھے ملے والی ہے۔ بس اس کے سوا کچھ نہیں تمہاری کزن میں۔“

”تو ہاپٹل والے سارے عزائم محض باتیں ہیں؟“

”پیشینہ طلسم خان! تم بھی بہت بھولی ہو اور تمہارا سارا خاندان بھی بڑا معصوم ہے۔ میں بھلا اس چھوٹے سے گاؤں میں کام کر کے اپنا مستقبل برباد کروں گا؟ میرا دامخ اتنا بھی خراب نہیں۔ ماں شادی اور جائیداد ملنے کے بعد ودانہ کو والدین کی خدمت کے لیے یہیں چھوڑ کر میں باہر واپس چلا جاؤں گا۔ ہاں تم اگر میرے ساتھ چلنا چاہو تو میں بخوشی سارے معاملات دیکھ لوں گا۔ اسٹوڈنٹس ویزا یا آسانی لگتا ہے، بس پیسے لگتے ہیں پھر ہم دونوں وہاں پہنچ جائیں گے جہاں کسی کے ہاتھ ہم تک نہیں پہنچ سکتے۔“

ساری باتیں ریکارڈ تھیں۔ اب کوئی انکار نہیں کر سکتا تھا۔ کمرے میں عجیب قسم کا سناٹا پھیلا ہوا تھا سب ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے۔ دادا کے چہرے کے تاثرات اس نے ڈرتے ڈرتے

دیکھے، ان کی آنکھیں شعلہ اگل رہی تھیں۔ دادا کی کاسر جھکا ہوا تھا جبکہ ازدرک کے والدین چہرے بھی قہر تھے۔ موبائل بند کرتے ہوئے نے ودانہ کی طرف دیکھنے کی ہمت اپنے اندر نہ دیا وہیں کھڑے کھڑے کہا۔

”مجھے اس شخص کے تیور دیکھ کر اندازہ ہو گیا کہ یہ کوئی بہت بڑا منصوبہ بنا رہا ہے۔ اور اسے بالی چالاکی سے ان معصوم لوگوں کے سامنے اس لیے سمیٹ لانا ہے جو اس پر اندھا اعتبار بلکہ غرور کر رہے ہیں۔“

آخری بات سن کر ودانہ ضرور تڑپا ہوئی لیکن وہ ودانہ سے نظریں نہیں ملا سکتی تھی۔ جس لڑکی کے غم کے پرچے سب کے سامنے اڑ چکے تھے وہ اپنے پاؤں پر جانے کیسے کھڑی ہے؟ ”پیشینہ کو اس کے ہوش میں رہنے پر جبر کرنا تھی۔“

ازدرک اٹھ کر اپنی بہن گوند کی طرف بڑھا۔ ”تم گواہ ہو گوند نہ اس لڑکی نے میرے لیے خط لکھا تھا جس میں میرے لیے اپنی بیٹی کا ذکر کیا تھا اور یہ بھی کہ وہ ودانہ سے طبعاً محسوس کر رہی ہے۔ میں اس خط کے بعد اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔“

گوند! بتاؤ سب کو کہ یہ عمل کارآمد تھا۔ مجھے شریک کیا گیا ہے۔ وہ اندر ہی اندر دیر رہی تھی۔ ایک بے وقوفی تو وہ بھی سمجھتی تھی کہ اس کا کوئی ثبوت تھا تو وہ گوند کی گواہی تھی۔ اس کے ہاتھ پر چمکتے پیسے کے قطرے اس کی اندرونی کیفیات کا پتہ دے رہے تھے گوند نے اس کی طرف ایک نظر دیکھا اور پھر بولنے لگی۔

”نہیں لالہ! پیشینہ میری بچپن کی سہیلی ہے۔ اسے میں اچھی طرح سے جانتی ہوں یہ ایسا کوئی کام کر ہی نہیں سکتی۔ آپ کو غلطی ہوئی ہے۔ اپنی باپ زاد بہن اور سہیلی کے منگیز پر اگر یہ خط مصدق تو جب لڑکا اس کے سامنے اٹھار کر رہا ہے اپنے جذبات کا جب تو اسے خوش ہونا چاہیے تھا نہ کہ آپ کے ملامت کرنی۔ لالہ! بہنوں کی سہیلیاں بھی بالکل بہنوں جیسی ہوتی ہیں۔ آپ نے پیشینہ سے یہ سب کچھ کر لیا ہے

اور جھکا دی ہیں۔ مجھے شرم آ رہی ہے کہ آپ سے لالہ ہیں۔“

وہ رورہ رہی تھی۔ اس کے لیے ایک ہیرو کو زیرو دیکھنا بہت مشکل عمل تھا۔ ڈاکٹر ازدرک خان شہر سنا تا قابل یقین نظروں سے بہن کی طرف دیکھنے لگا۔

اس کے والدین بھی نظریں جھکائے بیٹھے تھے۔ سب کچھ اتنا جلدی اور واضح ہوا کہ کوئی اسے لالہ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔

ودانہ نے آنکھوں کے سامنے جھائے اندھیرے کی چادر کو چہرے کی کوشش میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ سب کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا۔ ”کاش یہ سب جھوٹ ہو۔ کاش اے کاش۔“

گوند کی باتوں نے پیشینہ کو بھی رلا دیا۔ اس لڑکی نے خود ہی کاش لے کر دیا تھا۔

”گوند! تم اس لڑکی کی طرف دار بن رہی ہو جس کا کردار۔۔۔۔۔“ ازدرک خان کچھ برا کہنا چاہ رہا تھا کہ شہباز خان کی برائیت ختم ہوگئی۔ وہ اس پر ہنست پڑا۔

”تم میری بہن کے کردار پر انگلی اٹھاؤ گے؟“ اس نے ازدرک کو کر بیان سے پکڑ کر اس کا منہ پھڑپھڑوں سے لال کر دیا۔ ازدرک کے والد بچہ بچاؤ کر رہے تھے کہ اچانک طلسم خان نے قریب پڑی کالنگوف اٹھائی اور اس سے پہلے کہ کوئی بچتا۔ وہ کالنگوف نیچے کرے ہوئے ازدرک کی پیٹنی پر رکھ دی۔ ان کی انگلی دینے ہی والی تھی کہ دو عورتیں تڑپ اٹیں۔ ایک ازدرک کی ماں تھی اور دوسری اس کی بیوی جو یہی یہ صدیقی۔ یہ منظر دیکھ کر سب دم بخود سے اٹھ دیکھنے لگے۔ شاہ محل نے دل پر ہاتھ رکھ کر گامکین بند کر لی تھیں۔ گوند شدت خوف سے پیٹنی اولی آنکھوں سے نیچے گرے بیٹائی کی طرف دیکھ رہی تھی اور پیشینہ کا سانس گلے میں انک گیا تھا۔

وہ دونوں عورتیں رحم کی ہیمک مانگ رہی تھیں کہ دھڑام سے کچھ کرنے کی آواز سنائی دی تو سب

ادھر متوجہ ہو گئے۔ ودانہ نیچے کارپٹ پر بے ہوش پڑی تھی اور روٹی ہوئی ماں اس پر جھکی ہوئی تھی۔ ☆☆☆

دادا اور بڑے دادا کی کا غصہ شہباز خان نے کیسے ٹھنڈا کیا؟ مورجانہ اور تائی جان کو کیسے شاہ محل نے سنبھالے رکھا؟

ودانہ کو پیشینہ نے کیسے ایک برا خواب سمجھ کر سب کچھ بیٹھنے پر آمادہ کیا؟

اور جو یہی یہ صدیقی کو کیسے ساس سرس نے قبول کیا اور ازدرک سے منگنی دینے کی وجہ پہلی شادی کو قرار دے کر کیسے اسے برادری سے نکالا گیا۔

اس معاشرے میں ان ہی باتوں پر عمل ہوتے تھے لیکن اس معاملے میں کل اور دشمنی کیسے ہوتے ہوتے رہ گئی اور۔۔۔۔۔ یہ سب کیسے ہوا یہ ایک طویل کہانی ہے۔

ودانہ اور سب گھر والے اس کے احسان مند تھے، جس نے اس قدر سمجھ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کی زمین، جائیداد، دولت اور عزت کے ساتھ ساتھ ان کی لاکھوں لاکھ بیٹی کی زندگی بھی برباد ہونے سے بچائی تھی۔

اس دن شہباز خان اور ودانہ کے نکاح کی تقریب تھی۔ ان کے بڑے سے لان میں خوب صورت رنگ برنگ روشنیوں سے چمکتے چہرے پر خوشیوں کے رنگ لیے دونوں اسٹیج پر بیٹھے بہت حسین لگ رہے تھے۔ ودانہ بہت خوش تھی۔ اسے اب جا کر احساس ہوا تھا کہ شرافت اور اچھائی دنیا کی نایاب ترین خوبیاں ہیں اور محبت اللہ کا خاص انعام ہے۔ ازدرک نام کے ایک ڈریگولانے اس کے احساسات کا خون لپی کر اسے مارنا چاہا تھا لیکن اپنوں کی مہیجائی نے اسے پھر سے زندہ کر دیا تھا۔ اب یہ زندگی ان ہی اپنوں کی تھی۔ جس میں اس کے والدین کے علاوہ شہباز خان اور پیشینہ بھی شامل تھے۔

”تم خوش تو ہونا؟“ وہ سنہری شیر وانی میں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر صاف لکھا

تھا میں تمہارا ہوں صرف تمہارا۔

”میں بہت خوش ہوں بلکہ خوش قسمت بھی ہوں کہ آپ جیسا جیون سا سگی ملا ہے جو سچا اور مخلص ہے۔“ وہ سٹیل لکچے میں بولی۔

”میں نے اپنی شدت سے اپنے رب سے تمہیں مانگا تھا کہ ہوئی نہیں سکتا تھا کہ تم کسی اور کی ہو جاتیں۔“

”شاید آپ کی دعاؤں نے ہی مجھے اس شخص سے بچا لیا ورنہ تو میرے والدین جن کی ہر خوشی میری خوشی سے جڑی ہوئی ہے، بیٹے جی مر جاتے۔“

اسے وہ بھیا تک مناظر یاد آئے تو جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔

”اتنے حسین لمحات میں بے توقیر لوگوں کا ذکر نہ کرو ورنہ شہباز خان۔“

وہ اسے اپنا نام دے چکا تھا اور اب لطف لے رہا تھا اپنے نام سے اس کے نام کو جو ذکر۔

”کسی کی اتنی ہمت نہیں کہ شہباز خان اور پشینہ اٹلس خان کے ہوتے ہوئے تمہیں کوئی دکھ دے سکے۔“ پشینہ نے پیچھے سے جھک کر کہا تو دونوں ہنس پڑے۔

”ذرا شرم کرو تم لوگ، ساری بڑی بوزمی خواتین باتیں بن رہی ہیں کران کے دیدوں کا بانی سر گیا ہے یا خوش برداشت نہیں ہو رہی جو بھی گھی کیے جا رہے ہیں۔ ایک بزرگ آئی تو فرما رہی ہیں کہ شاید ان دونوں نے بھگ پٹی لی ہے۔“

اس کے کہنے پر دونوں نے سنجیدہ مشکلیں بنانے کی ناکام کوشش کی مگر سکرابٹ بھی کر لیوں پر چھلکتی ہی جا رہی تھی۔ دل کی دنیا میں بھی تو جشن کا ساں تھا۔ اندر کی خوشی چہرے پر چھلکتی ضرور ہے۔ عم انسان چھپا بھی لیتا ہے نہیں چھپ کر، آنسو بہا کر لیکن خوشی تو چھپائے نہیں چھپتی۔ سکرابٹ تو کسی کو نے میں چھپا چکی نہیں سکتا انسان۔ پشینہ دونوں کو خوش دیکھ کر سکرابٹ رہی تھی کہ کسی کے اپنی طرف متوجہ ہونے کا احساس ہوا۔

اس نے مغل میں اور دھڑک رہی تھی۔ خاندان موجود تھا۔ خوش گپیوں میں گن خواتین۔ سنگھار کے اترائی پھرتی لڑکیاں۔ اور دھڑک رہی تھیں بچے اور ایک شاہ میر خان بھی تو تھا جو اس میں کسرہ تھا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”یوں کیوں مگھو رہے جا رہے ہیں پہلے کسی حسین لڑکی نہیں دیکھی؟“ وہ بہت پر اعتماد ہوتی تھی وہ گڑ بڑا کیا۔

”یہ لڑکیاں بھی نا۔ جتنی ہوشیار ہو جائیں خوش فہم ضرور ہوں گی۔“ اس نے جواب دیا۔

”تو وہ سکرابٹ۔“

”تجلی خوب صورت جوڑی ہے ماشاء اللہ۔“

”ہاں دونوں کو ایک کرنے میں آپ کا ہاں سب سے زیادہ ہے۔“

وہ فرضی کارل جھاڑتے ہوئے مسکرائی۔

”اگر مجھے آپ کی مدد کی ضرورت پڑے تو میرے کام آئیں گی؟“ وہ اس سوال پر ہنس دی۔

”دیکھ لیں گے اگر ممکن ہوا تو کچھ مدد کر دیں گے۔ آپ بھی کیا یاد رکھیں گے؟“

”ارے سنا ہے آپ نے بڑے کام کیا۔“

انجام دے ہیں۔ ایک بہادر لڑکی کے طور پر پچان ل گئی ہے آپ کو۔ ورنہ تو سب ہی آپ کے بارے میں یہ کہتے تھے ڈائجسٹ پڑھنے والی لڑکی۔ خوابوں خالوں میں کھڑی رہتی ہے دیوار پر شیلی کی ان ڈائجسٹ میں اور ہوتا ہی کیا ہے عشق و محبت اور خوابوں کی سوداگری کے علاوہ۔ یہ تو خوفزدہ رہی کی اس کی عینک ہے جسے پہن کر ہم سب اچھا اچھا دیکھتے ہیں، حقیقی دنیا سے بالکل الگ ہوتی ہے ان میں الفاظ کے کچے کچے رنگوں سے پیٹ کی گئی دنیا۔“

وہ اس کے قریب کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

”مسٹر شاہ میر خان! آپ کو بڑی معلوم ہے میرے بارے میں؟ میں نے ڈائجسٹ کو کہنے والوں سے لڑنا چھوڑ دیا ہے۔ سب کی مرضی ہے۔ میں نے جو سیکھا، ان ہی کہاں۔“

”الوں سے سیکھا ہے، ان میں لکھا ہوتا ہے کہ اس تر تو لڑکی نہیں ہوئیں جو مردانہ لکھا کر ہضم کر لیں بلکہ لڑکیاں اپنی حفاظت پھر بن کر کریں جو ہوں تو پہاڑ بن جاتے ہیں اور الگ ہوں تب ہی کسی کاسرو تو پہاڑ بن سکتے ہیں۔“

”اوہ! پھر تو مجھے آپ سے دور بیٹھنا چاہیے۔“

وہ ارادہ ہوتے ہوئے بولا تو پشینہ نے جراتی سے اسے لپیٹ لیا۔

”مطلب یہ کہ آپ اعتراف کر رہے ہیں کہ اب بھی ان ہی مردوں میں سے ایک ہیں جو خواتین کو تو لالچہ لکھا جانے کے لیے تیار ہوتے ہیں؟“

”یہ تو وقت بتائے گا کہ میں کیا ہوں۔“

”مجھے اب اس بات میں دوچہی ہی نہیں کہ کون کیا ہے؟ مجھے اس بات میں۔ دوچہی ہے کہ میں کیا ہوں؟“

”مطلب یہ بھلا کہ تم اب خواب نہیں دیکھتیں؟“

وہ آپ سے تم پر اٹھ گیا تھا۔

”یہ میوزک کی آواز بہت تیز ہے۔“ وہ اس کا

وال ان سنا کر گئی۔

”میں نے پوچھا تم خواب نہیں دیکھتی ہو؟“

وہ بھی سنبھلی خواتین کو دیکھ کر چند لمحے سوچتے گی۔

”دیکھتی ہوں خواب بھی لیکن حقیقت پسند بھی کیونکہ کچھ حقیقتیں خوابوں سے بھی زیادہ حسین ہیں ان کے ٹوٹنے کا ڈر بھی نہیں ہوتا۔“

”ہاں بات تمہاری ٹھیک ہے لیکن میں خواب دیکھتا ہوں اور بہت دیکھتا ہوں۔“

”تو آپ مجھے کیوں بتا رہے ہیں؟“ شاہ میر نے اسے آگے سے عجیب سی شعائیں پھوٹ رہی تھیں۔ وہ خود سے ڈری گئی۔ پہلے ہی ایک ڈراؤنے خواب نے اسے پھنسا دیا ہے کہ دلہل میں دھکیل دیا گیا۔ تو مور جاندہ کی ذات بھی جنہوں نے اسے اس سے دلہل نکال کر شکر کی نصیحت کی تھی۔ شکر

اس لمحے کا جب اس نے اس شخص کے منصوبوں کو موبائل کے ایک ٹچ سے ریکارڈ کر لیا تھا اور شکر اس لمحے کا جب وہ وہاں سے نکلے ہوئے اپنے ہاتھ کا لکھا کاغذ ساتھ لے آئی تھی ورنہ گھر کے مردوں کے سامنے اس کی نظریں ہمیشہ جھکی رہتیں۔ بلکہ ہو سکتا ہے۔ اس کا غیرت مند باپ اسے گولی مار کر غیرت کے نام پر قتل ہی کر دیتا۔

اس نے وہ لمحہ دیکھا تھا۔ جب شدید غصے میں شہباز خان ازرک کو مار رہا تھا اور وہ ٹوچ بھی جب دانی نے کلا شکوف کی نالی ازرک کی کپٹی پر رکھ کر کہا تھا۔

”تمہاری ہمت کیسے ہوئی میری بیٹی سے یہ سب کہنے کی۔“ تب ازرک کی ماں اور بیوی نے ان کے قدموں میں اپنی اور دھڑکی رکھ کر اللہ اور رسول کے واسطے دیتے ہوئے التجائی بھی کر جیسا بھی ہے وہ ان کا اگلوتا تمہارا ہے اسے اللہ کے لیے معاف کر دیں وہ گاؤں چھوڑ کر باہر چلا جائے گا اور بھی ان کے سامنے نہیں آئے گا۔

اور جب جویریہ نے یہ کہا کہ میرے ہونے والے بچے کو شیم نہ کریں پلیرز ب ان کے ہاتھ کاچے تھے اور مور جاندہ نے جب سامنے آ کر یہ کہا کہ میں اور میری بیٹی آپ سے ملنے نیل میں نہیں رہیں گے تب بڑے دانی کے کہنے پر یہ فیصلہ ہوا تھا کہ ازرک لوگ گاؤں سے نکل جائیں گے اور بھی واپس نہیں آئیں گے۔

اس نے شکر ادا کیا تھا کہ اس دن ازرک کا قتل نہیں ہوا ورنہ کئی زندگیاں برباد ہو جاتیں، جس میں اس کے سب ہی پیارے شامل تھے مار دینا تو آسان تھا لیکن پھر سنبھالنا بہت مشکل ہوتا۔ اسے گلونہ کے چلے جانے کا دکھ تھا لیکن اس سے ملنا تو دیوے بھی ممکن نہیں ہوا تھا۔ گاؤں میں رہ کر بھی۔ وہ اس کی آواز سے چونکی

”یاد ہے، کچھ سال پہلے تم نے مجھے دیوانہ کہا تھا؟“

اس نے دیواری دیواری بچپن کو کسرے میں

فوکس کرتے ہوئے تصویر بنائی اور وہ لپٹے لہرائی بھاگ گئیں۔

”دوبارہ فرزانوں سے بہت بہتر ہوتا ہے جانتے ہیں کیوں؟ اس لیے کہ اسے اپنے سودوزیاں کی فکر سے آزادی ملی ہوئی ہے۔ جو غرض کہ رستے پر چلتے ہوئے دوسروں کی راہ میں کانٹے بچھانا جائز سمجھو وہی فرزانہ ہے۔“

”کہاں سے چکی ہیں یہ فلسفیانہ باتیں؟“

”زندگی سے۔“ وہ جھٹ بول پڑی۔

”کیا ڈائجسٹ میں، مکتبوں اور کہانیوں میں زندگی ہوتی ہے؟“ وہ ادھر ادھر سے تصاویر بھی لے رہا تھا اور اس سے سوال بھی کر رہا تھا۔

”ہاں اس طرح انسان صرف اپنی ہی نہیں بہت سے لوگوں کی زندگیوں سے سبق لیتا ہے۔ میں نے بھی ہر کہانی سے کچھ نہ کچھ سیکھا ہے۔ بنائیک کے بنا پیغام کے کوئی کہانی نہیں ہوتی۔ ضروری نہیں کہ آپ اپنی زندگی میں ہر تجربہ کر کے دیکھیں دوسروں کے تجربات سے فائدہ بھی تو اٹھایا جاسکتا ہے۔“

شاہ کل اور مورجہ اس آج پر بیٹھی شاہ میر خان کو اشارے سے بلارہی تھیں۔ وہ اچھٹے ہوئے بولا۔

”پیشینہ میری زندگی کی کہانی سے بھی بہت سارے سبق ملیں گے تمہیں، کبھی کوشش کرو تو قصے کہانیوں جیسے لوگ بھی آس پاس مل جاتے ہیں جنہیں پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ یہ عام سے لوگ کتنے گہرے ہیں۔ سمندر جیسے گہرے جس میں اتر کر ہی اندر چھپی چیزوں سے سامنا ہوتا ہے انسان کا؟ میں تمہیں ایسے ہی ایک انسان کی کہانی سناؤں گا۔“

وہ حیرانی سے اسے جاتا دیکھتی رہی جو اسٹج پر سب کی بچہز بنارہا تھا۔

”انہوں نے تو مجھے سیدھے منہ میرے ساتھ بات ہی نہیں کی تھی۔ آج پہلی بار اتنی باتیں کی ہیں نہ جانے کیوں؟“ وہ ابھی ہوئی تھی۔

نگاہ تو ہو گیا تھا لیکن رخصتی دو مہینے بعد رکھی گئی

تھی۔ بہت سی تیاریاں کرنی تھیں۔ آخر کون سی بڑے داہجی کی۔ اسے خوش دیکھ کر سب خوش نکاح کی تقریب کے بعد مہمانوں کو رخصت کیا گیا شاہ کل اور باقی بزرگ سونے کے لیے چلے گئے بچھلے لائن میں شاہ میر خان بھائی بھائی کی نو نو کران کر رہا تھا۔ وہ بھی سب کے اصرار پر وہیں بیٹھا انجوائے کر رہی تھی۔

”یار اب بس کرو بہت تھک گئے ہیں تم دونوں۔“

شہباز کے کہنے پر اس نے اپنا کمرہ رکھ دیا۔ ”اگر چند لمحوں کے لیے آپ ہم دونوں کو اکیلا چھوڑ دیں تو بہت مہربانی ہوگی ہمارے ہونے والے ہال سے بھی آپ کے شکر گزار رہیں گے۔“ شہباز خان نے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ جوڑے تو وہ ہنس دیا۔

”لالہ آج ہی نکاح ہوا اور آج ہی بال بچوں کی باتیں شروع؟“ انداز میں شہباز نے پوچھا۔

وہ دانت شرمائی۔

پیشینہ وہیں گھاس پر پالتی مارے کھڑی تھی۔

نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”چلو یار سسر ودانہ شہباز! میسر پر چل کر چاندنی میں نہاتے ہو یہ تو اکیلا چھوڑنے کے موا میں نہیں ہیں۔ یہ تو کچھ لمحے ہیں ہمارے اپنے کیونکہ تھوڑی دیر میں ہی عمارے والدین تہجد کے لیے نکل آئیں گے۔“ شہباز خان نے غلغلے سے احتیاط کے ساتھ ودانہ کا ہاتھ تھاما اور وہ گلابی رنگ کا بھاری لہنگا سنبھالی اس کے ساتھ چل پڑی۔

شاہ میر خان بھی وہیں پیشینہ کے پاس گھاس بیٹھ گیا۔

وہ کپڑے بدل کر ایک ہلکا سا سبز رنگ کا شلوار قمیص اور سفید دوپٹہ پہن کر میک اپ صاف کر کے آئی تھی لیکن پھر بھی بلی کی میک اپ کی تہہ اس کی آنکھوں اور مونٹوں پر نظر آ رہی تھی۔

”تو کہانی سنو گی؟“

وہ اٹھنے لگی۔

”نہیں، کہانی دن میں کسی وقت سن لوں گی اس وقت مناسب نہیں لگ رہا۔“

اسے وہی افسانوی ماحول اپنے صحن میں بکڑ رہا تھا جو وہ بڑھتی تھی اور بھی کبھی تصویر بھی دیکھتی تھی۔ بھائی رات کی ٹھنڈی کرنوں سے جگمگا چہرہ لیے درخت و پھل ہیر و من۔ آنکھوں میں محبت کا پیغام لیے اور دو جوان ہیر و باد صبا کے سینکے جھوٹوں سے اڑتی اور دن کی ریشمی زلفوں کی شوخ تھیں۔ اس نے اپنے ہارے سے بال ہٹاتے ہوئے شاہ میر خان کی طرف دیکھا تو وہ اسے ہٹنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”آپ کو نہیں پتا کہ دن کو کہانیاں سننے اور ہانسنے سے مسافر رستہ بھول جاتے ہیں؟“

”یہ میرا کوئی بھی مسافر نہیں ہے۔“ وہ ہنسنے لگی۔

وہ بولا۔ ”ہم سب اس فانی دنیا میں مسافر ہی تو ہیں۔“

”ٹھیک ہے بتاؤ کہ کہانی۔“ وہ قدرے سٹ کر اس سے ذرا دور بیٹھی تھی۔

”کہانی شروع ہوتی ہے، اس وقت سے جب ایک لڑکا جس کی عمر سات سال تھی۔ وہ اپنے رشتے والوں کے گھر آیا۔ اس گھر میں ایک بچی پیدا ہوئی اسے بچے اچھے نہیں لگتے تھے لیکن اس دن ماں نے اس کی گود میں وہ بچی لا کر ڈال دی۔ بچے نے برا سا منہ بنایا لیکن وہ چند دن کی بچی اسے دیکھ کر مسکرائی اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور ان کا رنگ گہرا سبز شگفتہ و سفید اور مسکرائی ہوئی وہ مضموم سی لڑکی اسے اتنی اچھی لگی کہ اس نے اسے اختیار اس کا ہاتھ چوم لیا کمرے میں موجود سب لوگ مسکرائے لگے۔“

”شاہ میر خان کو گڑیا اچھی لگی ہے، اب یہ اس کی ہوگی ٹھیک ہے نا بھابھی جان؟“

سب ہنسنے لگے تو بچے نے اس گڑیا کا نام پوچھا اس وقت تک اس کا نام نہیں رکھا تھا اسے کہا گیا

اس کا نام تم بتاؤ اس نے کہا میں تو اسے گڑیا کہا کروں گا۔“

وہ غور سے سن رہی تھی گا بے لگا ہے اس کی نظر بھٹک کر سامنے ٹیکری میں چلی جاتی جہاں ہاتھ تھامے دو دیوانے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے رات بتا رہے تھے۔

”پھر کہانی میں ایک نام موڑ آتا ہے وہ بچی یوں تو اس کے گھر آئی یا وہ ان کے گھر جاتا تو وہ اسے گود میں لیے بچتا تھا لیکن اب وہ بڑی ہو گئی تھی۔ وہ پہلے کی طرح اسے گود میں اٹھا کر پیار نہیں کر سکتا تھا۔ اس دن وہ ان کے گھر آئے ہوئے تھے۔ وہ

بہت خوش تھا اس کے امتحان ہونے والے تھے اور ماں کے اصرار کے باوجود وہ پڑھائی پر توجہ نہیں دیتا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد بڑے بھائی نے سب کچھ سنبھالا تھا اس لیے وہ تعلیم اور چوری چھوڑ کر زمین جائیداد اور کاروبار سنبھال رہا تھا لیکن دونوں ماں بچے کی خواہش تھی کہ وہ اچھی تعلیم حاصل کرے۔

وہ اپنی کزن کے ساتھ بیٹھی بائیں کر رہی تھی لڑکے کو یاد تھا کہ اس دن وہ کالے کپڑوں میں لمبوں تھی اور اس کے سنہری ریشم کے کپھوں جیسے بال کر پر کھلے بہت پیارے لگ رہے تھے۔ اس نے سنا وہ گہر رہی تھی۔

”میں شادی کروں گی تو کسی بہت بڑھے کھسے بڑے آفیسر سے جیسے فری آپا کے شوہر ہیں۔ یہی ایس ایس کر کے بڑے آفیسر بنے ہوئے ہیں اور وہ بھی اسلام آباد میں رہتی ہیں تو بھی میری ایبٹ آباد میں۔ کتنا مزہ ہے نا بڑے آفیسر کی بیوی بننے کا، جہاں جاؤ بروٹو کول اور سرکاری گھر، گاڑیاں ملازم۔ ہائے کاش کہ ہمارے خاندان میں بھی کوئی اتنا پڑھا کو ہو کہ ایس ایس کا امتحان پاس کر کے آئے اور داہجی سے میرا ہاتھ مانگ لے۔“ اس کی بات سن کر کزن ہنسنے ہوئے اس کا مذاق اڑانے لگی۔

”ہاں جیسے ایس ایس کا امتحان تو مذاق ہے نا۔ ارے اس کے لیے بہت محنت کرنی پڑتی ہے اور

ہمارے خاندان میں کوئی اسے دم والا نہیں جو آفسیر بن کر تجھے بیاہنے آئے گا۔

”میرے خوابوں کا شہزادہ بہت بڑھا لکھا، اعلا تعلیم یافتہ اور بڑا آفسیر ہے۔ وہ طے تو ٹھیک درندہ میں شادی ہی نہیں کروں گی۔“

وہ لڑکانہ رہا تھا اور اسے وہ گزیا اتنی اچھی لگتی تھی کہ وہ اسے ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے زندگی بدلنے کا عہد کر لیا۔ وہ ساری مصروفیات سارے شوق اور دلچسپیاں چھوڑ کر صرف بڑھائی پر توجہ دینے لگا۔ سب حیران تھے کہ اسے کیا ہو گیا ہے لیکن اس نے بڑا آفسیر بن کر اپنی اس گزیا کو اپنانا تھا۔ اس کی ایک خواہش اس لڑکے کی زندگی کا مقصد بن گئی تھی

وہ جب ایک باعید بران کے گھر آیا تو وہ اسے دیکھ کر اپنی کزن سے سرگوشی میں بولی۔

”یہ اگر کالا رنگ پہننے تو کتنے پیارے لگیں نا؟ میرا بس چلے تو ان کے ہر رنگ پہننے پر پابندی لگا کر صرف کالا رنگ پہننے کی اجازت دوں۔“

وہ سرگوشی اس لڑکے کی سہاوت تک پہنچنے کی دہشتی اس نے اپنے اوپر ہر رنگ جیسے حرام ہی کر لیا۔ سارے رنگ پرستے کپڑے نوکروں اور دوستوں میں بانٹ دیے اور خود کالا رنگ پہننے لگا مگر اس لڑکی نے بھی یہ بات نوٹ ہی نہیں کی۔

ایک بار وہ سب کزنز اسے تھے۔ لڑکا ٹیٹ کی تیاری میں مصروف تھا۔ وہ گھر کے برآمدے میں بیٹھا کتاب کے ساتھ ساتھ اسے بھی چیکے چیکے پڑھ رہا تھا باقی سارے لان کی چیز زبردستی سے خوں پسپوں میں مصروف تھے۔ باہر لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے اچانک بال آکر اس لڑکی کے ماتھے پر لگا۔ ہارڈ بال کی چوٹ سے وہ وہیں تر پڑ گئی۔ اس کا ماتھے پر رکھا ہاتھ خون سے لال ہو گیا تھا سب چیخ مچا رہے تھے کسی نے اسے گاڑی میں ڈالا۔ وہ درستی لڑکا باہر نکلا اور کرکٹ کھیلنے والے لڑکوں کے بتانے پر اس لڑکے کی دھنائی شروع کر دی جس کے شاکٹ پر گیند

اندرا آیا تھا جب تک لوگ اسے بجاتے اس نے لڑکے کے ماتھے کو دھیں سے زخمی کر دیا تھا جہاں سے اس کی گزیا کا خون نکلا تھا۔

پشیمند کا ہاتھ بے اختیار اپنے ماتھے کے زخم پر تھا جہاں دو ٹانگوں کا نشان اس کے بالوں نے چھپا رکھا تھا۔

”کون ہے وہ لڑکی اور کون ہے وہ لڑکا؟“

اس کا سارا وجود سوال بن گیا تھا۔

”کیا اب بھی یہ بتانے کی ضرورت ہے؟“

اس کی آنکھوں نے حیرانی سے سوال کے بدلے سوال کیا۔

”ہاں اب بھی واضح الفاظ میں یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ کون ہیں وہ دونوں۔ جانتے ہیں کیوں؟ ہمارے ہاں کہانیاں، افسانے اور ناٹک پڑھنے والی لڑکیوں پر ویسے ہی الزام لگایا جاتا ہے کہ یہ خوش فہم ہوتی ہیں جو نظر ان پر پڑتی ہے وہ اس سے کئی مہتی اپنی مرضی کے نکل کر ہر شے کی دلچسپی خواہوں کے کل تعمیر کر لیتی ہیں اور جب محبت کی آندھی چلتی ہے تو وہی کل ریت کے گھر وندے بن کر نکھر جاتے ہیں تب آنکھوں میں ریت چھتی ہے۔“

”مطلب یہ بات یہ ہے کہ وہ اسے دیکھنے لگا سمجھتے ہیں؟“

وہ چند لمحے پر سوچ اٹھا ان میں خلا میں دیکھتی رہی پھر بولی۔

”یہ جو بچی عمر کی لڑکیاں ہوتی ہیں نا انہیں نہ ماحول نہ کتابیں اور نہ ہی کوئی اور چیز خوابوں میں رہنے اور حقیقت کو اپنی مرضی کے رنگ میں رنگا ہوا دیکھنا سکھاتے ہیں۔ یہ تو ان کی فطری مجبوری ہوتی ہے وہ محبت کی جانب یوں جاتی ہیں جیسے لوہا مٹا لیس کی طرف۔ چاہے جانے کی خواہش ہر لڑکی میں جوانی کی دلہیز پر قدم رکھنے ہی پیدا ہو جاتی ہے۔ خواہش جنگی پھول کی طرح اچانک کھلیں ہے گی ہے۔ نا اس کے لیے دل کی زمین نرم کرنی پڑتی ہے۔“

یہ سچ بولنا پڑتا ہے اور نہ ہی اسے روشنی پانی اور کھاد کی ضرورت پڑتی ہے۔ بس یہ خود رو بودا اندر ہی اندر بڑاں مضبوط کرتا رہتا ہے۔ یہ ایک وقتی یا لمبائی دور ہوتا ہے اسی پر وہیں ہر گز یہ لڑکیاں اپنے آپ کو تنہا بنا لیتی ہیں۔ بھی عزت اور غیرت کے نام پر کسی چوراہے میں پڑی ہے ردالاش کی صورت اور بھی کسی دارالامان میں بے اماں زندہ لاش کی صورت۔ بھی لکھے سے لکھتا ہے جان جسم اور بھی کئی پتنگ کی طرح لاوارث بعد میں ساری عمر ان چند سالوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے میں گزر جاتی ہے۔ وہ گناہ جو گناہ نہیں بلکہ ان کی عمر کا قضا ہوتا ہے۔ وہ چپ ہوئی تو دور نہیں سے اذان کی آواز سنائی دی۔

”مطلب تم یقین چاہتی ہو۔“

”نہیں میں شاید سمجھ نہیں چاہتی۔ میں ڈرتی ہوں کہ جو حقیقت نظر آ رہی ہے وہ خواب نہ لگے۔“

”جانتی ہو اس لڑکے کا آج رزلت تھا ساری ایس ایس کا وہ جو تھے خیر ہو کر آیا ہے۔ اس کی تصویر اخبار میں آئی ہے اس کی زندگی کا وہ دن ہے جس کے انتظار میں کئی راتیں جاگ کر گزاری ہیں اس نے لیکن وہ اس لڑکی کو سب سے پہلے یہ خبر سنانا چاہتا ہے۔ اس کے بعد گھر والوں کو بتائے گا اس دن کے انتظار نے اسے کئی بار تھکا دیا تھا مگر وہ اس لڑکی سے بھی اپنی جنونی محبت کا اظہار کرتا چاہتا تھا جب وہ کچھ بن جاتا۔“

شاہ میر خان نے جیب سے اخبار نکال کر اسے پکڑا دیا۔ وہ جیسے ٹرائس کی کیفیت میں اس سے اخبار لے کر دیکھنے لگی۔ شاہ میر خان کا نام جو تھے نمبر پر سرخ چین کی روشنائی سے لگے دائرے میں واضح نظر آ رہا تھا۔

”اب تو کوئی نا مجھ سے شادی؟“

وہ سرخ گالوں پر پھیلے آنسوؤں کی دھند میں اسے دیکھ رہی تھی لیکن اس دھند میں بھی اس کی روشن آنکھوں سے جھلکی محبت کی روشنی واضح نظر آ رہی تھی۔

”کون کہتا ہے کہ محبت کی کہانیاں جھوٹی ہوتی

ہیں ڈائیکٹس میں۔ ان میں تو وہی لکھا جاتا ہے جو حقیقی زندگی میں ہو رہا ہے۔ ہاں حقیقت کو تسلیم کرنا اور اپنے حق کے لیے لڑنے کا ہنر سب کو سیکھنا چاہیے۔“

”کیا سوچ رہی ہو؟“ وہ بے قراری سے پوچھ رہا تھا۔

”یہ یہ کہ مجھے عام لوگوں کی زندگی میں بھی ہو سکتے ہیں۔“

”نہیں تم عام کبھی بھی نہیں تھیں تم خاص تھیں۔ اس لیے مجھے عام سے خاص بننے میں بہت وقت لگا۔ تمہارے قابل مینا مشکل تھا بہت۔“

”ایک شرط پر یہ شادی ہوگی۔“ اس نے قریب آتے دوپہاؤں کی طرف دیکھتے ہوئے جلدی سے کہا تو وہ پریشان سا اسے نکلے لگا۔

”کون سی شرط؟ خدا کے لیے کوئی مشکل شرط نہ رکھنا۔“

”نمبر ایک یہ کہ آپ نے میری ڈائیکٹس ریڈنگ پر اعتراض نہیں کرنا۔ دوسرا میرے تین چار ڈائیکٹس لا کر دینے ہیں تیسرا یہ کہ اگر کوئی کہانی یا ناول مجھے بہت پسند آئے تو میرے کہنے پر پڑھا کریں گے۔“

اس کی آنکھوں میں شرارت اور چہرے پر حیا کی لالی پھیل چکی تھی۔

”سچ کہوں تو میں نے تمہاری خوشی کے لیے کب سے ڈائیکٹس پڑھنے شروع کر رکھے ہیں۔ اور بار سال کی تو یہ قسط بڑی ظالم تھی تمہارا کیا خیال ہے اگلی قسط میں کیا ہوگا؟“ وہ پوری دلچسپی سے بتا رہا تھا۔

پشیمند کا چہرہ کھل گیا پہلی بار کسی مرد نے اس طرح ڈائیکٹس ریڈنگ میں دلچسپی کا اعتراف کیا تھا اس کے سامنے۔

وہ تو ہواؤں میں اڑنے لگی تھی۔

شاہ میر خان اسے پیار سے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

رنگِ رستخیز

ہائی وے پر ٹرالر اور کار کا شدید ایکسیڈنٹ ہوتا ہے ٹرالر کا ڈرائیور بھاگ جاتا ہے، کار بری طرح پچک جاتی ہے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا سر داور اگلی نشست پر بیٹھی عورت خون میں لت پت ہیں۔ ریسکیو عملے کا انتظار ہے کہ وہ آئے گاڑی کی باڈی کاٹ کر لائیں نکالی جائیں اسی وقت گاڑی سے ایک بچے کے رونے کی آواز آتی ہے۔ ہاسپٹل میں چار لوگ آتی سی بچے کے باہر بیٹھے ہیں نرس باہر آ کر کہتی ہے آپ کے پیڈلٹ کو ہوش آ گیا ہے۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔

سرخ پھولوں سے بھئی گاڑی پوش ایریا کے ایک بچے کے آگے رکتی ہے تو۔ دولہا کی ماں ملازمہ سے کہتی ہے کہ وہیں کو لے کر اندر آؤ۔ ملازمہ وہیں کو بیڈروم میں بٹھا کر جانے لگتی ہے تو وہیں اس سے سر درد کی گولی مانگتی ہے۔ ملازمہ کہتی ہے کہ چائے بھی لے آؤں۔

دولہا کمرے میں آتا ہے۔ تو وہ اس کی شکل دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ وہ ایک بچی کو لے کر آتا ہے کہ اس کے لیے میں نے تم سے شادی کی ہے۔

زمنین کو ہواؤں میں اڑنے اور اونچے خواب دیکھنے کا شوق ہے حرم اس کی چھوٹی بہن اسے سمجھاتی ہے کہ وہ۔

زمنین کی سبکی کل کہتی ہے کہ تمہیں عبادوسم پوچھو رہا تھا۔

زمنین اپنی دوست صوما کی سالگرہ میں جانے کی ضد کرتی ہے لیکن اس کی اماں کو اعتراض ہوتا ہے کہ جوان جہان لڑکی آدھی رات کو سالگرہ سے واپس آئے گی تو محلے والے کیا کہیں گے۔ اس کے اصرار پر اماں سے جانے کی اجازت ملے



دے دیتے ہیں لیکن اس کی اماں ناراض ہی رہتی ہیں۔
 زمین میوا کی سالگرہ کی تقریب میں (جو کہ نیم برسی) گھر سے تیار ہو کے نہیں جاتی بلکہ کل کے گھر سے تیار ہو کر جاتی ہے۔
 راستے میں کل رانا سعید سے عبادوسم کے متعلق بات کرتی ہے کہ رانا سعید عباد کا دوست ہے وہ عباد سے زمین کی دوستی کرادے۔
 کہتا ہے کہ اپنی دوست کو بر بادی کے راستے پر مت ڈالو۔ پارٹی میں زمین کی عباد سے ملاقات ہوتی ہے لیکن وہ بھی اللطف کے ساتھ
 ہوتا ہے۔ اس ملاقات میں کل بتاتی ہے کہ عبادوسم برا رانا سعید سے تمہارا پوچھ رہا تھا۔ زمین بے یقین ہوتی ہے۔
 وہ اپنے حواس میں نہیں بھی گئی بلکہ ڈاکٹر فریجہ کے دل سے اس کا چیک آپ کو فہ کیا تو اس نے کہا کہ کشا کڈ اور ڈپر سیٹ
 ہیں۔ میڈیسن دیں آرام کرنا میں شام تک بہتر ہو جائی گی۔

نیل زمین کو اس کے بعد لے کر گلی آ جاتی ہے زمین کا موڈ آف ہے۔ وہاں ان کی ملاقات عبادوسم سے ہوتی ہے۔
 دونوں کے درمیان لکھاٹی سے بات چیت ہوتی ہے۔ عبادوسم ان کے جوس کا بل ادا کر دیتا ہے۔ زمین کو برا لگتا ہے۔
 نصرت زلفی کو کہتی ہیں کہ اٹھ کر دکان پر چلا جا لیکن وہ نہیں سنتا۔ وہ زمین کی ہم راہی کا خواب دیکھتا ہے نصرت کہتی
 ہیں کہ وہ پچھلی لکھی لڑکی تھی سے شادی سے انکار کر دے گی۔ زلفی کہتا ہے کہ وہ میرے بچپن کی منگ ہے۔
 زمین کے پاس پچھلی والے دن عباد کا فون آتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ دن گزارنا چاہتا ہے۔ زمین، بکل کے گھر کا
 بہانہ کر کے اس کے بتائے ہوئے ریسٹورنٹ میں اس کا انتظار کرتی ہے۔

عبادوسم کے ساتھ ایک بھر پور دن گزار کر زمین خوش خوش گھر لوٹ آتی ہے۔ زمین کو اس کی کھوجی چکی آنکھوں کی
 گہرائی کا اندازہ نہیں ہوتا۔

زمین کی غیر موجودگی میں اماں کے پیٹ میں درد ہوتا ہے۔ حریم ابا کے گھر میں نہ ہونے کی وجہ سے زمین کو کون کرتی
 ہے، فون بند ہونے کی صورت میں وہ تنگ ہاں کر بکل کے نمبر پر کال کرتی ہے کہلے سہارک باد دیتی ہے تو وہ تھرا ان رہ جاتی
 ہے کہ کس چیز کی مبارک باد اور اپنے گھر میں صبح سے کپڑے دھونے کی مظلومیت کا رونا روتی ہے۔ حریم پر پوچھتا ہوں جانی
 ہے۔ ابا آ جاتے ہیں وہ اماں کو ڈاکٹر کے پاس لے جاتے ہیں۔

زمین کے آنے پر حریم اس سے پوچھتی ہے کہ وہ کہاں سی زمین اسے سچ بتا دیتی ہے۔
 عبادوسم رانا سے ملتا ہے تو زمین ان کی بات ہوتی ہے رانا کہتا ہے کہ وہ شریف گھرانے کی ہے اس کو بخش دے۔

بٹنے لگتا ہے۔
 مائزہ صبح پچھو کے گھر پہنچتی ہے جہاں عبادوسم اور زہمت ناشہ کر رہے ہیں۔ مائزہ اور زہمت کی معنی خیز باتوں
 سے انجان بننا عبادوسم ہاں سے اٹھ کر چلا جاتا ہے۔

حریم نے ساڈھ صوب کو پیار کر لیا ہے، وہ بھر جاتی ہے۔
 زہمت گھر واپسی پر حریم کو کہتی ہیں کہ وہ میرب کے لئے میں کوئی کوتاہی برداشت نہیں کریں گی۔
 حریم عبادوسم کے بارے میں معلومات حاصل کرنے اس کے شوروم تک آ جاتی ہے عبادوسم دھکا دھکا ہے وہ اس
 سے کہتی ہے کہ تم خراب کبیٹر کے ہو۔ میری بہن کا بچہ چھوڑ دو۔ زمین چٹاپنے پر ناراض ہوتی ہے اور عبادوسم معذرت
 کرتی ہے وہ معذرت قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔

مارگ ڈیٹیل کو بتاتا ہے کہ اس کی مسلمان لڑکے سے دوستی ہے۔ نصرت پچھو تاریخ طے کرنے کے لیے مٹھائی اور
 شادی شدہ بنی ہوئی کو لے کر آتی ہیں۔ زمین گھر میں نہیں ہوتی۔

حریم کو اس کے گھر لے کر آتا ہے اماں اور طوطی بہت خوش ہوتی ہیں لیکن ابا کے آنے سے پہلے اسے جانے کا کہتی ہیں۔
 عباد کی برتھ ڈے کے موقع پر عباد زمین کو اپنے فلیٹ پر بٹھا بلاتا ہے، وہاں جانے کے بعد زمین کو باپ کی بات یاد
 آتی ہے کہ وہ بچپن میں کبھی تیرا ایک شیطانی شیطانی ہوتا ہے۔

چھٹی قسط

زمین کا دماغ جھنجھٹا تھا۔

”دماغ ٹھیک ہے تمہارا عباد یہ کیا بکواس ہے؟“

”کیا ہوا؟“ عباد نے تھوڑا اچھے ہٹتے ہوئے مصنوعی حیرت سے پوچھا۔

”کر یہ مذاق ہے تو بہت بھوڑا ہے۔ ختم کر دے۔“ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

”مذاق؟“ لفظ کو قدرے لہجہ کھینچ کر استہجاب سے اسے دیکھنے لگا۔ ”ہم ایک ریلیشن شپ میں ہیں
 زمین مصطفیٰ اور تم مجھ سے اسکی میرے فلیٹ پہ ملنے آئی ہو۔“ لفظوں کو چبا کر کہا۔
 ”ملنے آئی ہوں۔۔۔۔۔ تم پر بھروسہ کر کے۔ زمین برا فرورہ گئی۔“

”تو میں کیا کر رہا ہوں؟ یہ سب وہی ہے جو ایسے ریلیشنز میں عامی بات ہے۔“ وہ اس قدر آرام سے بولا
 کہ زمین بھٹک سے اڑی۔

”فلیٹ۔۔۔۔۔ لکڑی پیسہ۔۔۔۔۔ سب ملے گا، پریشان کیوں ہوتی ہو۔۔۔۔۔ مجھے خوش کرو گی تو تمہاری سوچ
 سے بڑھ کر بچھاؤ کروں گا۔“ اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے زمین کا ہاتھ تھاما تو اس نے عباد کا ہاتھ جھٹک دیا۔

”ڈونٹ۔۔۔۔۔ ڈونٹ بچی۔“ وہ شہیدانہ صندے کی زد میں بھی اس کے لپس کو محسوس کر کے کرنٹ کھاکر پیچھے ہٹتی۔
 ”اگر یہ مذاق ہے تو بہت نفرت انگیز ہے عباد کیا بکواس کر رہے ہو۔“ زمین کی وحشت زدہ آنکھوں میں پانی اتر

آئی کہ قدر بھلا سوچ سنا لی تھی اس نے اپنی۔۔۔۔۔ چند لمحوں تک وہ اسے گھورتا رہا پھر جس دیا۔۔۔۔۔ بڑی محظوظ لکھی گئی۔
 ”اب میں تمہاری اس بات سے متاثر ہو کر تالی بھاؤں یا ہنسوں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ ایک مرد سے
 تمہاری میں ملنے آتی ہو، وہ تم سے کھاتیں تو نہیں سنے گا بیٹھ کر۔۔۔۔۔ خواہ خواہ کا اپنی ٹیڈ (اٹل) دکھائی ہو۔“

”میرے خیال میں میں نے تم پر اعتبار کر کے، یہاں آ کر غلطی کر دی ہے۔“ زمین کا تو ذہن ہی جیسے کام
 کرنا چھوڑ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں جھٹک گئیں۔ اس نے آج پہلی بار عباد سے شرم کھا کر اپنا دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھا

اور صوفے پر بڑا شو لڈر بٹھا اٹھایا۔
 ”ابھی طرح سوچ لو زمین! غربت کے چند حسین بل دے کر تم یہ سب حاصل کر سکتی ہو۔ شادی تو کرنی ہی

ہے۔۔۔۔۔ سب کو اس پیر بل کو بجائے کرنے کا الگ ہی مزہ ہے۔“
 گھوڑی فلیٹ کی طرف ہاتھ پھیلا کر اشارہ کرتے ہوئے شیطان نے ایک اور کاری دار کیا تھا۔ زمین کے

کمزور نفس پر۔۔۔۔۔ زمین سارکتی اسے دیکھنے لگی۔ اس کی خاموشی کا مطلب سمجھ کر عباد کا قہقہہ مسکراتے ہوئے
 اس کے بہت قریب آ گیا تھا۔

☆☆☆

”حریم! اماں اس کے کمرے میں آئی تھیں۔ وہ ابھی کو نیورس کے لیے کپڑے استری کر کے فارغ ہوئی تھی۔
 ”جی۔“ وہ جوگی۔ اماں بہت کم ان کے کمرے میں آیا کرتی تھیں۔ کوئی کام ہوتا تو جہاں ہو سکتا، وہیں سے
 آواز لگا لیا کرتیں۔ وہ اس کے پاس بیٹھ کے کنارے بیٹھ گئیں۔

”تم سے ایک بات کرنا چاہی۔“
 ”جی امی! کہیے۔۔۔۔۔ مجھے آواز دے لیتیں، میں آ جاتی آپ کے پاس۔“ حریم تھوڑا سنبھلا۔ پچھو کی آمد پر

زمین کے تاثرات کسی سے چھپے ہوئے نہیں تھے۔ اماں یقیناً کسی کا غلطابہ کر گئی تھی۔
 ”زمین کے دماغ میں کیا چل رہا ہے؟“

”کیا مطلب؟“ حریم کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اماں اس سے پوچھ گچھ کرنے سے آسکتی ہیں
 اور نہ اپنا ”ہوم ورک“ مکمل رکھتی۔

ساتھ اپنے کام میں مصروف ہو گئی تو حرم نے جلدی سے آلو پیاز چھیل کاٹ کر بین میں ڈالے اور پکڑوں کا آمیزہ بنانے لگی۔ سرین نے اپنی کی پٹنی کی بوتل نکال کر کھری اور پودے کی فیر کی پٹنی کی ٹنگیاں نکال کر انہیں دہن میں ڈال دیا اس کے پکڑے تیز تک پٹنی بھی تیار ہو جانے والی تھی۔ حرم کا دل بے حد ہلکا ہکا اور مسرور سا تھا۔ ذرا دیر میں بچن تو کیا پورا گھر پکڑے ملتے جانے کی خوشبو سے بھر گیا۔ اس نے پکڑوں کے ٹٹا جانے والے بین میں پیاز کول کول کاٹ کر ان کے رنگز الگ کیے اور بین میں ڈبو کر تن لیا۔ پیٹ پر نشوونہ میں پکڑے نکال کر اس نے چوہا بند کر دیا تھا۔ ایک پیٹ میں دونوں ملاز ماؤں کے لیے پکڑے نکال کر انہیں دیے تو وہ ممنون ہونے لگیں۔

”واہ..... کیا بات ہے..... کیا ذرا سے ہو رہے ہیں یہاں؟“

”زہمت کی نظر ہی آواز اچانک ہی ابھری تھی۔ پکڑوں والی پیٹ حرم کے ہاتھ میں لرزی۔ انہوں نے ایک ہی نظر میں کام والیوں کے سامنے اور حرم کے ہاتھوں میں پکڑوں کی پیٹ دیکھ کر تمام صورت حال بھانپ لی تھی۔

”وہ..... چھوٹی بی بی کا دل جا رہا تھا خود پکڑے بنانے کو۔“ ثریا شرمندہ ہو کر صفائی پیش کرنے لگی۔ اور حرم تو جیسے مارے شرمندگی کے لڑی گئی۔ زہمت مزید کچھ کہے بنا اسے تیز نظروں سے دیکھتی چلی گئی تو وہ پٹنی کی پیالی اور بوتل اٹھا کر پیٹ میں رکھتے ہوئے بچن سے نکل آئی۔ زہمت راستے میں لاؤنج میں ہی بیٹھی تھیں۔ ”اھر آؤ۔“ اسے دیکھتے ہی آواز دے لی تو وہ من من بھر ہوتے قدموں کے ساتھ ان کی طرف آ گئی۔ پکڑوں والی پیٹ اس کے ہاتھوں میں وزنی ہو گئی۔

”تم اس گھر کی بہو ہو۔ ان چاہی ہی آئی..... اپنی نہیں تو ہماری ہی عزت کا خیال کر لو۔ پکڑوں کے ساتھ پیٹہ کر کھانا پیانہ تم لوگوں میں ہوتا ہوگا۔ ہمارے ہاں یہ رواج نہیں ہے۔“ وہ اس قدر مختار سے کہہ رہی تھیں کہ حرم کی رنگت زرد پڑنے لگی۔

”وہ ہاں بیٹھی تھیں..... تو میں نے ان کو بھی..... انہوں نے نہیں کہا مجھ سے۔“

”بہی سمجھا رہی ہوں تمہیں کہ اپنا مقام بچپانہ نو۔ کام والیوں کو کیا پتا “کس کھاتے“ میں لائی گئی ہو یہاں۔“ وہ چپا کر بولیں۔

”مما..... خفا خفا اس قدر تیز آواز آئی تو وہ دونوں ہی چونکیں۔

”تم..... کب آئے، پتا ہی نہیں چلا۔“ بیٹے کو سامنے دیکھ کر زہمت کا انداز بدلا جبکہ حرم تیزی سے پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔ وہ سنجیدہ ساماں کو دیکھ رہا تھا۔

”کیا ہو رہا تھا؟“

”تمہاری بیٹی کو سمجھا رہی تھی۔ پکڑے بنانے پہنچ گئیں مگر مزہ بچن میں اور تا صرف خود بنائے بلکہ کام والیوں کو بھی کھلا رہی تھیں۔“ وہ طے کئے انداز میں بولیں تو وہ اسی سنجیدگی سے بولا۔

”تو کیا ہوا! کوئی انسان ہی ہیں۔ کیا فرق پڑتا ہے اگر انہیں کھانے میں سے کچھ دے دیا جائے؟“

”کوئی فرق نہیں پڑتا بیٹھنا۔ ثریا اور سرین کو میں خود کھانا نکال کے دیتی ہوں چاہے یہاں کھائیں چاہے گھر لے جائیں..... لیکن تمہاری بیوی نے تو حد ہی کر دی۔ خود سے پکا کر کھلا رہی ہیں کام والیوں کو..... کام والیوں کو بکڑے دے دیں گئی تھیں! وہ ہماری نوکر ہیں۔ ہم ان کے نوکر نہیں ہیں۔ اپنی بیوی سے کہو خاک سے اٹھ آئے اب۔“

وہ آخر میں بے حد غصے سے بولیں اور اس کے کوئی جواب دینے سے پہلے ہی اٹھ کر بڑبڑاتی ہوئی کمرے

میں چلی گئیں۔ وہ گہری سانس جھرتا اپنے بیڈروم کی طرف بڑھا۔ پسکون ہی گرائش سے بھرے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے طائرانہ نظر ڈالی۔ پکڑوں والی پیٹ کاؤچ کے سامنے چھوٹی ٹیبل پر رکھ کر وہ بند کھڑکی کے شیشے کے سامنے کھڑی لائن میں دیکھ رہی تھی۔ اس نے لیپ ٹاپ بیک سائیڈ ٹیبل پر رکھا ایک نظر پسکون سے سوئی ہوئی میرب پڑالی اور حرم کے پاس آیا۔

”آٹم سوری۔“ اس کی معذرت غیر متوقع تھی۔ حرم کے اندر جو سب لاوے کی مانند ایل کر باہر نکلنے کو بے تاب تھا۔ وہ یکے نہت خشنابڑ گیا۔

”تم نے جو بھی کیا، بالکل ٹھیک کیا ہے۔ لیکن ماما کا اپنا الگ مزاج ہے۔ ایک سیٹ اپ ہے مگر چلانے کا لیکن اہستہ آہستہ وہ تمہاری عادی ہو جائی گی۔“

وہ نرمی سے کہہ رہا تھا۔ حرم کا وہ لاوا تو خشنابڑ گیا مگر اسے اب اس بات پر غصہ آنے لگا کہ اس نے آتے ہی معذرت کر کے حرم کو دل کا غبار کالے کا موعج ہی نہیں دیا تھا۔

”مجھے کوئی ضرورت نہیں کسی کو اپنا عادی کرنے کی۔ میں کون سا یہاں ساری عمر رہنے والی ہوں۔“ وہ چیخ کر بولی۔

”تم یہاں ساری عمر کے لیے ہی آئی ہو حرم! کسی غلط فہمی میں مت رہنا۔“ اس کا لہجہ ایک دم ہی خشک ہوا تھا۔

”بچی اس کی پرورش اس کی دیکھ بھال سب تمہاری ذمہ داری ہے۔“

”میرے گھر والوں کی میرے متعلق غلط فہمیاں دور کرو۔ میں ایک دن بھی یہاں نہ رہوں۔“ سینے پر بازو پٹیتے ہوئے وہ کہنے لگی۔ پندرہوں تک وہ اسے جاچتی نظروں سے دیکھتے ہوئے جیسے اس کی سرکشی بھانپتا رہا۔ پھر اطمینان سے بولا۔

”دیری گئے۔ بہت اچھا کیا وقت پر دل کی بات بتا کر۔ اب مجھے تمہارے لیے۔“ وہ پلا اپنی جیکٹ اتار کر چنگ کر کے واڈر روپ میں لٹکانی اور کاؤچ پر بیٹھ کر جو تے اتارنے لگا۔ حرم گردن موڑے اسے دیکھ کر اس کی بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بیروں میں سلیپر پہنتا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ حرم کے ذہن میں دفعتاً خطر کے کھنسی پئی۔

”تم پکڑے کھاؤ..... موسم انجوائے کرو۔“ سنجیدگی سے کہتے ہوئے وہ فریش ہونے والی روم میں گھس گیا۔ وہ پکڑے تبدیل کر کے باہر نکلا تو وہ مضطرب سی کمرے میں ٹہل رہی تھی، اسے دیکھ کر حرم گئی۔

”تمہاری بات کا کیا مطلب تھا؟“ حرم نے بات وہیں سے شروع کی۔

”دیکھو حرم! ایک بات لکھ کے رکھ لو۔ اس قدر برسے حالات میں تم سے شادی کر کے لایا ہوں تو اب ہمیشہ کے لیے تم یہیں رہو گی اور اگر تم بھتیجی ہو کہ جب میں تمہارے پیڑس کے ساتھ تمہارا بیچ اپ (راضی نامہ) کروادوں گا تو تم مجھے خدا حافظ کہہ کر اپنے راستے چل دو گی تو یہ تمہاری سب سے بڑی بھول ہے۔“ وہ خطرناک حد تک صاف کو تھا۔ حرم کو اس روز اندازہ ہو پایا پیسے والے سب ہی صاف کوئی ہوا کرتے ہیں۔

حرم کو اس روز سنی لیرز کے آفس میں کبڑا آفس یاد آیا۔ کتنے آرام سے اس نے اپنی گراوٹ اور ہر بے شری کا اعتراف کر لیا تھا حرم کے سامنے۔ کوئی اور ہوتا تو شاید آنکھوں دیکھی کو بھی جھوٹ بول کر غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتا۔

حرم نے اسے کاؤچ پر بیٹھ کر چٹنی میں ڈبو کر پکڑا کھاتے دیکھا۔ اس شخص نے اس کی ساری زندگی ٹپٹ کر دی تھی۔ آندمی وطوفان بن کر آیا وہ اس کی زندگی میں اور ٹپٹ کر گیا حساب کچھ۔

”ہمم..... بہت اچھے بنے ہیں۔ کھاؤ۔ کیوں خشنابڑ کر رہی ہو؟“ وہ کہہ رہا تھا۔ حرم کا دل ہر شے سے

اچاٹ ہونے لگا۔

”میرا دل بھر گیا ہے تم لوگوں کی باتوں سے ہی۔“ وہ اس کی بات کی تہہ تک فوراً پہنچا۔

”بھر گھر کے اپنے اصول ہوتے ہیں حرم! یہ گھر کما کا ہے وہی یہاں کی ”روڑ میک“ ہیں سوان کے روڑ مانا بڑے گا۔ تم بے فکر رہو، یہاں جو کچھ پکاتا ہے۔ اس میں سے کافی کچھ ملازمین کو بھی جاتا ہے لیکن جس کام سے ممانعہ کریں۔ وہ مست کرتا۔ اس سے تم بھی پر سکون رہو گی اور وہ بھی۔“ وہ اسے سمجھا رہا تھا۔

”میں یہاں کبھی کو خوش یا پرسکون کرنے نہیں آئی ہوں، میری زندگی تباہ ہوئی ہے تو میں بھی سب کو برباد کروں گی۔“ حرم بچی بچی تو وہ دونوں کو استقامت ہمیشہ دیتے ہوئے جیسے اس کی بے وقوفی پر بے ساختہ مکر دیا۔ ”تم حق پر ہو۔۔۔ کسکتی ہو کی کو بھی برباد۔ لیکن میرا کوایک سوئی برابر بھی تکلیف پہنچی تو تمہیں مجھ سے کوئی بچا نہیں پائے گا۔“ وہ اس قدر آرام سے بولا کہ حرم کا دل دھل گیا۔

”تم مازہ سے شادی کر لیتے۔ وہ پال سکتی تھی میرب کو۔۔۔ تم نے میری زندگی کیوں برباد کی... ان فلیٹ (درحقیقت) میری ساری جتنی کی۔“

حرم تھک کر بستر کے کنارے ٹک گئی۔ جب سے اماں اور طوطی سے مل کر آئی تھی۔ اب کی یادوں میں زور پکڑنے لگی تھی۔ وہ ماں باپ کی حساس اور خیال کرنے والی بیٹی تھی۔ اس کے لیے یوں ان سے کٹ کر رہنا بلکہ ایک الزام کے ساتھ کٹ کر رہنا اخلاقی موت تھا۔

”میں بہتر سمجھتا ہوں جو میں نے کیا ہے اور میں نے کچھ بھی غلط نہیں کیا۔“ وہ ٹشو پیپر کھینچ کر ہاتھ صاف کرتا اٹھ کھڑا ہوا۔ حرم بھی بے اختیار ہنسی مچ گئی۔

”مجھ سے پوچھو۔۔۔ تم کتنے غلط اور قابل نفرت ہو۔“

”نفرت کا ہی سہی مگر کوئی رشتہ تو ہے نا ہمارے بیچ۔۔۔ اتنا ہی کافی ہے۔۔۔ پکڑوے کھاؤ تا کہ تمہاری جینا جلیٹ جاگے۔ میں شریا کے ہاتھ چائے بھجواتا ہوں۔“ وہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا تھا۔ حرم نے پیلوین پر ہاتھ جما کر بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا جیسے کوئی چیز اٹھا کر زمین پر دے مارنے کا سوچ رہی ہو۔

☆☆☆

رکشے میں بیٹھ کر بھی وہ تمام راستے چادر میں منہ چھپائے روٹی رہی اور اپنے گھر جانے کے بجائے محل کے گھر کے پاس اتری۔ وہ ایسا چہرہ لے کر گھر جانے کا رنگ نہیں لے سکتی تھی جس سے حرم جتنی کہ وہ سب کچھ انا آئی ہے۔ محل بھی اُس سے اتنی گھر پہنچی تھی۔ اس کی اہی کو سلام کر کے سر جھکائے وہ علیحدگی محل کے کمرے میں آ گئی۔

”خیریت تو ہے نا؟“ اس کی خاموشی سے گھبرا کر محل نے اسے بے اختیار چھوڑ ڈالا۔ محل کی چادر ڈھلک کر شانوں پر آ گئی۔ رونے سے سوئی آنکھیں اور لال بھوکا چہرہ دیکھ کر محل دنگ رہ گئی۔

”مینو! کیا ہوا؟“

”محل۔۔۔۔۔ وہ اس کے سامنے بکھری گئی۔ محل کا دل کسی نہ مٹھی میں کر لیا۔

”عباد سے ملنے کی تمہیں بات؟“ اس نے متحوش ہو کر پوچھا تو اثبات میں سر ہلاتے ہوئے زمین کے آنسو اور تیز سے سنبھل گئے۔

”رکومت! پوری بات کرو زمین! کیا ہوا ہے؟“ محل کے ذہن میں کئی خدشات دوڑ گئے۔ زمین کے لب کچھ کہنے کی کوشش میں لرزے مگر وہ پیچھا کر رو دی۔ محل اس کی حالت دیکھتے ہوئے اس کے لیے پانی کا گلاس لے آئی۔ وہ گھونٹ گھونٹ کر کے پانی پیتے خشک حلق کو تر کر رہی تھی اور محل متحشری اس کے پاس بیٹھی اس

کے سنبھلنے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کا دل اوہام کا شکار تھا۔

زمین نے دوتے ہوئے اسے ساری بات کہہ سنائی تو محل کو اسے چپ کروانا بھی یاد نہ رہا۔

عباد نے اسے لوٹنے کی خاطر اس کی سب سے بڑی کمزوری کو نشا نہ بنایا تھا۔ لیکن چمک دمک برسرِ مشنہ والی ہر لڑکی اس وار سے ڈھسے نہیں جایا کرتی۔ کچھ نیک ماں کے دودھ کے اثر اور باپ کے اٹھے ہوئے سر کی لالچ رکھ ہی لیا کرتی ہیں۔ زمین کا ان سب آسائش کے لیے لالچی ہونا الگ بات تھی مگر ”ایسی قیمت“ اس نے خواب میں بھی نہ سوچي تھی۔ وہ عباد سے دوستی کے بعد اس سے شادی کر کے یہ سب آسائش حاصل کر لینا جتنی بھی مگر شادی سے پہلے ایسے تعلقات؟ یہاں تو زمین و آسمان ہی الٹ پلٹ گئے تھے۔ عباد اس کے قریب آیا تو بے اختیار بار بار ارادہ ہی زمین نے اس کے چہرے پر پھینک دیا۔

”تھوکتی ہوں میں تمہاری ان لکڑریز پر عباد! عزت کے بدلے بادشاہت بھی ملے تو میں نلوں۔ تم نے مجھے مس بچ (غلط سمجھا) کیا ہے۔“

زمین کا تو دل ہی مر گیا تھا۔ وہ روٹی ہوئی عباد کے فلیٹ سے نکلے۔ اسے خوف تھا کہ وہ اسے زبردستی روکنے کی کوشش کرے گا لیکن وہ اوپن بین کے کاؤنٹر سے ٹیک لگائے خاموشی سے اسے روتے ہوئے جاتا دیکھتا رہا۔ شاید وہ اس طرح کے تعلقات میں ”بہا می رضامندی“ کا قائل تھا یا شاید اس کے پاس ”ویسی“ لڑکیوں کی کئی نہیں تھیں۔

”اوہ میرے اللہ! اس قدر گراؤ؟“ محل سب بن کر ششدر رہ گئی۔

”میں تو کچھ بھی نہیں کی۔ محل اس نے آج تک اتنی ساری بلا قاتوں میں کبھی بھی مجھ سے اشارتا بھی کوئی گھلیا بات نہیں کی تھی نا زمین کی حالت اس لئے پنے شخص کی سی تھی جس کی ساری دولت کے ساتھ اس کی ہر آس اور امید بھی لٹ چکی ہو۔

”میں رانا نے بات کروں گی۔“ محل نے غصے سے کہا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ کسی سے کچھ مت کہنا بات پھیل جائے گی۔“

زمین کے آنسو پھر سے بہہ نکلے۔ کیا ہی آسمان ٹوٹ پڑا تھا آج اس پر۔ دوپہر تک وہ کتنی خوش تھی۔ آج وہ عباد سے شادی کی بات کر لی اور بس۔ خوشیاں اس کی دسترس اور ستارے مٹھیوں میں تھے۔ مگر اب پتا چلا کہ وہ اس کی دسترس میں کبھی تھا ہی نہیں اور مٹھیوں کے ستارے۔۔۔۔۔ انکارے تھے۔ جن کی ایک چنگاری نے ہی آج اسے پور پور جلا ڈالا تھا۔

”اسے جی تو پا پلے، اس کا دوست کتنا گھلیا ہے۔“ محل کو مزید پیش آیا۔

”اسے پہلے سے پتا ہوگا۔۔۔ وہ جگری دوست ہے اس کا۔“ زمین نے دکھ سے کہا۔

(اپنی دوست کو بربادی کے راستے پر مت ڈالو۔ اسے کہو، مٹھیں سے اپنے قدم واپس موڑ لے۔ عباد سطحی تک جانے والا راستہ بہت پر خار ہے۔ اس نے ”کچھ اور“ ہی معیار بنا رکھا ہے اپنا)۔

محل کو رانا سعید کی تنبیہ یاد آئی مگر تب اس نے اس کی باتوں کو درخور اعتنا نہ جانا تھا۔ وہ سختی سے لب بھیج کر رہ گئی۔ یقیناً وہ اپنے دوست کی عادات و خصال سے واقف تھا۔ زمین ٹھیک کہہ رہی تھی۔

”اچھا۔۔۔۔۔ اب تم چپ کرو۔ پرسکون کرو اپنے آپ کو۔ ایسی شکل لے کر گھر جاؤ گی تو سب سو سوال پوچھیں گے۔“ محل نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بلی دی۔

”وہ میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتا ہے محل! میں نے سچ میں اس سے محبت کی ہے۔ اور اس نے میرے لیے اتنا کر اہوا سوچا۔“ وہ محل کی۔

”شکر و زمین کہ اللہ نے بھالیا ہے تمہیں۔ اس میں کوئی بہتری ہوگی تمہارے لیے۔“

”میرے سارے خواب..... آج ٹوٹ گئے ہیں!“ وہ کہتے ہوئے بے اختیار اوچی آواز میں رونے لگا۔
لب بھینچے ہوئے نکلنے سے اٹھانے سے لگا لیا۔
”میں نے ماننے کی..... انسان خسارے میں ہے.....“

ایسے ہی نہیں کہا گیا.... پس ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنہیں اللہ کے فیصلوں پر صبر و شکر کرنا نہیں آتا۔
زمین بھی اللہ کا شکر ادا کرنے کے بجائے انہی تک عباد کی اصلیت کھلنے کے دکھ میں تھی..... یہ سمجھے بغیر کہ اس کا
دئی کے مرکب شخص کی اصلیت آپ پر کھانا اللہ کے مہربان ہونے کی نشانی ہے۔
مگر کوئی ہے جو سوچے سمجھے؟

☆☆☆

اماں اپنا سوال پوچھ کر اس کے جواب کی منتظر تھیں اور حریم کی تو جیسے جان پر بن آئی تھی۔ اسی وقت ڈور بیل
بجی تو حریم کے وجود میں بجلی سی دوڑا بھی۔
”زمین آگئی ہے اماں! آپ کے باقی ہر سوال کا جواب وہ خود دے گی۔“ بھجوت کہہ کر وہ جوتی میں پاؤں
اڑتی کرے سے نکل گئی تھی۔ اماں ساکت بیٹھی رہ گئیں۔ یعنی بات واقعی کچھ تھی..... یا اللہ خیر..... ان کا دل
لڑا۔

زمین بہت سست سی اندر داخل ہوئی مگر اندر اماں نے جو موضوع چھیڑ رکھا تھا اس کے زیر اثر آئی حریم نے
اس کے رونے چہرے پر اتنا غور نہیں کیا تھا اس کے سلام کا جواب دیتی اسے کچھ کھنکھانے کے ایک کوٹنے تک
لے گئی۔

”اماں نے اندر بات چھیڑ رکھی ہے تمہارے اور زلفی کے رشتے کو لے کر۔ موقع اچھا ہے، دل کی بات بتا دو
زمین! میں نے تو اپنی پوری کوشش کی ہے اماں کی سوچ بدلنے کی۔ آگے کی منزل اب ہمیں خود طے کرنا پڑی۔“
حریم نے کم ترین الفاظ میں اسے ممکنہ صورت حال سے آگاہ کیا تھا وہ کوئی جواب دیے بنا خاموشی سے اندر
چلی گئی۔ حریم اس کی خاموشی پر پہلی بار تنگی۔ پھر تیز قدموں سے اس کے پیچھے چلتی کرے میں آئی۔ وہ اماں کو
سلام کر کے چادر اتار کر رکھ رہی تھی۔ جب حریم نے اس کا غیر معمولی سرخ چہرہ اور آنکھیں دیکھیں۔
”طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟ چہرہ اور آنکھیں لال ہو رہی ہیں۔“ اماں نے بھی بغور اسے دیکھا تو وہ خود کو
سنبھالتے ہوئے کھنکھاری۔

”صبح سے سر میں درد تھا... اب تھوڑا بخار بھی محسوس ہو رہا ہے۔“

”کھانا کھا لو پھر جانے کے ساتھ دو الے لیٹا۔“ حریم منتظر ہوئی۔

”کھانے کا بالکل بھی موڈ نہیں۔ چائے پیالوں کی منتظر۔“

”حالی پیٹ تو دو دنوں کا کھانے کیلئے ناں۔ رنک پانکٹ لے لینا چائے کے ساتھ۔“ اماں نے ٹوکا تو وہ
خاموش رہی۔

”اماں تمہاری رضامندی پوچھ رہی ہیں زلفی کے رشتے کے متعلق۔ میں نے کہا کہ زمین خود بہتر طریقے
سے جواب دے سکتی ہے اس سوال کا۔“ حریم نے ان دونوں کو خاموش دیکھ کر بات پھر سے آئندہ برتنے دی تھی تو
جان بوجھ کر وہیں سے سلسلہ جوڑا جہاں پر زمین کی آمد کے ساتھ ٹوٹا تھا۔ اماں نے گھور کر اسے دیکھا مگر وہ
ڈھٹائی کا عقیم الشان مظاہرہ کرتے ہوئے ان سے نظریں ملائے نہ اب منتظر نظروں سے زمین کو دیکھ رہی تھی۔ وہ
چپ چاپ سر جھکائے اپنے ہاتھ کے ماتھوں کو گھور رہی تھی۔

”تمہارے باپ نے تمہیں اس دن کے لیے نہیں بڑھایا کھلایا کہ تم اس کے فیصلوں کے آگے اعتراض بن
کر کھڑی ہو جاؤ۔ جو بڑے اپنے تجربوں کی آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں، چھپوں کو وہ ظاہری بیانی سے دکھائی نہیں
دیتا۔“

اماں کو اندر سے اچھی خاصی تاب چڑھ رہی تھی مگر وہ جانتی تھیں کہ یہ معاملہ بڑی احتیاط سے ہینڈل کرنے
والا ہے خصوصاً جب اس کا براہ راست تعلق زمین کی ذات سے تھا۔
”اماں! یعنی کہ تعلیم ہمیں ذہن کھولنے کی اجازت دیتی ہے لیکن زبان کھولنے کی نہیں؟“ حریم کی ناراضی
میں زبان پھسل گئی۔
”تم سچ میں بکواس مت کرو۔“ اماں نے اسے جھڑکا تو وہ ان کے شانوں کے گرد بازو لپیٹتی ان سے چٹ
گئی۔

”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے اماں!“ کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے زمین نے کہا تو حریم گویا حیرت
سے مرجانے کے قریب ہو گئی۔

”تک..... کیا..... کس پر اعتراض نہیں ہے تمہیں؟ پہلے بات تو سن لو اماں کی۔“
وہ بھلائی۔ ابھی تو باہر اس بے وقوف کو سارا معاملہ سمجھایا تھا اور اندر آ کر بنا سوچے سمجھے بولے چلی جا رہی
تھی۔

”زلفی اور تمہارے رشتے کی بات کر رہی ہوں میں۔ دو ماہ بعد کی تاریخ دے رہی ہوں میں نصرت کو۔“
اماں کا چہرہ جل چلا تھا زمین کی اتنی بات سے۔ جبکہ حریم بے تابی سے زمین کا منہ دیکھ رہی تھی۔ ابھی چوٹی
کہ پھٹی۔ لیکن اس طرف تو رو پارو یا بس انداز تھا جیسے پرواہ نہ ہو کہ اس کی زندگی کا کیا ہونے چاہا ہے۔
”جو آپ کی مرضی ہو کر میں۔“ زمین کی آواز رندہ گئی تو اماں نے بے اختیار خوشی اور مسرت میں گھرتے
گھرے مان کے ساتھ آگے بڑھ کر زمین کو خود سے لپٹا لیا۔

”میری شہزادی دھی! اللہ تعالیٰ بلند کرے۔ مجھے چاہتا تھا، اپنے باپ کا سر نیچا نہیں ہونے دے گی۔“ زمین
کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو بہہ کر اماں کی چادر میں جذب ہونے لگے۔ حریم ساکت و جامد تھی۔ اس کا وجدان
۲۰ اسے کسی انہونی کے ہوجانے کی خبر دے رہا تھا، جب ہی اس کا دل گہری کھائی میں ڈوبنا چاہ رہا تھا۔
اسے ہارے ہوئے تو محبت میں ”لٹ پٹ جانے والے“ ہوا کرتے ہیں۔ (تو کیا وہ بھی سب کچھ ہار کر ملنا
کر آ رہی تھی؟) حریم پر اس لمحے اندری اندر قیامت ٹوٹنے لگی۔ وہ ایک ٹک زمین کو اماں کے شانے سے لگے
آنسو بہاتے دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

ڈیٹیل کی منتگی کی تقریب میں کبھی نے بھی اپنے قریبی دوستوں میں سے زید کو بطور خاص انوائٹ کیا جسے
دیکھ کر مارک کی تیوری چڑھی ہوئی تھی۔ ساری تقریب میں وہ زید اور بیٹی کو خوش گپیوں میں مصروف دیکھ کر اندر
ہی اندر کڑھتا رہا تھا۔

”اپنی پرائیویٹ تقریب میں اس کا کیا کام تھا؟“ تقریب ختم ہونے کے بعد جب مہمان چلے گئے
اور صرف گھر والے ہی رہ گئے۔ مارک موقع پا کر بگن میں چلا آیا جب یہی سب کے لیے مزید ڈرکس لینے بگن
میں آئی تھی۔

”اس وقت میرے ساتھ بکواس مت کرنا مارک! میں بہت اچھے موڈ میں ہوں۔“ کبیتی نے اوچی آواز
میں کہتے ہوئے اسے ٹوک دیا۔

”اوہو..... تو گویا یہ اشارہ ہے کہ مجھے بھی اچھے موڈ میں آ جانا چاہیے؟“ دفعتاً لب و لہجہ بدلتے ہوئے اس مسکرایا اور کیتھی کے انتہائی ترسب چلا آیا۔

”دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“ کیتھی بڑی گراہی اٹھائیں مارک اس کی کمر میں بازو جامل کر چکا تھا۔

”ہی ہو یو.....“ کیتھی نے بیک کرا سے دھکیلا مگر وہ ڈھیت بنا اس کی طرف جھکا۔ اسی وقت کسی نے اس کی شرٹ کا کارڈ پکڑ کر پیچھے پھینک دیا۔

”جب کوئی لڑکی کے نہیں۔“ تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ ”نہیں۔“

زیڈ نے سر دلچسپی میں کہتے ہوئے اسے باہر کی طرف دھکیلا۔ تو مارک جو پہلے ہی اس کی وہاں موجودگی پر تلملارہا تھا۔ اس نے زیڈ کے منہ پر مکا دے مارا جسے وہ پھرتی سے ایک طرف ہونے لگا مارا گیا لیکن جواباً مارک اس کی ناک پر پڑنے والے گھونے سے محفوظ نہیں رہ سکا تھا۔ شور و غل میں کرب چکن کی طرف بھاگے۔

”اوگا ڈی“ ڈینیئل اور پال نے مارک کی ناک سے خون کے پچلتے قطرے دیکھے تو دونوں اس کی طرف لپکے۔ کیتھی نے گھبرا کر زیڈ کا ہاتھ تھام کر اسے باہر کی طرف دھکیلا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ پال نے غصے سے کیتھی کی طرف دیکھا۔

”یہ سب اس سوری کارستانی ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ مارک زیڈ پر لپک رہا تھا۔ ڈینیئل اور پال بے یقینی سے کیتھی اور زیڈ کو دیکھ رہے تھے۔

”یہ میرے ساتھ بدبیزی کر رہا تھا۔“ کیتھی نے جلدی سے زیڈ کی طرف داری کرتے ہوئے مارک کو کہتے تو زنگیوں سے دیکھا۔

”میرے خیال میں یہ ہمارا فیملی میٹر ہے، تمہیں اب جانا چاہیے۔“ ڈورس نے معاملہ فہمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اشارتاً زیڈ کو نکلنے کا عندیہ دیا تو وہ سر جھٹکتا وہاں سے نکل گیا۔

”زیڈ۔“ کیتھی ماں کو کھنٹی سے دیکھتی اس کے پیچھے چکی تو پال نے اونچی آواز میں اسے پکارا مگر وہ کچھ نظر انداز کیے دروازہ کھول کر بیڑیوں کی طرف بڑھی جہاں وہ تیزی سے پیچھے جاتا دکھائی دے رہا تھا۔

”زیڈ۔ پلیز۔ رکو۔“ کیتھی اونچی نیل پہنے ہوئے کیتھی، تیزی سے اترنے کی کوشش میں نیل کی ٹنگ تک پوری عمارت میں گون رہی تھی۔

”آرام سے آؤ۔ میں یہیں کھڑا ہوں کیتھ! اگر مت جانا۔“ وہ زبردستی لیکن کیتھی کے تیزی سے بیڑیاں اترتے ہوئے گرجانے کے خوف سے وہ مجبوراً رک گیا۔ اس تک پہنچ کر کیتھی بے اختیار اس لئے لپٹ گئی۔

”آئی لو یو زیڈ۔ آئی ریٹیلو یو..... حالات چاہے کیسے بھی کیوں نہ ہوں۔“ کیتھی نے چہرہ اوپر کر کے اسے دیکھا۔ اور آج پہلی بار یہ اعتراف کیا۔

”وہ خبیث ہے۔ لیکن میرا کزن ہے تو سب اسے اہمیت دیتے ہیں۔“

”میں آج اس کا منہ توڑ دیتا۔ اس کی ہت کیسے ہونی چاہیے چھوٹنے کی۔“

وہ لالچہ سمجھو کا ہو رہا تھا۔ کیتھ کو خوشی ہوئی کہ وہ اس کے لیے پوزیو اور پریٹیکو (محافظ) تھا۔ زیڈ نے اسے نرمی سے خود سے الگ کیا۔

”اب گھر جاؤ۔ وہ چاہیے کیا بکواس کر رہا ہوگا۔“ وہ ہلکا سا مسکرایا۔ تو اس کی آنکھیں بھی مسکرائیں۔

”لفٹ ٹھیک ہو چکی ہے۔“ نرم لفظ کے ذریعے جانتے ہو۔“ وہ شرارت سے بولی۔ تو وہ لفظ کا بٹن دباتے ہوئے مسکرایا۔ لفٹ میں داخل ہو کر وہ اس کی طرف پلانا۔

”لو یو کیتھ!“

اس کی مسکرائی ہوئی آواز میں لفٹ کا دروازہ بند ہوتے ہوئے کیتھی نے اس کا اعتراف محبت سنایا تو وہ سرشار سی ہو گئی۔ پھر کچھ یاد کر کے اس کی خوب صورت پیشانی پر نل پڑے۔ وہ تیزی سے بیڑیاں چڑھ کر ادھر آئی تو ایک ہنگامہ اس کا منتظر تھا۔

”پوچھو اس سے..... اپنے زخمی منگیتر کو چھوڑ کر یہ اس خبیث شخص کے پیچھے کیوں بھاگی تھی۔“ اسے دیکھتے ہی مارک نے کینہ تو انداز میں کہا۔ کیتھی کو اس کی سوچی ہوئی ناک دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔

”میرے دوست کے سامنے تم میری مرضی کے بنا مجھ سے فری ہونے کی کوشش کرو گے تو وہ تو اپنی دوست کے لیے ری ایکٹ تو کرے گا نا۔“ وہ اطمینان سے بولی لیکن پال قطعاً خوش نہیں تھا۔

”اگر وہ ہمارا سامنا نہ ہوتا تو یہاں سے ہاتھ پاؤں تڑوا کر ہی جاتا۔“ وہ پیچیدہ تھا۔ کیتھی نے نگلی سے باپ کو دیکھا۔

”اس نے پہلے زیڈ پر حملہ کیا تھا، اس نے تو صرف جوانی بیچ مارا ہے۔“

”آج کے بعد وہ لڑکا اس گھر میں تو کیا مجھے اس بلڈنگ کے آس پاس بھی دکھائی نہیں دینا چاہیے۔“ مارک کو سمجھا جھاکر بیٹھنے کے بعد پال نے نگلی انداز میں اعلان کیا تھا۔

”زیڈ..... فارگا ڈیک..... مارک کی تنگ نظری سے آپ کی طرح واقف ہیں۔“ کیتھی جھنجھلائی۔

”لیکن تمہارے دوست کی حرکت مجھے بالکل بھی پسند نہیں آئی۔ تمہارا اور مارک کا معاملہ تم دونوں کو آپس میں الجھنا چاہیے تھا۔“ پال نے غصے سے کہا۔

”اؤ گے ڈیڈ! میں تمہاروں کا کیتھ کو..... ریلیکس۔“ ڈینیئل نے آنکھ کے خفیہ سے اشارے سے کیتھی کو اندر کمرے میں جانے کو کہا تو وہ خاموشی سے کھسک گئی۔

”کریچوین! ہوتے ہی ان کی شادی کر دینی چاہیے، اس سے پہلے کہ درمیان میں کوئی غلط فہمیاں آئیں۔“ پال نے اپنا فیصلہ سنایا تو ڈورس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جبکہ ڈینیئل کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔

☆☆☆

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے زمین! یہ کیا گیم کھیل رہی ہو تم۔ کل کو اب تمہیں اپنے لفظوں سے پھر نے نہیں دیں گے۔ اگر بے مذاق تھا تو تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اب تم بری طرح پھنس چکی ہو اماں اب اہل ہی جا کر پیچھو شادی کی تاریخ دے آئیں گے۔“ اماں کے جاتے ہی حریم اس پر ہنسی گئی۔

”تو.....؟“ زمین نے دیکھتے سر کو دباتے ہوئے بے تاثر لہجے میں پوچھا تو حریم اسے دیکھ کر گئی۔

”تو.....؟ تو یہ کہ کیا تم واقعی میں زلفی سے شادی کرو گی؟“ حریم نے بے یقینی سے پوچھا۔ کل تک تو وہ ہاتھ دہل زلفی کو گالیاں دیا کرتی تھی۔

”میں نے جو کہا تھا، اماں سے کہہ دیا ہے حریم! اب میرا دماغ مزید مت دکھاؤ۔“

”سب ٹھیک تو ہے مینا تو؟“ حریم کال کسی گہری کھائی میں ڈوبا۔“ تم تو عباد کے علاوہ کسی اور کے متعلق سوچنا بھی گوارا نہیں کرتی میں؟“

”نام مت لو اس کا۔“ زمین نے سختی سے اسے ٹوک دیا۔

”کسی کی ناراضی اور خند میں فیصلہ مت کرو زمین! کل کو پچھتا کر فیصلہ بدلو گی تب تک دیر ہو چکی ہوگی۔“

حریم کو پکا یقین ہوا کہ عباد سے کسی بات پر لڑنے کے بعد ناراض ہو کر زمین یہ فیصلہ کر رہی ہے۔

”میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔ تمہاری بہت مہربانی ہوگی اگر تم یہ بیک بیک چھوڑ کر چائے کا ایک کپ

بنالواگو۔“

نزمین نے خشک لہجے میں کہا تو حرم ناچا ہتے ہوئے بھی وہاں سے ہٹ گئی اور بس..... تنہائی سے کسی شرم..... نزمین کے کب سے رکے آنسو پھر سے بہہ نکلے۔
وہ کسی کی بھی ضد میں آکر خود کو تباہ و برباد کر دینے کی حد تک فیصلے کرنے والی خصلت رکھتی تھی۔ محبت اور نفرت میں شدت پسند..... فوری فیصلے کرنے والی عکلت پسند۔
”مر جاؤ تم اللہ کرے عباد و ہم! تم نے میرے سارے خواب توڑ ڈالے جس کا تم کوئی حق نہیں رکھتے۔“
”کیے میں منہ چمپا کروہ بے آواز بلک اٹھی۔

☆☆☆

زلفی بے رتو شادی مرگ کی کیفیت طاری تھی۔ اسے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ نزمین شادی کے لیے مان گئی ہے۔ نزمین کی اگر غرور اور شہ زلفی کو یقین دلاتا تھا کہ وہ کسی طور اس رشتے پر راضی ہونے والی نہیں تھی لیکن آج اچانک ماموں، ماما کا مٹھائی کے ٹوکے کے ساتھ آنا اور دو ماہ بعد کی شادی کی تاریخ دے کر جانا اسے بے یقینی بھری خوشی کا شکار کر گیا تھا۔

”اب آئے کی قابو میں..... سا.....“ وہ زیر لب گالی کہتے ہوئے سرشار بھی تھا۔ نزمین جیسی بڑھی لکھی طرح دار اور کم سن لڑکی جیسی لڑکی کا یوں بیٹھے بٹھائے ہاتھ آجانا اس جیسے ویلے تختے کے لیے کروڑوں کی لاٹری نکلنے کے برابر تھا۔

”اب اپنے انداز ٹھیک کر لے پستی! وقت! اٹھ کر اسٹور پر جایا کر۔“ نصرت نے اپنی خوشی دہلاتے ہوئے اسے لٹاڑا تو وہ بالوں میں سر جھکی کرتے ہوئے نہا۔

”ارے اماں! اب ہی تو عیش کے دن آرہے ہیں۔“

”بکواس مت کر..... خود کھر بیٹھ کر بیوی کی کمائی کھائے گا کجنت۔“ نصرت نے اسے گھر کا۔

”میاں بیوی گاڑی کے دوپیسے ہوتے ہیں اماں! مل کر گاڑی چلے گی تو ہی گھر چلے گا۔“ وہ مطمئن تھا۔

”اب بہن! بیٹھی بھائی صاحب موٹر سائیکل کا سوچتے ہیں جہیز میں یا نہیں..... بھئی! میں تو لالچ ہے نہیں، ان کی بیٹی کو آنے جانے میں آسانی ہوگی۔“

”دیں گے کیوں نہیں..... اتنے سالوں سے میری بیوی کی کماری ہے، جمع تو کرتے ہی رہے ہوں گے۔“

وہ ایسے ٹپکے سے بولا جیسے واقعی نزمین اس کی بیوی ہو۔ جبکہ نصرت کو خوب صورت۔ بہو کے ساتھ گھر کے جہیز کی آس جی ٹنگ ٹنگ تھی۔ زلفی کے ہونٹوں پر مستقبل مسکراہٹ نے گھیراؤ کیا ہوا تھا۔

”اب اس الو کے بیٹے سے، کہو بیٹیدہ ہو جائے۔ کام کاج سنبھالے تاکہ نکٹو بن کر بیوی کی کمائی پر نہ پڑا رہے۔“ پچھپھا کو بیٹے کے کروت بالکل بھی پسند نہ تھے۔

”بھئی..... ان دونوں کا آپسی معاملہ ہے اور دنیا کا دستور ہے میاں! بیویاں اپنے شوہر کی کمائی کھاتی آئی ہیں کیا حرج ہو جائے گا جو ہمارے زلفی نے چار پیسے اپنی بیوی سے لے لیے۔ حق بنتا ہے اس کا۔“ نصرت نے مدبرانہ انداز میں کہا تو وہ کیونکر زلفی کے بیوی کو دیکھنے لگے۔

”بھئی! کبھی میں سوچتا ہوں، یہ بے حیا کس پہ گیا ہے..... پھر میں تجھے دیکھ لیتا ہوں۔“ پچھپھانے دانت پیسے تو وہ ٹھٹھا کا کر نہیں۔

”بڑے مذاق پر ہوا آپ بھی۔“ پچھپھا کہتے جھکتے گھر سے نکلے تھے۔

”وہ نہ..... بندر کیا جانے ادھر کا سواد۔“ وہ میاں کے جانے کے بعد ہاتھ جھٹک کر بولیں۔ ”جب بہو آئی آکر گھر کا آدھا خرچا اٹھالے گی تو سب سے پہلے یہی سکون میں آئیں گے اور مجھے شاباش دیں گے۔“

☆☆☆

شادی کی تاریخ کہتے ہی گھر میں شادی کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ اماں نے نزمین کے لیے رکھی ماری چیزیں اٹھا کر حرم کے لیے رکھ دیں۔

”میری شہزادی کی ہر چیز اس کی پسند کی ہوگی۔“ انہوں نے نزمین کی پیشانی چومتے ہوئے کہا تو اس کی اکھیں غم ہوئیں۔ دل مرچکا تھا، خوشیاں روٹھ گئی تھیں۔ ایک حرم ہی کی جو نزمین کی خاموشی سے ہوتی رہتی تھی۔

اور پھر نزمین نے جاب سے استعفیٰ دے دیا لیکن چونکہ وہ جاب چھوڑنے سے دو ماہ پہلے کہنے کو انعام کرنے کی پابندی تھی، اس لیے اسے شادی تک آس جانا ہی تھا۔ شاپنگ کے لیے وہ ایک دن بھی بازار نہیں گئی تھی۔

”مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ؟“ ایک دن تنگ آکر حرم نے اسے پکڑ ہی لیا تھا۔

”اب کیا ہے؟“ وہ بے زار تھی۔

”کیوں اس طرح ری ایکٹ کر رہی ہو۔ مجھے خوف آ رہا ہے تمہاری اس بے حسی سے۔“ حرم بے چارگی سے بولی۔

”تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟“ وہ اسی طرح خٹس تھی۔

”کیا تم دل سے راضی ہو زلفی کے لیے؟“ حرم نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ اگر وہ اس کا اور عباد کا معاملہ نہ مانتی ہوتی تو شاید اماں کی طرح بے فکر ہو کر نزمین کی شادی کی شاپنگ کرنی ہوتی لیکن عباد جیسے بھرا لٹا سے نزمین کے آئینہ میں بندے کو چھوڑ کر زلفی کے ساتھ شادی کے لیے ہائی بھرنا حرم کو آنے والے کسی خاموش طوفان کی نشان دہی لگ رہا تھا۔

”خود کشی کی رہی ہے نا..... زلفی ہی سہی۔“ وہ سرسرا تے لہجے میں بولی تو حرم کا دل تھم سم گیا۔ رکی سانس سمجھتے ہوئے اس نے نزمین کو دیکھا۔

”عباد کا کیا بنا؟“

”مر گیا ہے وہ۔“ نزمین نے ضبط سے کہا اور اسے دیکھا۔ جب حرم نے اس کی آنکھوں میں جھپکتے آنسو دیکھے۔

”بہت برا جھگڑا ہوا ہے کیا؟“ حرم کا دل پٹکلا۔

”تم نے ٹھیک کہا تھا اس کے بارے میں۔“ نزمین نے آنسو پیٹتے ہوئے کہا تو آواز گلے میں اٹکتے لگی۔

حرم کا دل گویا چھل کر قلعے تک آیا۔

”اب آگے کچھ مت پوچھتا رہی! میں خود کو بہت مشکل سے اس زندگی کی طرف لائی ہوں۔ اب میں پیچھے مڑ نہیں دیکھنا چاہتی۔“ حرم نے تھوکر نکل کر سوکھتا حلق تر کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

نزمین نے گردن بدلتے ہوئے نیکیے میں منہ چھپایا۔

”جاتے ہوئے لائٹ آف کر دینا۔“ حرم ہمدردی سے اسے دیکھتے ہوئے لائٹ آف کر کے کمرے سے اٹھ گئی۔ اسے نزمین سے ہمدردی سہی مگر وہ خوش تھی کہ زلفی کا کردار عباد جیسا نہیں تھا۔ اس کے باہر نکلتے ہی نزمین کے سارے دکھ جائے نکلے اور آنکھوں کی زینم نم ہونے لگی۔ اس دل میں عباد نامی تیر گڑ چکا تھا نہ موت آنی تھی اور نہ ہی زندگی مل رہی تھی۔

”مینو اندر سے خوش تو ہے نا؟“ اماں بھی حرم کی طرح دوسروں کا شکار تھیں حرم نے گوگو کی کیفیت میں

جواب دیا۔

”اندر کا تو نہیں پتا اماں! ہاں اور سے راضی ضرور ہے۔“
اماں خاموشی سے اس کی شکل دیکھتی رہ گئیں جیسے اس کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔
☆☆☆

جو نسل کا وہی بے وفا
یہ بڑی عجیب سی بات ہے
جو چلا گیا مجھے چھوڑ کر
وہی آج تک میرے ساتھ ہے
کرے پیار لب پر لگے نہ ہو
یہ کسی کا نصیب ہے
یہ گرم ہے اس کا، جفا نہیں
وہ جدا بھی ہے تو قریب ہے
وہی آنکھ ہے میرے روبرو
اسی ہاتھ میں میرا ہاتھ ہے
جو چلا گیا مجھے چھوڑ کر
وہی آج میرے ساتھ ہے
میرا نام تک نہ جو لے کا
جو مجھے فرار دے کا
جسے اختیار تو تھا مگر.....
مجھے اپنا پیار نہ دے کا
وہی شخص میری تلاش ہے
وہی درد میری حیات ہے
جو نسل کا وہی بے وفا
یہ بڑی عجیب سی بات ہے
جو چلا گیا مجھے چھوڑ کر
وہی آج تک میرے ساتھ ہے

”کہاں ہو؟ ملتا ہے تم سے۔“ وہ ایک اداس سی شام تھی جب زمین سنجیدگی سے خود کٹی کر خنکے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ بے حس کی یاد دہانی تو اسے احساس ہوا کہ وہ کتنی نامی گزشتہ کرنے والی تھی۔ اسے لگا کہ مہر جانا اس شادی سے بہتر فیصلہ تھا۔ کل کے نتیجے نے اسے چھوڑ دیا۔
”زندہ ہوں..... اسی دنیا میں۔“ زمین کو جوابی نتیجہ کرتے ہوئے اسے رونا آگیا۔ کیا تھی وہ اور کیا بن سکتی تھی۔

”اور مجھے کسی سے نہیں ملتا۔“
”تم آ رہی ہو یا میں گھر آ جاؤں؟“
”میں نہیں ملنا چاہتی کل! کسی بھی پرانے تعلق کو میں اپنی زندگی میں نہیں دیکھنا چاہتی۔“ اس نے آنسو پونپونے

کہا۔

”کیوں اس مدت کو اور فوراً آؤ۔ بہت ضروری بات کرنی ہے تم سے۔“ یوں سمجھو، زندگی اور موت کا معاملہ
”.....“
”نیکل نے بیچلت کہہ کر اسے مزید کسی سوال جواب کا موقع دے بنانے کی جگہ بتا کر رابطہ منقطع کر دیا۔ زمین
کبری سانس پھینچی۔ پچھلے مہینے بھر سے وہ نیکل سے ماسوائے واس اپ مہینچہ کے کسی رابطے میں نہ تھی۔ اور
آج.....

اس نے ایک نظر اپنے چمن آلود کپڑوں پر ڈالی اور الماری کھول کر کھڑی ہو گئی۔
”کہاں جا رہی ہو؟“ حریم اندر آئی تو اسے میروں کلر کے گرم سوٹ پر گرے کوٹ اور مفلر اوڑھے بالوں
میں پرش کرتے دیکھ کر خوش گوار سے حیرت سے پوچھا۔ بہت دنوں بعد اس کا سوگوار ساحن میروں رنگ میں کھلا
اور دیکھا تو بہت اچھا لگا تھا۔
”یونہی..... نیکل نے بلایا ہے۔ سوچا چکر لگا لوں۔“ وہ بال پیکچر میں جکر مفلر لیٹتی تیار تھی۔ حریم طمانیت
سے مسکرائی۔

”بہت اچھی بات ہے۔ کب سے سڑی بسی پڑی رہتی ہو، کھلی ہوا میں طبیعت پر اچھا اثر پڑے گا۔“
وہ ہر بلاتی موبائل بجک میں ڈالتے ہوئے اماں کو بتا کر گھر سے نکل آئی۔ رکشہ میں بیٹھ کر قریبی ریسٹورنٹ
کے قریبی چمن میں پہنچے۔ نیکل بھی بار اس نے راستے سے واپس لوٹ جانے کے متعلق سوچا تھا۔ وہ ریسٹورنٹ کے
ہال پر طائرانہ نظر ڈالی۔ کئی کئی میز پر کئی طرف آگئی۔ شولڈر بجک نیکل پر رکھتے ہوئے وہ کرسی پر گئی۔ کرسی سے سر
اٹکائے آنکھیں موندے وہ نہ جانے کن تکلیف دہ سوچوں کی زد میں تھی کہ نیکل کی طرح کو کسی نے کھٹکھٹایا تو وہ ہڑبڑا کر
سیدھی ہوئی۔
”ہیلو۔“ اپنی تمام تر وجاہت کے ساتھ مسکراتا ہوا اس کے سامنے عباد وسم کھڑا تھا۔ زمین کا دل جیسے کسی
نے مضمی میں پہنچ لیا ہو۔

”جھوٹ بول کر ملنے کے لیے بلایا ہے تمہیں، لیکن معذرت بالکل بھی نہیں کروں گا۔“
وہ رشاش سے کہہ رہا تھا اور زمین کے حلق میں کڑواہٹ بھری جا رہی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے جانے کے لیے اٹھی
اور اپنا بیک تھام کر کندھے پر ڈالا لیکن اپنے ہاتھ کو عباد کے مضبوط ہاتھ کی گرفت میں پا کر وہ غصے سے بولی۔
”ہاتھ چھوڑ دو میرا..... اور میرا نہیں خیال کہ تم ساری زندگی میرا سامنا کرنے کے قابل رہے ہو۔“
”اور اگر میں کہوں کہ یہی ہاتھ مانتے آیا ہوں تم سے تو؟“ عباد نے پرسکون انداز میں کہا تو وہ ہانگی کی سی
کیفیت میں اسے دیکھنے لگی۔

”شادی کرنا چاہتا ہوں تم سے بیوی فل گرل! تم جیسی قیمتی سوچ رکھنے والی لڑکی میں اپنی زندگی سے لٹی نہیں کر
سکتا۔“ وہ بڑے جذب سے کہہ رہا تھا اور زمین کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس پر پوزل پر اسے رونا چاہیے یا ہنسا۔
☆☆☆

”یہ لو بھی..... شادی کارڈز کے ڈیزائن ہیں جو پسند ہو مینو کو، وہ الگ کر لیتا۔“ اپنا شادی کارڈز کی
کیلاگ اماں کو تھما کر حیرت انگیز اشتیاق سے کتاب ان کے ہاتھ سے لے کر کارڈز کے ڈیزائن دیکھنے لگی۔ طوطی بھی
اس کے ساتھ جھبک آئی۔
”ابھی تو تین ہفتے پڑے ہیں مینو کے اماں! شادی کی تیاریاں ختم نہیں ہوئیں آؤ آپ کو شادی کے کارڈ
پہنوانے کی فکر لگ گئی ہے۔“ اماں جڑبڑ ہوئیں۔ تو وہ مسکرا دیے۔

”تیار یاں تو آخری دن تک چلتی رہتی ہیں کارڈ چھینے میں بھی وقت لگتا ہے۔ پھر بانٹنے تو اتنی مرضی ہیں جب جی چاہے گلاب بانٹ دیں گے۔ چھپ جائیں گے تو ذمہ داری ختم ہو جائے گی۔“ ابانے تفصیل سمجھایا تو وہ مسکرا دیں۔

”رشتے داروں کی لسٹ بھی بنائی ہے اب! کس کس کو بلاتا ہے اور کتنے کتنے بندے بلائے ہیں۔“ حریم ایک اور اہم کام یاد آیا۔

”بھئی۔ میرے گھر کی پہلی شادی ہے میں تو سب کو ہی بلاؤں گا اور پوری پوری فیملی کو بلاؤں گا۔“ ابانے بہت خوش تھے۔ اماں کا دل گھبرانے لگا۔

”چاہئیں کیا بات ہے... سب کام سیدھے سیدھے ہو رہے ہیں پھر بھی میرا دل جیسے کئی کتبے میں کسا ہوا ہے۔“ آج نہ چاہتے ہوئے بھی اماں نے اپنے دل کی گھبراہٹ اظہار ہی دی تھی۔ اماں خوب ہی فتنے۔

”تم غور نہیں بھی تا... بہت خوب ہوئی ہو۔ جب کوئی مسئلہ ہو تب بھی سکون نہیں اور جب کوئی مسئلہ نہ ہو تب بھی ٹینشن کر کوئی مسئلہ نظر نہیں آ رہا خدا خیر کرے۔“

حریم بھی ان کی بات سن کر ہنسنے لگی تو اماں جھینپ سی گئیں۔

☆☆☆

اس روز زمین گھر آئی تو بہت خوش تھی۔ اتنی خوش جتنی کہ اس شادی کے طے ہونے سے پہلے خوش مطمئن ہوا کرتی تھی۔ حریم رات سونے کے لیے کمرے میں آئی تو اس کے لیے دودھ کا گلاس لے کر آئی اور ساتھ شادی کا رڈ ز کی کیٹلاگ بھی۔

”یہ لو۔ اپنی شادی کا کارڈ پسند کر لو۔“ حریم مسکرائی تو وہ دودھ ختم کر کے خالی گلاس پیا پینڈ ٹیل پر رکھتے ہوئے حریم کی طرف متوجہ ہوئی۔

”تم نے بھی سوائے موت کے قیدی کی موت کی سزا کو بچانی کے پھندے کے قریب جا کر معاف ہو چکے ہو۔“ زمین کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ حریم کا دل خفیف سا لرزا۔

”کیا فضول باتیں کر رہی ہو... کارڈ پسند کرو شادی کے لیے۔“ حریم نے زبردستی کی بٹاشت سے کہا۔ وہ کھل کر مسکرائی۔

”پہلے شادی کے لیے لڑاکا تو پسند کر لوں۔“

وہ انہینان سے کہتی حریم کے ارد گرد گویا دھماکہ مچ گئی۔

”عہدائے پروپوز کیا ہے مجھے حری! وہ اپنی ماما کو ہمارے گھر بھیجنا چاہتا ہے میرے رشتے لکے لیے۔“ وہ شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ گھر ہی تھی۔ حریم کو لگا اس کے دماغ کے پرچے اڑ گئے ہوں۔

شادی والے گھر میں شادی کی تمام تیاریاں مکمل ہو جانے والی تھیں۔ شادی کا رڈ ز چھپنے والے تھے اور دلہن اپنے لیے تیار تلاش کر آئی تھی۔

دروازے میں کھڑی تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ ان کی گفتگو سنتی اماں اپنے دل کے ادا ہام کوچ ہوئے دیکھ چکرا کر گریں تو دھڑام کی آواز نے حریم اور زمین دونوں کو ٹپ بڑانے پر مجبور کر دیا۔ اماں کو کمرے کے دروازے کی چوٹ پر بے سدھ کرے دیکھ کر حریم بے اختیار جھنجھی چلی گئی۔

☆☆☆

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ



شکزیہ الطاف ہاشمی

عاطفی

ایک دھند بھری صبح رانیہ ساگ کے شبنم آلود
اور وہ بھی تازہ۔ یہ دیکھو، میں نے بہت سارا ساگ تو
توڑا ہی ہے، ساتھ یہ گلاب کے پھول بھی توڑ لائی
ہوں ان میٹھی کے لیے۔ اگر تم انہیں دیکھو ناں تو دیکھتی
آئیں۔
”اے رانی! یہ کیا کر رہی ہے؟“

رہ جاؤ گی۔ سچ میں وہ بہت اچھی ہیں۔“
”وہ اچھی تو ہے مگر اتنی ٹھنڈ ہے، خدا خواستہ جو
مجھے ٹھنڈ لگ جانی پھر۔“

اباں فکر مند ہو گئیں۔ اس کے دوپٹے اور سر پر
شبم کے لیے ٹھارے پڑے ہوئے تھے۔
اس کے بعد مالے، کدو، انار کے پھول، کچے کپکے
انار، لسی بہت کچھ گھر سے۔ چاہتا رہا تھا اور گرمی
سردی کی رکاوٹ کی پروا نہیں کی گئی تھی۔
رانی بھی ان ساری لڑکیوں میں شامل تھی۔
جنہیں اپنی بچپن سے بے انتہا محبت ہوتی ہے۔ اس
محبت کا آغاز اچھی ٹھوڑا عرصہ ہوا تھا۔

☆☆☆

مس نادیر نے رانی کی اباں کو بلوایا تھا، اسکول
میں انہوں نے کہا تھا کہ رانی انگلیں میں بہت کمزور
ہے۔ اگر ٹیوشن پڑھے گی تو اچھے نمبر آسانی سے لے
سکتی ہے۔ آپ اسے ٹیوشن ضرور پڑھائیں۔ کوئی اتنی
فیس بھی نہیں ہے، بہت ضروری ہے۔

کلاس بچہ کے سامنے رانی دم سادھے ان کی
بات منی انتہائی ادب سے کھڑی تھی۔ اباں نے اپنی
چادر درست کی اور ان کی پوری بات سن کر بولی۔
”میڈم جی! اپنا زمیندارہ ہے۔ زمین، فصلیں
بہت ساری ہیں۔ رانی آٹھویں پاس کر لے تو بہت
ہے۔ اسے پہلے ہی اسکول آنے کی اجازت بڑی
مشکل سے ملی ہے۔ گھر میں سو کام ہوتے ہیں
ہمارے۔ ہمیں بچی کو پڑھانے لکھانے کی کوئی
ضرورت نہیں ہے۔ گھر داری سیکھ کر اگلے گھر رخصت
کر دیں گے بس اور اس کے ابا کرم دین تو پہلے ہی
پڑھائیں لکھائیں کے سخت خلاف ہیں۔“

رانی کا خیال تھا کہ آج اس کا اسکول میں
آخری دن ہوگا۔ چوہدری کرم دین کا فیصلہ لوے پر
لیکھ جیسا تھا مگر اس رنگ آلود لوے سے غلط فیصلے کی
لیکھنوں میں مچ گئی تھی۔
اباں نے مس نادیر کی بھی ہوئی ساری باتیں ابا

کو کہہ سنائیں۔ بڑی راضیہ آپ اور بھاء طفیل بھی ماں
گئے تھے۔
”سچ ہے ابا جی، علم سے وڈی کوئی دولت
نہیں۔“

وہ دن اور آج کا دن ہے، آندھی ہو کر طوفان
بارش یا پھر زلزلہ زمین الٹ کر رکھ دے، مارے
باندھے چڑھنے والی رانی نے پڑھ کر دکھایا اور پھٹی
کی۔
مس نادیر کو ایک ایک لفظ رٹ کر سنایا پھر
کر سنایا ضرور تھا۔

رانی محبت بھانے والوں میں سے تھی، بھی
بڑے دل والی۔ جب رانی نے آٹھویں پاس کی تو
اسے رزلٹ کارڈ کے نمبروں سے زیادہ مس نادیر کے
لفظوں کا انتظار رہا کہ وہ کن الفاظ میں رانی کو سراہیں
گی اور کیسے اس کے حوصلوں کو پر لگا کر عزم کے عظیم
وسیع آسمان پر اڑنا سکھائیں گی۔

مس نادیر کا روشن چہرہ اس کا دل بڑھاتا گیا۔
وہ محنت کرتی رہی۔ نویں دسویں اور پھر کالج کا پہلا
دن وہ کون سے مضامین رکھے گی۔ کس کالج میں
داخل ہوگا۔ کیسے ہوگا۔ مس نادیر کی ہر بات حرف
ان کا ہر فیصلہ صادق۔

”رانی تو نے آج کیا کھانا ہے۔ یہ تیری میڈم
نے بتایا تھی۔“
”ہاں تو پوچھ لوں گی ماماں ان ہے۔ دیے دو تو
مج سویرے اور چوبیس بجتی ہیں۔ اباں میں کہاں
سے بچوں بھلا، لے دے کے یہی دیکھ گئی کے
پراٹھے، کمی، دیکھی مرٹ کے سان اور دیے بڑے بڑے
مالے..... پہلے چھلکا انار د پھر پھانکیں کھاؤ۔ اف
کاش میں اور چوبیس بجتی روزانہ۔“
رانی حسرت سے بہت کچھ کہہ گئی۔
”ہمارے اپنے تازہ مالے آتے ہیں ہمارا
سے، اس اور چوبیس بجے سے سونکا اچھے۔ درمیان سے
کاٹ کر جوس نکال لیا کرو رانی! اس میں اتنی حسرت

کی کیا بات ہے۔“
”کاش میں مس نادیر بن سکتی..... کاش.....“
☆☆☆

رانی! اباں کا شو سے تمہارا رشتہ طے کر رہی
ہے۔“
راضیہ اب کی شادی کو تیسرا سال تھا۔ ایک چھوٹا
منا بھی ان کی گود میں کھیلنے لگا تھا۔ طفیل بھائی کی
بھلی ہوئی تھی، خیر سے اس سال دھان کی فصل کی
کار بساند بھرے پانیوں سے نکل کر دور در تک پھیل
گئی۔ خوشبوؤں سے بے لپے چاول کے دام بھی
بہت اچھے ملے تھے۔ اب رانی کے ہاتھ پیلے کرنے کا
وقت آ گیا تھا۔ چوہدری کرم دین کو اپنے پیچھے کا شرف
ملی کا شو سے بڑی محبت تھی، جیسے ایف ایس سی میں نمبر
اچھے ملے تھے، پر لے تو تھے ناں، پاس تو ہو ہی گیا تھا۔
مگر اپنے مروجہ ناپ کی زمین ماں سمجھ کر بڑے
شوق سے ملے لگا لگی تھی۔ بڑا سختی پڑھتا۔ چوہدری کرم
دین کو اس پر ہمیشہ بڑا اہان رہا تھا۔ اب وہ اسے
فردی میں لینے کا سوچ رہا تھا بلکہ وہ تو تھا ہی بیٹا،
بھائی صنف نے جموں پھیلانے کے بجائے بڑی
سیدھی بات کہی تھی۔

”رانی میری فونہ (بہو) بنے گی بس۔“ کرم
دین بڑے دل سے مسکرایا اور پیچھے کے سر پر پیار دینے
لگا۔ رانی کی زندگی میں کا شو چھوڑ کوئی عاشو با شو نہیں
آئے تھے سوائے مس نادیر کے۔ اس وقت بھی مس
نادیر کے خیالوں میں کھوئی ہوئی، اپنے بانی اسکول
کے زمانے کی سال بھر پہلے کی تصاویر نکالنے لگی تھی۔
”مس نادیر بہت ذہین اور خوب صورت
ماتون ہیں۔“

رانی اپنی ساری کلاس فیلوز کو ان کی باتیں بتاتی
رانی۔ اب اس کے پاس مس نادیر کی مسکرائی ہوئی
تصویر تھی۔
”اسی میں جانتی ہوں کہ پہلے میں بی ایڈ کر لوں
کر سکی اچھے سے آدمی سے میری شادی کر دیجیے گا۔“

رانی نے اپنے تئیں بڑا پڑھا لکھا جواب مختصر
سدا دیا تھا۔
”پڑھنا اچھے سے آدمی کا کیا مطلب ہے۔ کیا
کرتا ہے اور جو محبت ہے ناں کسی پڑھے لکھے اباں
پڑھ، ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ تیرا نصیب
انہوں میں جڑا ہے اور تو بھلا کوئی بڑی دسی (بچی) ہے
کسی اور کی محبت میں خود کو ناحق گھلاتی رہے۔“
”مجھے کسی سے محبت نہیں ہے امی! عمر وہ مس
نادیر کہتی ہیں کہ پڑھے لکھے انسان سے شادی کرو
تو.....“

”ان پڑھ تو وہ بھی نہیں رانی! ماں باپ سے
بڑھ کر بھی کوئی تیرے لیے سوچ سکتا ہے۔ یہ جوتی
ساری کتابیں پڑھی ہیں تو نے، ان سے ہی پڑھ کے
دکھا دے کوئی ہے اپنی ماں اور اپنے باپ سے بڑھ
کر۔ کہ تیری میڈم کے گھر چلتے ہیں، اس کی تو مانے
گی اور ماننا تو پڑے گا رانی کہ تیری شادی کا شو سے
ہی ہوئی ہے۔ چلو میڈم جی کا مشورہ کی گئی۔“
”ٹھیک ہے امی! بالکل ٹھیک ہے۔“ وہ
مسکراتے ہوئے ان کے گلے لگ گئی۔

☆☆☆

گیت پر ہی چوکیدار نے بتایا کہ میڈم جی گھر پر
نہیں ہیں۔ دونوں ماں بیٹی تانے پر بیٹھ کے شمالی نہر
کے کنارے اکی گھاس کود بھیجتی لوٹ آئیں۔
رانی نے ماں باپ کے فضلے کو دل سے مان لیا
تھا مگر میڈم کو بتانا بھی وہ ضروری سمجھتی تھی۔ میڈم اس
کے مزاج کو سمجھتی تھیں، اسے جانتی تھیں۔ اسے
درست مشورہ دیتیں۔ وہ رانی کے لیے بے حد اہم
تھیں۔

آج اس کا آخری چہرہ تھا اور میڈم جی کو شادی کا
کارڈ دینے وہ خود آئی تھی۔ یہ تو اس کے لیے اعزاز کی
بات تھی کہ وہ اس کی شادی میں شرکت کر تیں۔
کریوں کی چٹلائی دوپہر اس نے دوسری تیل

بالکل اچھی نہیں لگتیں۔ دیکھا نہیں کتنی مغرور ہیں؟“
 ”ایسے مت کہو عاشی!“ میں ہلکا کر بولتی۔
 ”ہاں وہ تھوڑی الگ طبیعت کی ہیں مگر مغرور تو نہیں۔“

”وہ مغرور ہیں۔“ عاشی ہٹ ڈھری سے کہتی۔
 میں افسوس بھری نظروں سے اپنی بہن کو دیکھتی۔
 ”عاشی! کیا قاسم نہیں برا لگتا ہے؟“
 ”نہیں۔“ عاشی ترنت جواب دیتی۔ میرا دل خوشی سے جھوم جاتا، مگر اگلے لمحے عاشی جواب دیتی۔
 ”مگر اچھا بھی نہیں لگتا۔“
 ”عاشی اس میں برائی کیا ہے۔“ عاشی کہتی۔
 ”آمنہ وہ ایک خود پسند، خود غرض شخص ہے۔ ایسے

تحسین گل



میں کچھ نہیں سمجھتی
 مگر اس کی ”سب کچھ“ سمجھتی
 میں تو اک عام سی لڑکی تھی مگر اس کی نظروں کے

لار نے مجھے خاص خاص الحاح بنا دیا تھا۔ جب وہ مجھے
 لہر مکرانا تھا آنکھیں جھپک جھپک جاتی تھیں۔
 دل ڈولی جاتے تھے۔ زمین زمین نہ رہتی،
 ماں بن جاتی۔ میں بادلوں سے سوار جھومتی، گاتی،
 کالی کیلے میں سرگوشیاں کرتی۔

”کیا محبت ایسا بے خود کرنے والا جذبہ ہے
 لی؟“ میں اپنی چھوٹی بہن سے سوال کرتی۔ وہ
 اس بھری نظروں سے مجھے دیکھتی۔

”آمنہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ مانا کہ تمہاری قاسم
 اسے کتنی ہونے والی ہے۔ مگر ابھی ہوئی تو نہیں۔
 اگلے لمحے آمنہ! خود کو اتنا بکا مت کرو۔ مانا کہ
 تمہاری ہونے والی ساس بھاری تائی ہیں۔ مگر مجھے وہ

آنکھوں کے سامنے۔ یہاں تک کہ ہماری آنکھیں
 بند ہو جائیں گی۔“
 اماں رو پڑی تھیں۔ ماں بیٹی کے آنسو آنسو
 میں گھل گئے تھے۔

”اپنی میڈم جی کو نہیں بلایا تم نے۔“
 ”نہیں اماں! رہے دو۔ ان کا وقت بہت
 ہوتا ہے۔ اسے کیا ضائع کرنا۔“ وہ اداسی
 منکرا دی۔

اماں کی محبت کتنی جچی تھی اور اس کی محبت کتنی
 تھی۔ ہر کسی سے محبت کرنا بھی کوئی محبت ہوتا ہے۔
 زندگی کے سفر میں تو بہت سارے لوگ ملتے ہیں
 کسی سے متاثر ہونا اور دل سے لگا لینا کہاں کی عقل
 مندی ہے بھلا۔ تو وہ غلطی پر تھی۔ اس نے سوچا۔

☆☆☆

”رانی! یہ تمہارے لیے۔“ وہ ایک ہماری
 بیکٹ تھا۔ ”یہ تمہاری سال دوم کی کتابیں، کچھ کم پڑیں
 تو لکھ کر دے دینا۔ بچا جان نے یہ پڑھا تو خود دیا ہے کہ
 تمہاری پڑھائی متاثر نہ ہو۔“
 وہ بنی رانی کی آنکھیں آنسوؤں سے پر ہو گئیں۔
 اور لب مکرانے لگے۔

”اور کوئی حکم ہو تو سائیں حاضر ہوں۔ اور
 تمہارے ساتھ ساتھ تمہاری میڈم جی کا بھی غلام
 ہوں۔“

”نہیں تم صرف میرے۔“
 ”ہیں۔۔۔۔۔ صرف تمہارا غلام۔“
 تو غلام ہی ناں۔“
 ”نہیں ایسا نہیں ہے۔“

پتا نہیں کون سا دکھ چپکے سے آنکھوں سے لپ
 کر دوپٹے میں جذب ہو گیا تھا۔

دی تھی۔ جب میڈم جی کے چھوٹے بیٹے نے اسے
 اندر آنے دیا تھا۔ اندر کمروں کی لمبی لائن، درمیان
 سے میڈم کی پیاری سی بڑی بیٹی خدیجہ لگی اور اسے سر
 سے پیر تک غور سے دیکھنے لگی تھی۔
 ”مما مگر نہیں ہیں۔“

”میڈم کہاں گئی ہیں خدیجہ۔“
 ”وہ بلا ہوئی ہیں اور آنے کا پتا نہیں لگ سکیں۔“
 پتا نہیں کیوں خدیجہ کا لہجہ اسے عام نہیں لگا تھا۔
 ”اچھا انہیں متاثر وردینا کر رانی آئی تھی اور یہ
 کارڈ انہیں دے دیتا۔“

پتا نہیں پھر کتنی آنا ہو بھی کہ نہیں۔ کاش وہ انہیں
 آخری بار دیکھ سکتی۔ کسی ہلکی سی امید کا سرا حقام کر وہ
 پھر سے خوش ہو کر چاہتی تھی کہ وہ میڈم جی کو ضرور
 یاد ہوگی۔ وہی جوان کے لیے ساگ لایا کرتی تھی جسے
 وہ دوسری بچہ زمش بھی تسلیم کیا کرتی تھیں۔

جب ہی درمیان والے کمرے سے نکل کر کوئی
 دوسرے کمرے میں گیا تھا، استری اسٹینڈ کے پاس
 سے گزرتی ہوئی وہ کوئی اور نہیں میڈم جی کی ہی تھیں
 جنہیں اس کی بات میں یقیناً کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان
 کے پاس پڑھ کر جانے والوں کی تعداد اتنی تھی کہ انہیں
 ان میں سے رانی یاد نہ رہتی تھی۔

☆☆☆

”اماں! یہ زرد سوٹ آج پہننا ہے ناں۔“
 آج اس کی مہندی کی تقریب تھی۔ بہت
 سارے میٹھے پکوان رواج کے مطابق تیار ہو رہے
 تھے۔ اسے خوش کرنے کے لیے بھی کچھ ہلکے ہلکے میٹھے
 بھی بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔

”رانی! آج اتنی اداس کیوں لگ رہی ہے۔“
 اماں کا موم دل ایک دم سے پھٹنے لگا تھا، وہ کیا
 بتاتی کہ میڈم جی اسے بھول گئی ہیں اس لیے بات بنا
 کر بولی۔

”سب کو چھوڑ کر جانا ہے۔“
 ”تو چھوڑ کر نہیں جائے گی، یہیں رہے گی میری



لوگ صرف اور صرف اپنے آپ سے محبت کرتے ہیں۔ کیا تم نے کبھی دیکھا نہیں کہ وہ اپنی بہنوں سے کس لہجے میں بولتے ہیں؟
”مگر کھانا لڑکا ہونے کا فائدہ اٹھاتا ہے۔“
عاشی اٹھتے بیٹے ایسے ہی ہوتے ہیں۔
”نہیں، آؤ! ابھی بھی اٹھتے بیٹے بوی کے لیے آزمائش بن جاتے ہیں۔“ میں تھک ہار کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ میری محبت عاشی کی مجھ میں نہیں آ سکتی۔

”یا اللہ میری مدد کریں۔“

☆☆☆

میں پندرہ سال کی تھی جب ایک دن آگن میں کھیلنے کھیلنے میں نے تانی کی آواز سنی۔ وہ امی سے کہہ رہی تھیں۔
”عالیہ میں تو آؤں مگر اپنے قاسم کی دلہن بناؤں گی۔“ امی نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا تو جیسی سی آواز میں بولیں۔

”بھابھی بچوں کے سامنے ایسی باتیں نہیں کرتے۔“ اور مجھے ڈانٹ کر وہاں سے بھگایا۔ میں وہاں سے بھاگ آئی مگر تانی کی آواز کو اپنے حواسوں سے نہ بھگا سکی۔ وہ آواز دن رات میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ آہستہ آہستہ قاسم مجھے اچھا لگنے لگا۔ جوانی کی رت بہت تیزی سے ہانپ رہی تھی۔ سچی سچی خواب حقیقت لگنے لگتے تھے۔

ابو چار بھائی تھے۔ وادانہاں نے چاروں بیٹوں کو ایک ساتھ قطار میں گھر بنوا کر دیے تھے۔ کاروبار مشترک تھا۔ فارغ البالی اور خوش حالی نے خاندان میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ تانی کی طبیعت میں دکھنا زیادہ تھا۔ امی بھی ان سے متاثر تھیں اور خود پسند لوگوں کو اپنے سے متاثر لوگ اچھے لگتے تھے۔ لہذا امی بھی بہت اچھی لگتی تھیں۔ اس کے علاوہ امی ہر کام ان کے مشورے سے کرتی تھیں۔

پلیٹ ہاتھ میں تھی، اندر آیا اور بولا۔

”بچیاں کہاں ہیں؟“
میں نے جواب دیا۔ ”نماز پڑھ رہی ہیں۔“
”اور چچا؟“

”وہ اپنے پیار دوست کی عیادت کرنے گئے۔“
پلیٹ اس نے مجھے پکڑائی۔ میں برتن رکھنے اور چینی خانے میں لگی تو وہ وہاں اسٹول پر بیٹھ گیا اور بولا۔
”آؤ منہ! تم نے آج یہ کیا حرکت کی؟ اپنا ہاتھ

مالوالا ذرا دکھاؤ۔“

میں نے قہقہے آگے بڑھائی۔ اس نے جلی ہوئی ہاتھ پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ میں کم مہم ہو گئی۔ ایک دم سے وہ اٹھا اور باہر نکل گیا۔ مجھے کھڑے کھڑے ہاتھ لٹکا دیا۔ بیت گیا تو قس طرح کے رنگ میرے اور گرد و چوٹ رہے تھے اور میں ان دواؤں میں گول گول گھوم رہی تھی۔ نجانے کتنی دیر لگی آہٹ ہوئی تو امی کھڑی تھیں۔

”آؤ! کیا ہوا بیٹا؟ ایسے کیوں کھڑی ہو اور کون آیا تھا؟“

”وہ..... وہ..... امی! قاسم چاچل دینے آیا تھا۔ اور میں..... مجھے وہ چھپیلی نظر آ گئی تو ڈر گئی۔“

امی جانتی تھیں کہ میں چھپیلی سے بہت ڈرتی تھی۔ اتنا کہ جہاں نظر آتی تھی جاہد ہو جاتی تھی۔ امی اس پر زور دیتی تھیں۔

”چلو اندر جاؤ، باقی کام میں دیکھ لوں گی۔“
میں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی اور ابھٹکی سے بس پر بیٹھ گئی۔

”یا اللہ کیا کیا تھا؟ خواب یا حقیقت۔ کیا میں بھی قاسم کو اچھی لگتی ہوں۔“

ساری رات آنکھوں میں گزر گئی۔ اگلے دن قاسم کو تانی امی کے گھر گئی تو وہ اپنی الماری صاف کر رہی تھیں۔ میں آگے بڑھی اور بولی۔
”تانی! امی! رہنے دیں، میں صاف کر دیتی

ہوں۔“ تانی امی خوش ہو گئیں۔ دو گھنٹے لگا کر ان کی الماری صاف کی۔ اتنے میں قاسم بھی آ گیا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔ اس نے اپنی بہنوں کا ہاتھ تو تانی نے جواب دیا کہ وہ دونوں اپنی کینیا کے گھر گئی ہیں۔ پھر مجھے سے بولیں۔

”بیٹی! ابھی جانا مت، میں جائے ہانی ہوں۔“
مگر پہلے ذرا کپڑے تبدیل کر لوں۔“ وہ ہاتھ روم میں چلی گئیں۔ قاسم میرے قریب آ کر سرگوشی میں بولا۔

”اچھا تو ساس صاحبہ کی خدمت ہو رہی ہے۔ بہت اچھی بات ہے۔ مجھے ایسی لڑکیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔“

اتنے میں تانی باہر نکل آئیں۔ میں بولی۔
”رکھیں تانی! میں آپ کے لیے چائے بنا تی ہوں۔“

قاسم بولا۔ ”میرے کپ میں چینی کم ڈالنا۔“
میں مسکراہٹ چھپاتی ہوئی باورچی خانے میں گئی اور پورے مالکانہ حقوق سے چائے بنانے لگی۔ آہستہ آہستہ محبت کا شمار اتنا گہرا ہونے لگا کہ میں اپنے گھر سے زیادہ تانی کے گھر کا کام کرنے لگی۔ تانی بھی بات بات پر مجھے بلا لیتیں۔ آؤ منہ آج مہمان آنے والے ہیں، ذرا پکچ میں کام ہوگا ہاتھ بٹا دینا۔ اپنے گھر والوں کی نسبت تانی کے گھر والے زیادہ اچھے لگنے لگے۔ عاشی نے مجھے اب میرے حال پر چھوڑ دیا۔

ان ہی دنوں قاسم کی خالہ کینیڈا سے آئی تھیں۔ ایک بیٹی اور ایک بیٹا بھی ہمراہ تھے۔ بہت مازوں اور شوخ مزاج۔ تانی نے دعوت کا اہتمام کیا تھا اور میں حسب معمول باورچی خانے میں تھی۔ قاسم اندر آیا اور پانی مانگا۔ میں نے گلاس اس کو دیا۔ اتنے میں اس کی کزن میرا باورچی خانے میں آئی اور بولی۔
”قاسم کیا آپ مجھے مارکیٹ لے کر جاسکتے ہیں۔ دراصل مجھے کچھ بہت ضروری چیزیں لانی تھیں۔“

قاسم بولا۔ ”کیوں نہیں، آئیے۔“

سیرانے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ بھی میرے ساتھ جانا پسند کریں گی؟“

میرے جواب دینے سے پہلے ہی قاسم بولا۔

”ارے یہ کوئی مہمان ٹھوڑی ہے، تم آؤ۔ میں

انتظار کر رہا ہوں۔“ مجھے بہت بے عزتی محسوس

ہوئی۔ جلدی جلدی برتن دھوئے اور گھر کی راہ لی۔

ساری رات روتے ہوئے گزر گئی کہ قاسم نے ایسا

کیوں کیا۔

کتنے دن سے نہ تانی کی خبر تھی نہ قاسم کی۔ دل

کسی طور بہلنا ہی نہیں تھا۔ آخر ایک دن دھماکا ہو گیا۔

تانی، اسی کے پاس آئیں اور بولیں۔

”عالیہ میں سوچ رہی ہوں کہ قاسم کی معافی

کروں۔“

اسی نے سکر اتے ہوئے کہا۔ ”بھابھی اچھی

آپ کی مرضی۔“

تانی بولیں۔ ”ہاں اسی لیے تمہارے پاس آئی

تھی کہ مشورہ دو کیا کروں۔ سچی بات تو مجھے آمنہ

بہت پسند ہے۔ مگر قاسم کا زحمان میرا کی طرف ہے۔

اب میں کیا کروں۔ تم سے شرمندہ بھی ہوں اور تم پر

مان بھی ہے۔ عالیہ! میری مدد کرو۔“ اسی خالی خالی

نظروں سے ان کو دیکھنے لگیں۔ میں ایک دم آگے

بڑھی اور بس کرتانی کے گلے لگ گئی۔

”ارے تانی! اس میں پریشانی کی کیا بات

ہے۔ دلہن وہی جو پاسبان بھائے۔ آپ کو میں پسند

ہوں مگر میں نے تو قاسم کو بھی اس نظر سے نہیں دیکھا۔

اچھا ہے وہ جہاں کہہ رہے ہیں، وہیں شادی کروں۔

بہت خوش رہیں گے اور وہ بھی تانی! میں ساری عمر

ان کو دیکھ کر پور نہیں ہونا چاہتی۔ میں تو وہاں شادی

کروں گی جہاں میری امی نہیں کی۔ کیوں ای؟“ اسی

نے غمناک نظروں سے میری طرف مسکرا کر دیکھا۔

”بالکل بھابھی! آپ بے فکر ہو کر رشتہ رکا

کریں۔ ہمارے دل میں ایسی کوئی بات نہیں۔“ تانی

نے امی کو شکر گزار نظروں سے دیکھ کر گلے لگا لیا۔

رات کو عاشر میرے پاس آئی اور بولی۔

”آمنہ! میں نے کیا سنا ہے؟“

”ہاں عاشر! تم نے ٹھیک سنا ہے۔ میں

انکار کر دیا ہے۔“

”مگر کیوں آمنہ! تم تو قاسم سے بہت

کرتی تھیں۔“

”نہیں عاشر! وہ محبت نہیں تھی۔ وہ تو چکی مر

خوار تھا، جس نے اپنے دائرے میں مجھے قید کر رکھا

تھا۔ نہ مجھے تم لوگ نظر آتے تھے، نہ تم لوگوں کی محبت

اور نہ ہی اپنی عزت۔ عاشر! تم ٹھیک کہتی ہیں، وہ

ایک خود پسند اور خود غرض شخص ہے۔ آج اس کو

بھلائی ہوئی نظر آئی تو اس نے میری ساری خوبیوں

نظر انداز کر دی۔ مجھے نظر آگیا ہے وہاں مجھے قاسم کی

محبت تو ملے گی مگر عزت نہیں۔ عاشر! مجھے آج بتا

کہ عزت محبت سے بڑھ کر ہے۔ آج مجھے امی کی

نظروں میں بے بسی اور لاچار دیکھائی دی۔ اگر آج

میں چپ رہتی تو امی کی نظریں ہمیشہ بھی رہیں۔ مجھے

لگا کہ آج میں نہ بولی تو بہت دیر ہو جائے گی اور وہ

عاشر! مجھے دکھ نہیں ہوا۔ میں خوش ہوں۔ میری روح

بلی بلی کی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ایک بوجھ تھا جو میں

لاڈے ہوئے تھی۔ آج میں اس بوجھ سے آزاد ہوں۔

اگر یہ محبت تھی تو کیسی تھی؟ نہیں، یہ محبت نہیں تھی۔ ام

لڑکیاں تھی نادان ہوتی ہیں، خواب دیکھتی ہیں۔ مگر

ان کی بھیا تک تعبیر ہے انجان ہوتی ہیں۔ عاشر!

عزت محبت سے زیادہ اہم ہوتی ہے۔ آج میں بے مان

اور جان گئی ہوں۔ امی ابو میرے لیے فیصلہ کریں

گے مجھے خوشی قبول ہوگا۔“

عاشر بولی۔

”آمنہ! تمہارے ساتھ جو ہوگا اچھا ہی ہوگا۔ تم

صاف نیت رکھنے والی لڑکی ہو اور قاسم جیسا بد

تمہارے قابل نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اسی لیے اس

سے بچالیا۔ میری بہن! اداس مت ہونا۔ اللہ

تمہارے لیے بہترین فیصلہ مقرر کر رکھا ہے۔ انشاء اللہ

کا شکر ادا کرتے ہیں۔“

اور ہم دونوں شکرانے کے نسل پڑھنے کے

اٹھ گئے۔

☆

انتباہ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے تنبیہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر ”آفشیل پیج“ کی اصطلاح استعمال کر رہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تاکہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے ماہناموں کے مضامین، افسانے اور کہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر آپ لوڈ کر کے ادارے کو سنگین مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کر رہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس فیج فعل کو فوری ترک کر دیں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

Prevention of Electronic Crimes Act 2016

اور

Copyright Ordinance 1962 / 2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/ اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

ماہنامہ شعاع
عمران ڈائجسٹ

خواتین ڈائجسٹ
ماہنامہ کرن

ادارہ خواتین ڈائجسٹ

حکام

ستائیسویں قسط

وہ سائے میں نظر آ رہا تھا۔ تیز روشنی اس کی پشت پر پھیلی۔ اس لیے وہ کھڑا ہوا تو اس کے چہرے کے تاثرات دھندلانے لگے۔
”کیونکہ میں ایک بات جانتا ہوں۔ پرانی وقت کا انتظار کروں گا۔“

عادتیں نئے ارادوں سے پختہ ہوتی ہیں۔ آپ کو سیدھے دروازوں کی عادت نہیں ہے۔ آپ کے قدم خود بخود چور راستوں کی طرف اٹھتے ہیں۔ آپ سے اپنی نئی زندگی نہ شروع کروں؟ آپ مجھے نیک جتنی کوشش کر لیں۔۔۔ اپنے اصل سے پیچھا نہیں چھڑا رہے۔ کیوں دیکھنا چاہتے ہیں؟“
سکتیں۔ آپ کی زبان جھوٹ کی عادی ہے نہ آپ تالیہ کی سربراہ غائب ہو چکی تھیں۔ وہ جیتی کے ہاتھ نقب لگانے میں ماہر ہو چکے ہیں۔ جلد باندھے آنکھوں سے اسے جانے دیکھ رہی تھی کہ وہ کون سا ہے۔ آپ کے سامنے دوبارہ سے وہی تحفہات آئیں۔ طرف بڑھتے بڑھتے وہ رک کا اور مڑ کے اسے دیکھا۔
گی۔ خواہش یا خوف سے مجبور ہو کر آپ کے قدم اب وہ روشنی اور اندھیرے کے کھیل سے دو



تھا اس لیے اس کا چہرہ چھاؤں میں تھا اور کرخٹ
تاثرات واضح تھے۔

”میں نے ساری زندگی پہلے پولیس اور پھر
ایٹلی جنس سروں میں ایمان داری سے اپنے ملک کی
خدمت کی ہے۔ میں نے آپ سے بڑے بڑے
کمرٹلو کوئیل میں ڈالا ہے۔ میں کبھی کمرٹلو کے
ساتھ ڈیلز کرنے اور ان کو امیونٹی دینے کے حق میں
نہیں ہوں۔ اوپر سے آئے احکام کے باعث میں
مجبور تھا۔ مگر ایسی ڈیلز لاء انفورسمنٹ کو ہمیشہ ناخوش
رکھتی ہیں۔ میں ناخوش ہوں۔ میرا ڈیپارٹمنٹ
ناخوش ہے اور ہم سب آپ سے دوبارہ کسی دوسرے

حال میں ملنے کے منتظر ہیں گئے“ چہ تالیہ۔ ”سرکو
جنٹس دے کر سلام کیا اور باہر نکل گیا۔

تالیہ نے گہری سانس لی۔
”وہ بھی دوبارہ اس آدمی کو نہیں دیکھنا چاہتی تھی“
اور یقیناً اس کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے۔ وہ غلط کہہ
رہا تھا۔ تالیہ بھی دوبارہ کوئی جرم نہیں کرے گی۔ اس
نے اپنا عزم خود سے دہرایا تھا۔

☆☆☆

کے ایل کے اس متوسط طبقے کے علاقے میں
ہنا وہ گھر اور اس کا بیٹھنے سہارا کی دھوپ سے خوب
روشن نظر آ رہا تھا۔ گھاس پہ کرسی ڈالے بیٹھا ایڈم
سورج کی جانب کمر کیے ہوئے تھا۔ وہ گھنٹوں پہ
جرٹل بٹائے قلم سے اس پر کچھ لکھتا۔ پھر کاٹتا اس
کے بال ماتھے پہ بکھرے تھے اور شیوڈ براڈ بھی ہوئی
تھی۔ یوں لگتا تھا وہ شدید ادا اس ہے۔

”تمہارے چوڑے کہاں گئے؟“
آواز عقب سے آئی تھی۔ ایڈم کا قلم تھما ہاتھ
منجد ہو گیا۔

اس آواز نے سرما کی دھوپ کو ایک دم مزید
سنہرا کر دیا تھا۔
وہ بے یقینی سے اٹھا اور پلٹا۔
گھاس پہ وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔

اسکرت پہ سفید مٹی کوٹ پہنہ سفید ہیٹ سر پہ تہہ
جائے وہ مسکراتی تھی۔

ایک دم سارے کے ایل کو اس کی رعنائی و اہلیں
مل گئی تھی۔ تالیہ واپس آگئی تھی۔

وہ چند لمحے دم سادھے کھڑا اسے دیکھ گیا۔ کسی
کو ایک دم یوں دیکھ لینے سے دل اس طرح بھی
سنبھل جاتا ہے اسے پہلی دفعہ معلوم ہوا تھا۔
”آپ..... کب آئیں؟ مجھے آہٹ تک سنائی
نہیں دی۔“

تالیہ منہم سا مسکرائی۔ ”بنا چاہے کے چلنا بھی
ایک آرٹ ہے۔ میں سیکھ رہی ہوں۔“

پھر خاموش ہوئی۔ دونوں چند لمحے چپ
کھڑے رہے۔

”کیا ہم دوبارہ سے دوست ہیں؟ چہ تالیہ؟“
اس نے امید اور خوف کے ملے جلے تاثرات سے
پوچھا۔ ”ہم نے آپ کے لیے وہ نہیں کیا جو کرنا چاہیے
تھا یا جو آپ کرتیں مگر ہم واقعی سمجھے تھے کہ
”دوست جسم کی ہڈیوں کی طرح نہیں ہوتے
کہ ان کے درمیان فریچر ہوتا تو ان کو زبردستی جوڑ دیتے

باندھ کے رکھا جائے تو وہ تندرست ہو جائیں گے۔
دوستوں کے فریچر مختلف ہوتے ہیں۔ جب دراڑ
بڑے تو دونوں کو لگا لگا کر جوڑنا چاہیے اور ایک دوسرے
کو آپس میں دہنی چاہیے تاکہ جب وہ دوبارہ ملیں تو ان
کی ہیٹ مختلف ہو۔ وہ ایک دوسرے سے پہلے
والے پوائنٹس پہ نہ جریں بلکہ اپنے اپنے کھنکھن کو اس دفعہ
نئے پوائنٹس پہ جوڑیں۔

کیونکہ ایک دوسرے کی غیر موجودگی میں ہمیں
احساس ہوتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے کئے
اہم تھے اور کتنے نہیں تھے۔“

”میرا سوال اب بھی وہی ہے۔ تمہارے
چوڑے کہاں گئے؟“ ہیٹ والی لڑکی کی مسکراہٹ
سادہ تھی۔ وہ پرانی باتوں کو دہرانے نہیں چاہتی تھی۔
ایڈم نے گہری سانس لی۔

”ان کو ایک ظالم ملی نے مار ڈالا۔“
”اوہ۔ آئی ایم سوری۔“ اس کی مسکراہٹ
غائب ہوئی۔ ”تم تو بہت دیکھی ہوئے ہو گے۔“

”مجھ سے زیادہ ماں دیکھی ہے۔ میرے غم
دوسری طرح کے ہیں۔“

پھر اسے خیال آیا تو جلدی سے جرٹل میز پر رکھا
اور دوسری کرسی اٹھا کے سامنے بٹھائی۔

”آپ داستان سے ملیں؟“
”نہیں۔ مگر مل لوں گی۔“ وہ دونوں اب

دھوپ میں آسنے سامنے بیٹھے تھے۔
”آپ کی نیلوفر کے خلاف مہم دلچسپ تھی۔“ وہ

پہلی بار مسکرایا۔ ”اس نے ڈیپریٹ ہو کے امیزون
پہاڑیوں کی کتاب شائع کر دی ہے مگر لوگ اس ناپک سے
اٹنے پورے ہو چکے ہیں کہ اس کی کتاب کی ایک ہیڈ لائن
بھی نہیں بنی۔“

”یہ میری آزادی کی قیمت تھی ایڈم۔“
”اب وہ آپ کو نہیں پکڑ سکتے؟“ وہ

امید سے پوچھ رہا تھا۔ تالیہ نے مسکرا کے سر ہلایا۔
دھوپ کے باعث اس نے ہیٹ مزید تر چھا کر لیا تھا

اور اس کی آنکھیں سنہری لگ رہی تھیں۔
”تم بتاؤ۔ ان کیس کی تحقیق کی تم نے؟ میں تو

آج نیلوفر کی کتاب سے فارغ ہوئی ہوں۔“
”جی۔ میں جتنی تحقیق کر سکتا تھا“ کرچکا ہوں۔

آپ کے نام پہ پینٹل پینک میں ایک ناکاؤنٹ کھلا
ہے اور اس کے جاری کردہ کریڈٹ کارڈ سے یہ پیک

خرید کے روز بھیجے جاتے ہیں۔ آپ کے خیال میں
یہ کون کر سکتا ہے؟“

”عصرہ!“ تالیہ کو یقین تھا۔ ”مجھے نہیں معلوم
کیسے اور کیوں مگر صرف وہی میری دشمن ہے۔“

”اب آپ کیا کریں گی؟“ وہ فکر مند تھا۔
”تالیہ کے پاس ہمیشہ پلان ہوتا ہے۔“ وہ

مسکرا دی تو ایڈم نے گہری سانس لی اور موبائل پہ
ایک فائل کھول کے اسکرین اس کے سامنے کی۔

”اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے
ہے؟“

”میں یہ فائلز تمہاری ای میل میں دیکھ چکی
ہوں، ایڈم۔ تم نے اس آف شور کمپنی کے بارے میں
فارغ سے دریافت کیا؟“

”جی اور وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں
جانتے۔“

”پھر وہ سچ کہہ رہے ہوں گے۔ لیکن تمہاری
تسلیم کے لیے میں ان سے خود بات کروں گی۔“

”آپ کے پاس جارجون ہیں؟ تالیہ کیونکہ
اس کے بعد میں اس فائل کو اپنی کتاب میں چھاپنے
پہ مجبور ہوں گا۔“

تالیہ کے ابراہن کٹھے ہوئے۔ ”تم کیسے اسے
چھاپ سکتے ہو جبکہ وہ ان فارغ اس کمپنی سے انکاری
ہیں؟“

”میں نے جن لوگوں کی آف شو کمپنیز پہلے
مکتشف کی تھیں ان سے ان کا اقرار یا انکار نہیں مانگا

تھا۔ ان میں سے کوئی ایک بھی اشتاعت کے بعد
تردید کے لیے نہیں آیا۔ اگر وہ ان فارغ کے پاس کوئی
ثبوت ہے اور وہ اشتاعت کے بعد لے آئیں تو میں

انگلے ایڈیٹرن سے ان کا نام خارج کر دوں گا۔“
”وہ ہمیں کورٹ لے جائیں گے ایڈم۔“

”میری فائل ثبوتوں کے ساتھ ہے۔ ان کے
پاس جو ثبوت کورٹ کے لیے ہے وہ مجھے ابھی دکھا

دیں۔“ وہ فیصلہ کر چکا تھا۔ اسے انصاف کرنا تھا۔
سب دولت چھپانے والوں کے ساتھ ایک ہی برتاؤ

کرنا تھا۔
”میں ان سے بات کروں گی۔“ وہ اٹھ کھڑی

ہوئی تو وہ بھی بے اختیار ساتھ ہی اٹھا۔ ایک دم سے
دھوپ میں اداسیاں گھل گئی تھیں۔

”لیکن تم میری آخری بات سننے بغیر ان کا نام
کتاب میں نہیں ڈالو گے۔ ٹھیک؟“

وہ اب بھی اسی کا دفاع کر رہی تھی۔ ساری

ناراضیاں رنجشیں ایک طرف وہ اب بھی اپنے لیڈر کو تحفظ دے رہی تھی۔ انڈم ادرسی سے منکر آیا۔

”اگر آپ اس فائل کو جعلی ثابت کر دیں تو میں بہت خوشی سے اسے اپنے مسودے سے خارج کر دوں گا۔ آپ کے پاس چاروں ہیں۔“

تالیہ نے پرس اٹھاتے ہوئے ایک آزدہ نظر اس کے جزل پہ ڈالی۔

یہ اس کتاب کا مسودہ تھا جو ان فاتح کا سیاسی کیریئر داغ دار کرتی تھی۔

ایک دفعہ پیران تینوں کی زندگیوں کا ایک کتاب سے متاثر ہونے جا رہی تھیں۔

☆☆☆

وان فاتح کی رہائش گاہ پہ سہ پہر اتر رہی تھی جب تالیہ نے اپنی کار باہر کھڑی کی۔ ہیٹ اتار کے فرنٹ سیٹ پہ رکھا بال پونی میں جکڑے اور کوئٹ کی

شکلیں درست کرتی باہر نکلی۔

اس نے گھنٹہ پہلے وائس ایپ پہ فاتح کو پیغام بھیجا تھا۔ ”میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ ابھی۔ اسی وقت۔“

ایک مان سا تھا کہ وہ فوراً اس کے لیے وقت نکال لے گا وہ جو اس کے پیچھے اس کے گھر آتا تھا۔ جو اس کے لیے خط لکھتا تھا۔ جو اس سے ای میلز میں پوچھتا تھا کہ وہ کب آئے گی؟ وہ اس کے لیے وقت ضرور نکالے گا۔

اس کا جواب دو منٹ کے اندر وصول ہوا تھا۔ ”میں گھر پہ ہوں۔ ابھی آ جاؤ۔“

اس کے دل کی حالت تب سے عجیب تھی۔ وہ گریٹ تک پہنچ گئی تھی مگر عجیب بیجان میں مبتلا تھی۔

کیا پہلے کہنا تھا؟ لگا؟ شکوہ؟ رکھائی کا اظہار؟ اور کیا نہیں کہنا تھا؟ کیا وہ بگڑا ملا یا لکڑ کر کے؟

کیا اس کو کچھ یاد آیا ہوگا؟ وہ اتنے دن بعد اس سے ملنے جا رہی تھی دل عجیب سا ہورہا تھا۔

گارڈ نے اسے دیکھتے ہی دروازہ کھول دیا۔

بٹلر اسے خوش آمدید کہتا سیدھا اندر لے آیا۔

”فاتح صاحب نے مجھے بلایا تھا۔“ اس نے خواجہ و وضاحت دی۔ بٹلر سر ہلا کے اسے میز چوں کی طرف لے آیا۔

”آپ اوپر اسٹڈی میں بیٹھیں۔ میں ان کو بھیجتا ہوں۔“

وہ ریٹک پہ ہاتھ رکھنے چلے گئی۔

ان میز چوں ان دیواروں کے درمیان وہ کئی دفعہ آئی تھی۔ عصرہ کی دوست سے لے کر فاتح کی چیف آف اسٹاف تک کا سفر اس نے کیسے طے کیا تھا یوں لگتا تھا زمانے بیت گئے ہوں۔

اسٹڈی سرور تھی حالانکہ موسم میں ٹھنڈا و اجبی تھی۔

وہ چپ چاپ کرسی پہ جا بیٹھی اور مقابلہ دہلی خالی بھوری سیٹ کو دیکھتے ہوئے ہنسلے تڑپ دینے لگی۔ وہ وہاں کیوں آئی تھی؟ وہ خود بھی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔

دروازہ کھلا اور بند ہوا۔ وہ نہیں دیکھ سکتی تھی کہ کن اکھیوں سے نووارد کو میز کے ایک طرف سے گزر کے اپنے سامنے آتے دیکھا تو وہ چونک کر رہ گئی۔

”عصرہ!“ تجب پہے ابرو اٹھائے۔ عصرہ مجھ کو اپنی ازلی مسکراہٹ دکھائے اس کرسی پہ براجمان ہو چکی تھی۔ بالوں کا جوڑا بنائے گروں میں موٹی پہنے وہ اب کرسی سے ٹیک لگائے سامنے کھڑی تالیہ کو دیکھ رہی تھی۔

”کھڑی کیوں ہو؟ بیٹھو نا۔ آخر تم مجھ سے ملے آئی ہو۔“

”میں....“ وہ رکی۔ ”فاتح صاحب نے مجھے بلایا تھا۔“

”تم نے مجھے ٹیکسٹ کر کے ملاقات کا وقت مانگا تھا۔“ عصرہ نے جتا کے کہتے ہوئے موبائل دکھایا جس پہ تالیہ کی چیٹ کھلی تھی۔

”یہ نمبر پچھلے ایک ہفتے سے میں استعمال کر رہی ہوں۔“

اول۔ فاتح نے نمبر بدل لیا ہے۔ تمہیں نہیں معلوم؟“

تالیہ نے ضبط سے گہری سانس لی۔ فاتح ہر دو ماہ بعد نمبر ضرور بدلتا تھا۔ مگر پہلی دفعہ اس کا پرانا نمبر عصرہ استعمال کر رہی تھی۔

”بیٹھو نا۔ ورنہ مجھے لگے گا کہ مجھے فاتح کی جگہ دیکھ کے تم پریشان ہو گئی ہو تالیہ۔“

”دراصل مجھے آپ سے بھی بات کرنی تھی۔“ وہ گردن سیدھی رکھے وہاں کرسی پہ بیٹھی۔ ”اچھا ہوا موقع مل گیا۔“

”اودہ تمہارے ٹیکس کا شکر یہ جو تم ہر روز بھیجتی ہو۔“

”عصرہ کو پیسے یاد آیا۔ تالیہ کے ابرو دنا کواری سے اٹھنے۔“

”میں آپ کو کوئی ٹیک نہیں بھیجتی۔ مسز عصرہ۔ مجھے معلوم ہے میرے سٹاپم پہ ٹیک کون بھیج رہا ہے اور میں ضرور پولیس میں شکایت درج کرنے جاؤں گی۔“

”اچھا۔ تم نہیں سمجھتی؟ نام تو تمہارا ہی ہوتا ہے ان پہ۔“ عصرہ پہ کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ جیسے مطمئن تھی۔ اس کا رو بہ تالیہ کو اچھا ہوا تھا۔

”میں ان ٹیکس کی تحقیق اور پولیس رپورٹ تو دو ادوں لی۔ کیوں نا ابھی ہم آریانہ کے بارے میں بات کریں۔“

عصرہ کے مطمئن تاثرات برقرار رہے مگر تالیہ نے دیکھا وہ میز پہ رکھے ہاتھ کے ناخن سے لکڑی کھرچنے لگی تھی۔

”آریانہ کا کیا؟“

”مسز عصرہ....! آپ نے آریانہ قاتل کیا تھا۔ ہم دونوں جانتے ہیں۔“

”دکھنا برا الزام لگا رہی ہو تم مجھ پہ!“ وہ افسوس سے بولی۔

”آریانہ کا خون آپ کے ہاتھ پہ ہے۔ خود پہ لکھا نہیں اور دونوں فاتح کو اسے منہ سے بتا دیں۔“

”یاد وہ آپ کو معاف کر دیں۔ میں تو میں ان کو بتا رہی ہوں۔“

”آریانہ کا خون آپ کے ہاتھ پہ ہے۔ خود پہ لکھا نہیں اور دونوں فاتح کو اسے منہ سے بتا دیں۔“

”یاد وہ آپ کو معاف کر دیں۔ میں تو میں ان کو بتا رہی ہوں۔“

دوں گی۔ ثبوت کے ساتھ۔“

وہ ٹھنڈے انداز میں بولی نظریں عصرہ کی آنکھوں پہ جمی تھیں۔

”تالیہ تمہیں لگتا ہے تم یہ کر کے مجھ سے کچھ چھین لو گی؟ تم غلط ہو۔ تم پہلے ہی مجھ سے سب کچھ چھین چکی ہو۔ اب میرے پاس کھونے کو کچھ نہیں بچا۔“

پھر عصرہ ابھی اور میز کے پیچھے سے نکل کے دروازے تک آئی۔ دروازہ پورا کھول دیا۔ پھر اسی اطمینان سے دیوار میں نصب شیفٹ تک آئی۔ ایک کرشل کا ڈیکوریٹیشن چیں اٹھایا اور بچلی۔

”تم میرے شو ہر کو مجھ سے چھیننا چاہتی ہو۔“

وہ ایک دم عرابی تھی۔ اس کی آواز اتنی بلند تھی کہ تالیہ بے اختیار کھڑی ہو گئی۔

”میں چاہتی ہوں آپ اپنے شو ہر کو بچا دیں۔“

عصرہ نے ہاتھ میں پکڑا پیں زور سے چوکت

خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

عمرہ کی عیبت

اقتدار کا جہنم



قیمت: 300/- روپے

مکتبہ داران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار کراچی۔ فون نمبر: 32735021

پہلے مارا۔ وہ باہر سڑکیوں کے پاس فرش سے گر گیا اور چٹکا چور ہو گیا۔

”تم میرے شوہر کو مجھ سے چھیننا چاہتی ہو؟“ اس نے دوسرا چپس اٹھایا اور اس طرف پھینکا۔ وہ تالیہ کی طرف چپس نہیں پھینک رہی تھی۔ وہ ایک ایک کر کے کرٹل کے چپس دروازے کے باہر پھینک رہی تھی۔

تالیہ نے تعجب سے اس کے انداز کو دیکھا۔

”میں کل سے بات کر رہی ہوں اور آپ.....“

”نکل چاؤ تم یہاں سے اور میری زندگی سے۔“

گیٹ لاسٹ تالیہ۔ وہ اوپنی آواز میں چلا رہی تھی۔ ساتھ ہی چپس زوردار آواز کے ساتھ فرش پہ پھینک رہی تھی۔ البتہ یہ سب کرتے ہوئے اس کا چہرہ بالکل ساٹھا تھا۔

تالیہ نے تیزی سے پرس اٹھایا۔ ”آپ جو بھی ڈراما کر رہی ہیں آپ اس میں کامیاب نہیں ہوں گی۔“ اور دروازے کی طرف بڑھی۔ عصرہ نے ہاتھ فضا میں روک لیا۔ جب وہ ہر نکل گئی اور سڑکیاں اترنے لگی تب عصرہ نے آخری چپس دیوار پہ دے مارا۔

تالیہ گلابی چہرے کے ساتھ زینہ اتر رہی تھی۔ ملازم لاؤنج میں اکٹھے ہوئے گردن اٹھائے سرائیکی کے عالم میں اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ کسی کو بھی دیکھے بنا زینہ پھلائی تو دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اسے یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔

اور موجود عصرہ ہوا بل ہاتھ میں لیے سڑکیوں کے دہانے پہ آ کر اور نمبر ملا کے فون کان سے لگایا۔ ملازم ابھی تک وہیں کھڑے تھے۔ مگر اسے آد کچھ کے گڑبڑا کے تو تر ہونے لگے۔ البتہ انہوں نے جاتے وقت اپنی مالک کی بھی آواز ضرور دینی تھی۔

”ہیلو۔“ دولت بھائی۔ کیا آپ ابھی میرے پاس آ سکتے ہیں؟ جی میں گھر پہ ہوں۔ ایمر چس ہے۔ مجھے سمجھے لگتا ہے کہ..... تالیہ..... فارغ کی ایک چیف آف اسٹاف..... تالیہ مراد..... مجھے لگتا ہے..... وہ

فارغ کی جان لینا چاہتی ہے۔“

تیز سانسوں کے درمیان وہ بے ربط انداز میں کہہ رہی تھی۔

اس کی آواز نے فضا میں عجیب سا خوف کھیر دیا تھا۔

☆☆☆

وہ گھر آئی تو دل کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ فارغ کا کیا نمبر اس کے پاس نہ تھا۔ البتہ ای میل ایڈریس موجود تھا۔ کیا وہ اسے ای میل کر دے؟ مگر پہلے اسے سب سے ضروری کام کرنا تھا۔

وہ پولیس اسٹیشن گئی اور ان کیس کے خلاف رپورٹ لکھوا کے آئی۔ بینک کا ٹائم ختم ہو چکا تھا اس لیے اس نے بینک جا کے درخواست دینا چاہی۔ موخر کیا اور کھر گئی۔ پھر سارے دروازے کھڑکیاں بند کر لیں اور چپس ٹیبل پہ اندر سے میں موت ہی جلا کے بیٹھ گئی۔

اب ہر طرف تاریکی تھی اور درمیان میں موم بتی کا شعلہ چمک رہا تھا۔ وہ اس شعلہ کو دیکھ کے سوچنے لگی۔

جیسے اسے مراد راجہ نے سوچنا سکھا یا تھا۔

سارے خیالات کو ذہن سے جھٹک کے صرف اس شعلے پر نگاہیں مرکوز کرنا اور ایک معاملے کو ہر زاویے سے دیکھنا۔

عصرہ کو وہ ڈراما کر کے کھیلنے لگی؟

اگر وہ کیس عصرہ ہی فارغ کو پھینک رہی تھی تو تالیہ کا نام لگانے کی کیا ضرورت تھی؟

بدترین چیز کیا ہو سکتی تھی؟

شاید کیس زہریلے تھے!

وہ چوکی۔

آف کورس یہ کیس زہریلے تھے۔ سلو پوائزن۔ اگر وان فارغ مر جائے تو پارٹی کا صدر کون بنے گا؟

وہی جو نائب صدر ہے۔ یعنی عصرہ محمود۔

اگر وان فارغ مر جائے تو لاگلا وزیر اعظم کون

بنے گا؟

بی این کے ”شہید لیڈر“ کی یہ وہ جو کہ پارٹی صدر ہوگی۔

وہ وان فارغ کی موت کے باعث ہمدردی کا دھڑلے لگی۔ وہ بھاری اکثریت سے کامیاب ہو کے پردھان منتری بنے گی اور کوئی اس پہ شک نہیں کرے گا کیونکہ ایک تو تالیہ مراد نے پیچھے تھے۔ اس نے ماتھے کو چھوا۔

تالیہ جیل جانے کی۔ فارغ قبر میں۔ اور عصرہ وزیر اعظم کی کرسی پہ براجمان ہوگی۔ پلان واضح تھا۔ اس نے پھونگ مار کے موم بتی بجھائی اور اٹھ کے پردے کھول دیے۔ اندر سے لاؤنج میں باہر طے اسٹریٹ پولیڈ کھم روٹی اندر آنے لگی۔ اب وہ کھڑکی کے پاس پہنچ گئی۔

پہلے اس نے فون نکالا اور فارغ کو ای میل بھیجی۔

”وہ کیس میں نے نہیں بھیجے۔ ان کو مت کھائیں۔ میں آپ سے مل کے وضاحت کروں گی مگر پلیز ڈونٹ ایٹ دیم۔ وہ زہریلے ہیں۔“

سارے شکوے دور ہو گئے تھے۔ بلکہ بھول گئے تھے۔ اس کی پریشانی ہر گزرتے لمحے بدھتی جا رہی تھی۔

ایک گھنٹہ گزر گیا اور ای میل کا جواب نہیں آیا۔ اسے کچھ نہ تھا۔ وہ تنگ کا انتظار نہیں کر سکتی تھی۔

تالیہ مراد کو انتظار کرنا نہیں آتا تھا۔ اسے عصرہ کے پلان کو ابھی قیل کرنا تھا۔ وقت نہیں تھا۔ سارے کھیل وقت کے ہی تھے۔

وہ اپنے کمرے میں آئی اور الماری کھولی۔ سامنے اس کا جپ سوٹ ہینگر پہ لگا تھا۔ اس نے وہ سوٹ نوچ کے اتارا۔

(میں ایک بات جانتا ہوں۔ پرانی عادتیں نئے ارادوں سے پختہ ہوتی ہیں۔)

سیاہ جپ سوٹ کے اوپر اس نے سیاہ ہڈ پٹی

اور ٹوٹی سر پہ ڈال دی۔ اب اس کا چہرہ اندر سے میں اٹھ گیا تھا۔

(آپ کو سیدھے دروازوں کی عادت نہیں ہے۔ آپ کے قدم خود بخود چور راستوں کی طرف اٹھتے ہیں۔)

ایک دروازے سے اس نے چمک دار پھل والا خنجر نکالا اور چمک کے اسے پنڈلی سے باندھا۔ ٹائٹس نیچے برابر کی اور ہڈس پہ کرائے وہ باہر نکلی۔

(آپ جتنی کوشش کر لیں آپ اپنے اصل سے بچنا نہیں چھڑا سکتیں۔)

باہر ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔ سرما کی بارش کے ابل کی ٹھنڈ میں اضافہ کر رہی تھی۔ اس نے ٹیکسی وان فارغ کی اسٹریٹ سے دو گھنٹوں چھوڑ کے روک دی تھی۔ وہ باہر نکلی تو بوند باندی تیز ہو چکی تھی۔

(آپ کی زبان جھوٹ کی عادی ہے.....)

تیز قدموں سے چلتی وہ وان فارغ کی اسٹریٹ کے دہانے پہ آئی تو وہاں دن کی روشنی کا سماں تھا۔ تالیہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ باہر پولیس کی گاڑیاں اور ایمبولنس کھڑی تھی۔

(آپ کے ہاتھ تقب لگانے میں ماہر ہو چکے ہیں.....)

وہ تیزی سے واپس بھاگی۔ اس کا رخ پچھلی گلی کی طرف تھا۔ وان فارغ کے گھر سے عین پچھلے گھر کی دیوار تک وہ آرکی۔ یہ گھر خاموشی میں ڈوبے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔

(جلد یا بدیر آپ کے سامنے دو پہرے سے وہی ترغیبات آئیں گی۔)

اس نے پچھلے گھر کی دیوار پھاگی اور بیرونی زینے پہ کرسی ملی کی طرح چڑھتی گئی۔ گھر کی چھت پہ پہنچ کے وہ بھاگی ہوئی اس کو نے تک آئی جو فارغ کے گھر سے ملتا تھا۔ صرف ایک کون..... اور درمیان میں دو فٹ کا فاصلہ۔

(خوشی کے ہاتھوں یا خوف سے مجبور ہو کے

آپ کے قدم آپ کو ایک دفعہ پھر اسی راستے پہ لے جائیں گے۔)

اندھیرے میں کسی ہولے کی طرح سیاہ ملی دوسری چھت پہ کود گئی۔ پھر دھیرے دھیرے قدم اٹھائی وہ فاتح کے لان کے عین اوپر چھت پہ آئی۔ (آپ کی انگلیاں ممنوعہ تالوں کی طرف بڑھیں گی اور آپ سوچے سمجھے بغیر ان کو کھولنا چاہیں گی۔ میں اس وقت کا انتظار کروں گا۔)

لان میں پولیس کے سپاہی کھڑے تھے۔ چند ملازم بھی افسوس اور شاک سے منہ پہ ہاتھ رکھے کھڑے تھے۔ کسی نے کسی کو کچھ بتایا تو اس نے سر ہلاتے ہوئے اناتھ بڑھا۔

”موت کی وجہ کیا ہے؟“
”موت؟ مجھے تو یوں لگتا ہے۔ قتل۔“
ٹوٹی پھوٹی سرگوشیاں کانوں میں پڑیں۔ اس کا دل جیسے اوپر حلق میں آنے لگا۔ وہ چھت سے نیچے کھٹنے والے دروازے کی طرف دوڑی۔

دروازہ بند تھا مگر وہ جانتی تھی کہ لاک کس نوعیت کا ہے۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے پن اندر ڈالی اور کھولنے لگی۔ بارش مسلسل تیز ہو رہی تھی۔ پانی کے باعث اس کے ہاتھوں سے پن پار پار پھسل رہی تھی۔ آنکھوں سے آنسو بھی بہنے لگے تھے۔ کیا اسے دیر ہو گئی تھی۔ کیا عصرہ اپنا کام کر چکی تھی؟

دروازہ کھلا تو وہ بنا آہٹ کے اندر داخل ہوئی۔ یہ کارڈیور ویران اور خاموش پڑا تھا۔ جی البتہ روشن تھی۔ اس نے ایک تکی بند کی (اور باقی تکی بندیں رہنے دیں تاکہ کچھ کسی کو علم بھی نہ ہو اور وہ اندھیرے میں رہے)۔ کارڈیور کے دہانے پہ بیڑھیاں تھیں۔ وہ چھت کے دروازے کے ساتھ دیوار سے لگی زینٹ کی طرف بڑھنے لگی۔

جہاں سے زینٹ شروع ہوتی تھی وہاں تالیہ رکی۔ اور سر زارا بھجکا۔
پچھلاؤنگ میں جمع لگا تھا۔ دائرے کی صورت

چند افراد وہاں کھڑے تھے۔ تالیہ نے بے یقینی ایک ایک کا چہرہ دیکھا۔

ایک دولت تھا۔ اس کے ساتھ موجود افراد اور وہ نہیں پہچانتی تھی۔ وہ ایک اسٹریچر کے گرد کھڑے تھے۔ اسٹریچر پہ رکھی باڈی پہ سفید کپڑا ہوا تھا۔ تالیہ نے یوں پہنچی ہے ہاتھ جمالیا۔ اس کا دل ہری طرح دھڑک رہا تھا۔

”یہ سب کیسے ہوا؟“ اسے اشعر کی آواز سنائی دی۔ گردن مزید جھکاؤ تو وہاں سر جھکائے کھڑا ہوا تھا۔
دولت نے سر جھکائے باڈی کے چہرے سے کپڑا سر کا یا۔

”زہر دینے کا کیس لگتا ہے۔“ دولت نے اپنے سامنے کسی کو مخاطب کیا۔ تالیہ مخاطب کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی اس لیے مزید آگے سر کی۔ اور تب اسے وہ نظر آیا۔

والت فاتح..... جو دولت کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ کسی جھکے ہوئے انسان کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔
وہ جیسے بہت ہمت سے وہاں کھڑا تھا۔
”زہر؟“ فاتح نے بھونپیں پیٹتے ضبط سے دہرایا۔ اسی اثناء میں دولت نے فحش کے چہرے سے کپڑا الٹ دیا۔

”ان کے چہرے سے یہی لگتا ہے کہ سز عصرہ کو کسی نے زہر دے کر مارا ہے۔“

تالیہ کا لبوں پہ چہا ہاتھ بے یقینی لیے نیچے جا گر۔ وہ بالکل سن رہی تھی۔

نپلا ہٹ مائل سفید چہرے اور پینڈا کھٹکوں والی عصرہ کی شش اسٹریچر پہ بے سندھ پڑی تھی۔
”کا کا کے ساتھ کون کر سکتا ہے یہ؟“ اشعر کا سردنوں ہاتھوں میں گرنا تھا۔

”ایک ہی نام ذہن میں آتا ہے۔“ دولت نے حتمی لہجے میں کہا تھا۔ ”ملازم کا کہنا ہے کہ سز عصرہ نے نرج ایک چاکلیٹ ٹیک کھایا تھا۔ کیا آپ کو معلوم ہے وہ کس نے بھیجا تھا؟“

اشعر نے چونک کر سر اٹھایا۔ ”کیک؟ وہ تو شاید تالیہ بھیجی تھی۔“

”بالکل۔ اور سز عصرہ کو کیک تھا کہ وہ وائ فاتح کو مارنا چاہتی ہے۔ مگر وہ غلط تھیں۔ تالیہ کا پلان وہ غلط تھا۔“

عصرہ کا پلان وہ نہیں تھا جو وہ سمجھتی تھی۔
”میرا خیال ہے کیک زہر لیے تھے۔“ دولت انکشاف کر رہا تھا۔

(وہ غلط تھا۔ کیک زہر لیے نہیں تھے۔ زہر نکلس کے اندر نہیں تھا۔)

”مگر وہ کیک تو میں نے بھی کھائے تھے۔ مجھے تو کچھ نہیں ہوا۔“ فاتح کی درشت آواز سنائی دی تھی۔
”ہیں آپ کا بھی چیک اپ کروانا پڑا گا۔ ہو سکتا ہے آپ کو ابھی تک زہر نے اس طرح سے متاثر نہ کیا ہو مگر مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کے خون سے بھی ضرور ملے گا۔“

ہاں... زہر اس کے خون سے بھی ملے گا مگر بہت تھوڑا... کیونکہ عصرہ کو وائ فاتح کی جان نہیں ملنی تھی۔
اس ایک لمحے میں تالیہ مراد کو پلان سمجھ میں آ گیا تھا۔

کیک زہر لیے نہیں تھے۔ وہ زہر روزمرہ کی چیزوں میں لپکا سا فاتح کو اور زیادہ سا خود کو دے رہی تھی۔ صرف آخری کیک شدید زہر لپکا تھا جو وہ فاتح کے گھر آنے سے پہلے کھا چکی تھی۔ اس کے بچوں نے بھی کیک نہیں چھتے تھے، اس لیے ان کے خون سے زہر نہیں ملے گا۔ وہ اپنے بچوں کو کیک نہیں کھتے دیتی تھی۔ اس لیے نہیں کہ نکلس میں زہر تھا۔ وہ زہر ملی چیزوں سامنے بھی نہیں رکھے گی۔ بلکہ اس لیے کہ جب بچوں کے خون سے آرسینک کے اثرات نہ نپلیں تو اس کی وجہ سب کو یہی لگے کہ بچوں نے کیک نہیں کھائے تھے۔
عصرہ محمود کو وہ جان لیتا تھی جو اس کو سب سے

زیادہ محبوب تھی۔

عصرہ محمود کی اپنی جان۔

دولت اب سیٹ بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔
”سز عصرہ نے آخری گفتگو میں تالیہ مراد پہ کیک کا اظہار کیا تھا۔ ان کا یہ بیان قانوناً ثبوت کے طور پہ استعمال کیا جائے گا۔ میں تالیہ مراد کے اریٹ وارنٹ نکھار رہا ہوں مگر مجھے امید ہے کہ وہ ہمیں اپنے گھر نہیں ملے گی۔ آج سے وہ ایک fugitive ہے۔“

وہ اپنی ٹیم کو ہدایت دے رہا تھا اور وہ سن سی او پر کھڑی تھی۔

اور بھی فاتح کی نظر اوپر اٹھی۔ وہ اس کا گھر تھا۔ کسی کی موجودگی کا احساس اسے سب سے پہلے ہوا تھا۔ اس نے گردن ہلائے بغیر اوپر دیکھا جہاں وہ کسی سامنے کی طرح کھڑی تھی۔
ایک لمحے کو ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

تالیہ نے بے یقینی سے نفی میں سر ہلایا۔ وہ اپنی بے گناہی کی گواہی اور کس طرح دے؟
اور فاتح..... اس نے ایک نظر فحش کو دیکھتے دولت کو دیکھا اور دوسری اوپر تالیہ پہ ڈالی۔ پھر آنکھوں سے ایک خفی سا اشارہ کیا۔

جیسے کہہ رہا ہو۔ ”بھاگ جاؤ۔ تالیہ۔ بھاگ جاؤ۔“

اس کے قدم پیچھے کو اٹھنے لگے۔
لہاس سے بارش کے قطرے فرش پہ گرے۔
گلے سیاہ ربو کے جوتوں سے چھیں چھیں کی آواز آنے لگی۔

تالیہ نے گردن جھکا کے اپنے جوتوں کو دیکھا۔ تختے پہ لگے کمان صورت زخم پہ کھر ٹھہرن چکا تھا۔

چھیں چھیں کی آواز پہ چونک کے دولت نے سز اٹھایا اور اوپر دیکھا۔

”اوپر کون ہے؟“ ایک ساتھ سب کی گردنیں

اونچی ہوئیں۔

وہ کو ناب خالی تھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔

”دولت... مجھے عصرہ سے ہوئے والی آخری گفتگو کے بارے میں بتاؤ۔“ وان فارح نے اسے جی سے مخاطب کیا تو دولت کا دھیان اوپر سے ہٹا۔ وہ اب فارح کو دیکھتے ہوئے سارا قصہ دہرانے لگا تھا۔

”دوپہر میں مجھے عصرہ کی کال آئی تھی۔ انہوں نے مجھے بلایا تھا۔ اور جب میں آیا تو۔“

باہر اندھیری رات میں سیاہیلی کسی چھلاوے کی طرح ایک چھت سے دوسری چھت بھلا ٹنگ رہی تھی۔

اس کے آگے صرف تاریکی تھی اور نیچے گہری کھائی۔

☆☆☆

”ساکورا ہانائی“

”The Viewing of Cherry Blossom Season“

اس نے دیکھا۔

وہ گھاس پہ نصب بیچ پیٹھا ہے۔

سڑک کنارے دور تک چیری بلازم کے

درختوں کی قطار ہے۔

اور وہ گلابی نرم پھولوں سے لدے ہیں۔

نیچے گھاس پہ کچی گلابی پتھریوں کی تہہ بھی

ہے۔

سامنے ایک جاپانی بچہ باپ کی انگلی پکڑے

ہل رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں کاشن کینڈی ہے

جس کی انک کو وہ ہمارا ہے۔ اس کے جوکرز سے

چلتے وقت ہنگامہ دے چھٹکنے کی آواز آتی ہے۔

وہ اس کے ساتھ بیچ پٹھا کے کھٹکتی ہے تو وہ چونکتا

ہے۔

بیچ پٹھا کی کافی اٹھانے لگتا ہے جو چمک جاتی

ہے۔ گرم مائع گھاس پہ کرے ایک پھول کو داغ دار

کر دیتا ہے۔

اسی پہل بیچ کے پیچھے کھڑا چیری بلازم کا درخت

ہوا کے جھونکے کے ساتھ ڈھیروں پھول ان دلوں پر گرا دیتا ہے۔

کچھ پھول اس کے کوٹ پہ گرتے ہیں اور ہم

عصرہ کے بالوں پہ۔۔۔

☆☆☆

عصرہ جنت محمودی موت سے دور دوڑ گئی۔

بی این کے چیئر مین آفس کی کھڑکیوں کے

پلائنڈز زبٹے ہوئے تھے اور اندر سرما کی کھوپڑی

تھی۔ کنٹرول چیئر پہ وان فارح آگے کو ہوئے بیٹھا

ایک فائل کے صفحے پلٹ رہا تھا۔ آنکھوں پہ چشمہ

لگائے۔ وہ جیل سے بال دائیں طرف جمائے سر

سوٹ میں ملبوس کام میں مصروف نظر آتا تھا جب

دروازہ دستک کے بعد کھلا۔ فارح نے عینک کے اوپر

سے صرف نگاہ اٹھا کے دیکھا۔

اس کی سیکرٹری ایک فولڈر اٹھائے اندر آئی

تھی۔

”سر۔۔۔ میں آپ کو ڈسٹرینس کرنا چاہتی

تھی مگر آپ نے نمبر بدل لیا ہے تو آپ کے دوست

ڈاکٹر۔۔۔ (فولڈر سے نام پڑھا) ڈاکٹر دین بھال کی

مجھے کئی دفعہ کال آئی ہے۔ ان کو آپ کا نیا نمبر دے

دوں؟“

”ہاں دے دو۔ بلکہ اسے کال بیک کر کے

مجھے ملا دو۔“ میز پر رکھے فون کی طرف اشارہ کیا۔ وہ

سر ہلا کے مڑی تو فارح بولا۔

”تالیہ کی کال تو نہیں آئی؟“

”تالیہ مراد؟ نہیں سر۔“

”اگر آئے تو اس کو میرا نیا نمبر دے دینا۔“

تاکید کی تو وہ سر کو اشارات میں غم دے کر مڑ گئی۔

فون کی کھٹتی جی تو فارح نے عینک اتاری اور

ریسیور کان سے لگایا۔

”میں تمہیں کال کرنے کا سوچ ہی رہا تھا۔ تم

نے مجھ سے میڈیکل سائنس کے تجربے کا وعدہ کیا

تھا۔“ وہ اب کرسی پہ بیٹھ کر ہو کر بیٹھا مسکرا کے کہہ رہا

تھا۔

”اور میں اپنے وعدے اور دعوے پہ قائم ہوں۔ میں نے تمام پروسیجر کی تیاری کر لی ہے۔ تمہارے ہرے سکیل کا انتظار ہے۔“

”تم کہہ رہے ہو کہ میری اس ایک رات کی

باداشت واپس آسکتی ہے؟“ وہ گہری سانس خارج

کر کے مسکرایا۔

”ہاں البتہ۔۔۔۔۔۔“ وہ ہچکچایا۔ ”یہ عمل خطرناک

ہی ہو سکتا ہے اور۔۔۔۔۔۔“

”بے فکر ہو۔ میں ہر طرح کا consent

فارم سائن کر دوں گا۔“

وہ جانتا تھا کہ ہر ڈاکٹر کی طرح اس کا سب

سے بڑا غصہ شیخی ہو سکتا تھا۔

”میرے لیے وہ رات بہت اہم ہے اور اس کو

واپس لانے کے لیے میں کچھ بھی کرنے کو تیار

ہوں۔“

”فارح!“ ڈاکٹر دین نے گہری سانس لی۔

”اس عمل کو صرف اچھے سکون اور ذہنی نشی کے لیے

کرو۔ اس کو ایک محبت کا شکار مرد کی طرح نہ کرو۔ اگر

وہ لڑکی تمہاری زندگی سے چلی گئی ہے اور تمہیں کال

تک نہیں کر رہی تو وہ اس رات کو یاد کرنے سے نہیں

واپس نہیں بل جائے گی۔“

فارح کو اس کی بات اچھی نہیں لگی تھی۔ اس نے

کچھ کہے بغیر فون کھدایا۔ پھر وہ دوبارہ فائل نہ اٹھا

سکا۔ بلکہ کافی منگوائی اور کرسی کا رخ کھڑکی کی طرف

موڑ لیا اور باہر پیرسلی سرما کی دھوپ دیکھنے لگا۔

”سر۔۔۔ ڈاکٹر دین نے آج سہ پہر کا وقت

فائل کیا ہے۔ ٹھیک ہے؟“ سیکرٹری کارسن کی آواز

عقب میں سنائی دی۔

”ہاں دے دو۔“ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھے

چیئر مین نے باہر جھانکتے ہوئے ناک سے بھی

اڑائی۔ اس کے ماتھے پہ بل سے پڑ گئے تھے۔

”کچھ اور جو میں کر سکوں سر؟“ اس کو الجھن

میں دیکھ کے کارسن نے بے چہما۔ وہ گول چہرے اور

سفید رنگت والی چینی لڑکی جی ہو گلابی پاپ اسٹک کے

ساتھ گلابی اور سفید رنگ کا اسکرٹ بلاؤز پہنے ہوئے تھی۔

”محبت کا شکار آدمی کیسا ہوتا ہے؟“ رک کے

اضافہ کیا۔ ”تمہارے نزدیک۔“

”محبت“ محبت میں فرق ہوتا ہے۔ سر۔ اس کو

اکثر لوگ سمجھ ہی نہیں پاتے۔“

اس کی بات پہ وہ ہلکا سا مسکرایا اور کرسی کا رخ

اس کی طرف موڑا۔ جیسے استاد کو کسی شاگرد کی

اے قند سے اونچی بات نے محظوظ کیا ہو۔ ”مجھے نہیں

معلوم تھا کہ تم اتنی آڑٹھک ہو۔ تم بی این میں کیا کر

رہی ہو؟“

کارسن نے افسوس سے گہری سانس خارج

کی۔ ”یہی تو مسئلہ ہے۔ سر۔ آپ لوگ سمجھتے ہیں کہ

سیاسی عہدوں پہ بیٹھنے والے محبت کا شکار نہیں ہو سکتے

کیونکہ آپ کی نظر میں یہ جذبہ انسان کو کمزور بناتا

ہے۔“

”کیا یہ درست نہیں ہے؟“ اس نے شانے

اچکائے۔ ”جب تم میری عمر اور میرے تجربے کو بچپن

کی تو جواوگی کہ اس مقام پہ انسان کو کسی سے محبت

نہیں ہو سکتی۔“ وہ سادگی سے کارسن کی آنکھوں کو

دیکھ کے کہہ رہا تھا۔

”اس مقام کیا ہو سکتا ہے پھر؟“

فارح نے ہلکے سے شانے اچکائے۔ ”کوئی

آپ کے لیے اہم بن سکتا ہے۔ اس کی حفاظت اور

خوشی اہم بن سکتی ہے۔ اس کی فکر کرنا ترجیح ہوتا ہے۔

ایک اچھی دوستی۔ بس۔ اس سے زیادہ نہیں۔“

”سرا“ وہ مکمل دل سے مسکرائی۔ ”تو محبت

اس کے علاوہ ہوتی ہی کیا ہے؟“

وہ چند لمحے کچھ بول نہ سکا۔ اسے اس جواب کی

توقع نہیں تھی۔

”میرے نزدیک محبت کا شکار آدمی وہ ہوتا ہے

کارسن! جو اندھا دھند کسی کے پیچھے بھاگ رہا ہو۔

بے چین ہو۔ بانی ساری دنیا سے غافل۔ صرف ایک

انسان کا حصول اس کا مقصد ہو۔“

”وہ جنوں ہوتا ہے سر۔ اور جنوں کا شکار لوگ محبوب کے حصول کے لیے ہر حد پار کر لینے کو مجتہد سمجھتے ہیں۔“

”اور محبت کیا یہی نہیں ہوتی؟“

”نہیں سر۔ محبت ایسی نہیں ہوتی۔ وہ تو انسان کو بدل دیتی ہے۔ اسے نرم بناتی ہے۔ اسے دوسرے انسانوں کی قدر کرنا سکھاتی ہے۔ انسان کو اچانک دنیا کی ہر شے میں خوبصورتی دکھائی دینے لگتی ہے۔ پھولوں کے رنگوں میں۔ بادلوں کی زری میں۔ تب احساس ہوتا ہے کہ خدا نے سب کچھ کتنی محبت سے بنایا ہے۔“

”اور؟“ وہ دلچسپی سے چینی لڑکی کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ وہ سامنے کھڑی مسکرا کے بتا رہی تھی۔ ”اور وہ محبت میں گرفتار دوسرے انسانوں کو پہچاننے لگتا ہے، ان کے لیے خوش ہوتا ہے۔ وہ ہر حد پار کرنا سکھ جاتا ہے لیکن کسی کو پانے کے لیے نہیں بلکہ دوسرے کو آرام دینے کے لیے اس کو خوش اور محفوظ رکھنے کے لیے۔ محبت خود غرض نہیں ہوتی۔ آئینیشن خود غرض ہوتا ہے۔ جنونی کو اپنے محبوب کی توجہ چاہیے ہوتی ہے۔ ہر وقت۔ محبت تو کبیر تک ہوتی ہے۔ صرف دوسرے کی فکر کرنے والی۔ دوسرے کے لیے زندگی کو آسان بنانے والی۔“

والن فاتح نے مسکرا کے اسے دیکھتے ہوئے کافی کا کپ اٹھایا۔ ”مگر!۔۔۔ یو آر آن لو!“ اس نے جیسے فیصلہ سنایا تھا۔ کارمن نے مسکرا کے ٹپے اٹھائی۔ ”میں نے کہا تھا صرف محبت میں گرفتار شخص ہی کسی دوسرے محبت کرنے والے کو پہچان سکتا ہے۔“ اور واپس مڑتی۔ فاتح کی مسکراہٹ مدھم پڑی۔ ایک دم ساری فضا اداس ہو گئی تھی۔ اس نے فون اٹھایا اور کارمن سے کہا کہ وہ ڈاکٹر دین کا نمبر ملائے۔

”وہ؟“ رابطہ ملنے پہ وہ قدرے سہاٹ انداز میں کہنے لگا۔ ”آئی ایم سوری مگر میں کسی سائنسی

تجربے کا شکار نہیں ہونا چاہتا۔“

”مگر۔۔۔ تم نے کہا تھا کہ تم اس رات کو یاد کرنا چاہتے ہو۔“

”اس سے کچھ نہیں بدلے گا۔ شاید جینا مزید خراب ہو جائیں۔ اس رات کو بھول جانے میں ہی عافیت ہے۔“

اس رات عرصے بعد اس نے عجیب سا خواب دیکھا۔

وہ پولیس اسٹیشن سے نکلتا ہے۔۔۔۔۔ اس نے گردن میں کوئی بیماری لاکٹ پہن رکھا ہے۔ اس سے ایک سنہری پنکھ نکل کے اس کو راستہ دکھاتا اڑتا رہا ہے۔ وہ اس کے تعاقب میں قدم اٹھا رہا ہے۔ منظر دھندلا ہے مگر ایک چیز واضح ہے۔۔۔۔۔ اس نے ایک سنسان گلی کا موڑ مڑا ہے۔ یہ گلی جلال مسجد کے دائیں جانب ہے۔۔۔۔۔ نیلی اینٹوں کی دیواریں۔ باہر ایک ٹوٹا ہوا گھلا۔۔۔۔۔ وہ ایک گھر کے دروازے تک جاتا ہے۔۔۔۔۔ وہاں سنہری پنکھ ڈور میٹ پر گر جاتا ہے۔۔۔۔۔ وہ نظریں اٹھا کے گھر کا ممبر دیکھتا ہے۔ دھندلی بصارت کے باوجود اسے آدھا نمبر نظر آتا ہے۔۔۔۔۔

وہ چونک کے اٹھا تھا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ اس نے ہاتھ مار کے سائڈ لیپ چلایا تو مدھم سی روشنی پھیل گئی۔ عصرہ کھولنے کے سوراخی تھی۔ فاتح اٹھ بیٹھا اور اپنی پیشانی چھوٹی داسے پسند آ رہا تھا۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ یہ پہلی دفعہ تھا کہ اس رات کی کوئی ایسی یادداشت اس کے ذہن سے نکل رہی تھی جس کا حقیقت سے تعلق لگتا تھا۔ باقی سب تو عجیب سے خواب تھے۔ جنگل میں تالیہ کے ساتھ۔۔۔۔۔ جسی قید خانے میں زخمی حالت میں موجود ہونا۔۔۔۔۔ مگر یہ۔۔۔۔۔ یہ جگہ یہ گلی وہ پہچانتا تھا۔ اگر دان فاتح اس رات کہیں گیا تھا تو وہ یہ گھر تھا۔

کبھی معمول کی طرح وہ اٹھا اور بتی جلائی۔ جب تک عصرہ کی آنکھ کھلی، وہ تیار کھڑا بیک میں کپڑے ڈال رہا تھا۔ وہ ہڑ بڑا کے اٹھ بیٹھی۔

”تم اس وقت کہاں جا رہے ہو؟“

”ملاک۔“ وہ سر جھکائے اب والٹ میں اپنے کریڈٹ کارڈز دیکھ رہا تھا۔ عصرہ نے تعجب سے اسے دیکھا۔

”ایک دم وہاں جانے کی کیا ضرورت پڑ گئی؟“

”ضروری کام ہے۔“

وہ تھکا ہوا بھی لگتا تھا جسے کبھی نیند سے جاگا۔ بار بار گردن کو دائیں بائیں گھما رہا تھا۔ عصرہ اٹھ بیٹھی اور چوتھی نظروں سے اسے دیکھا۔

”وہاں تالیہ ہے کیا؟“

فاتح کے بیک کی زپ چڑھاتے ہاتھ رکے۔ پھر اٹھا کے اسے دیکھا۔

”اگر ہے بھی تو؟“ اسے جیسے یہ بات ناگوار لگ رہی تھی۔

”تم کب تک اس کے پیچھے بھاگتے رہو گے؟“

فاتح سیدھا کھڑا ہوا اور گہری سانس لی۔ جیسے غصہ آیا ہو مگر ضبط کر گیا ہو۔

”عصرہ۔۔۔۔۔ میری زندگی تالیہ کے گرد نہیں گھومتی۔ میں اس سے ہٹ کے اپنے کام کے لیے بھی نہیں چاسکتا ہوں۔“

”اپنے دل سے پوچھو۔ اس کام کا تعلق بھی کہیں نہ کہیں تالیہ سے جڑا ہوگا۔“ اس کی فاتح پہنچی آنکھوں میں گھائی نمی تیرنے لگی۔ ”میں کیا ہو گیا ہے فاتح؟ ہمارے گھر کو کسی نظر لگ گئی ہے؟“

وہ چند لمحے وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا، پھر کندھے ذرا سے اچکائے۔

”ہم ویسے ہی ہیں جیسے اتنے سالوں سے تھے۔ کیا بدلا ہے؟“

”ہاں اور اتنے سالوں سے ہم ایک مردہ زندگی ہی گزار رہے ہیں۔“

”میں جاؤں؟“ وہ ذہنی طور پر کہیں اور الجھا تھا۔ بیک اٹھا لے بولا تو وہ بستر سے اتری اور ایک دم

اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

”مجھے معلوم ہے تم اسے ڈھونڈنے جا رہے ہو۔ تم کب تک اس کے پیچھے جاتے رہو گے فاتح؟“

”میں اپنے کام سے جا رہا ہوں عصرہ۔ اب کے اس نے محل سے کہا تھا۔ مگر عصرہ کی اس پہنچی آنکھیں میلی ہو رہی تھیں۔

”کیا نہیں ہے تمہارے پاس؟ ہوتی ہے۔“

اور بہت جلد حکومت بھی۔۔۔۔۔ تم اس سب کو اس عورت کے لیے داؤ پے لگا سکتے ہو؟“

”میں نے ایسا کیا کیا ہے جو مجھے یہ سب کھونا پڑے گا؟“ اس نے ماتھے کو چھوا۔

”تم آدمی رات کو اس کے پیچھے اچانک سے سب چھوڑ کے جانے لگو گے تو میں خوفزدہ ہوں گی“

فاتح۔۔۔۔۔

دان فاتح نے گہری سانس بھری اور افسوس سے اسے دیکھا۔ ”میں نے اپنی یہ زندگی (اطراف میں نگاہ دوڑائی) برسوں کی محنت سے بنائی ہے۔ میں اس زندگی کو نہ تالیہ کے لیے چھوڑوں گا اور نہ ہی تمہارے لیے۔“ جتنی سے کہا اور بعد سے اسے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ مگر وہ نہیں بٹئی۔ خدیٰ میلی آنکھوں سے اسے دیکھ گئی۔

”مت جاؤ۔ آج مت جاؤ۔ پلیز۔“ آنسو ٹوٹ ٹوٹ کے گرنے لگے۔ ”میرے لیے آج یہ سارے کام ترک کر دو!“

”ہم ایک دوسرے کے لیے ایسی قربانیاں کب سے دیتے ہیں عصرہ؟“ وہ زخمی انداز میں بولا تو عصرہ کے ماتھے پہ پل پڑے۔ گال سرخ دجکتے لگے۔

”میں نے تمہارے لیے قربانیاں دی ہیں۔ اپنا کیریئر چھوڑا ہے۔ تمہارے بچوں کو پالا ہے۔ تمہاری بہن کو پالا ہے۔ میں نے تمہارے لیے کیا نہیں کیا؟“

”اور کیا میں نے تمہیں پارٹی کی نائب چیئر مین کا عہدہ نہیں دیا؟ گھر نہیں دیا۔ عزت نہیں

دی؟“

”تم نے مجھے محبت نہیں دی۔“ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی تو فارح نے گہری سانس لی۔
”وہ تو میں نے خود کو بھی عرصہ ہوا نہیں دی۔“ وہ ایک طرف سے نکلا اور آگے بڑھ گیا۔ عرصہ نے بھی انکھوں سے پلٹ کے اسے دیکھا۔
”اسے تو دی ہے۔ ہندی ہوئی تو روز تمہارے لیے وہ تحفے نہ بھیجتی۔“

”وہ کب تالیہ نہیں بھیجتی۔“ وہ عام سے لہجے میں کہتا لاؤنج کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ عرصہ نمود کا سانس اور آنسو ایک ساتھ رکے۔ وہ چونک کے پلٹی۔

”تمہیں کیسے معلوم؟“

وہ دروازے تک پہنچ کر رکا اور مڑ کے زشی نظروں سے اسے دیکھا۔ ”وہ مجھ سے بات نہیں کر رہی... میری میلر کا جواب نہیں دے رہی... تو وہ مجھے ایسے کیس کیوں بھیجے گی جب کہ اسے معلوم ہے کہ مجھے اتنا بیٹھا نہیں پسند؟“
سادگی سے بتا کہ وہ مڑ گیا۔ اس کے گھر روز فیز اور دوستوں کی طرف سے تحائف آتے تھے۔ زیادہ تر مفاد پرست عزیز واقارب کی طرف سے ہوتے تھے۔ اس کو پرواہ نہیں تھی کہ کوئی تالیہ کے نام سے یک کیوں بھیجتا ہے۔ اسے صرف ایک پھیلی کوئل کرتا تھا۔

اس رات وہ کس کے گھر گیا تھا؟

دروازہ بند ہونے کی آواز پر عرصہ نے آنسو ہٹانے کی کوشش کی۔ اس کی رنگت سفید پڑنے لگی تھی۔
وہ چند دن قبل تالیہ کے منہ سے یہ اعتراض سن کے کہ وہ فارح کی پہلی بیوی ہے، اپنا سب کچھ کوچلی گئی اور اسے لگا تھا کہ یہ سب آسان ہوگا جو وہ کرنے جا رہی ہے اور ایسا کرتے ہوئے اسے دکھ نہیں ہوگا۔ مگر وہ ہر روز فارح کو تنے سرے سے کھو دیتی تھی۔

وہ جو بھی کر لے وہ اس کے ہاتھ سے ہاتھ لے کر تھا۔ بلکہ اب تو سارا کھیل اس کے ہاتھ سے تھا۔
وہ وہیں دیوار کے ساتھ بیٹھتی پلٹی گئی اور سر گھٹنوں پر گر لیا۔ اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ شاید اسے یہ نہیں کرنا چاہیے۔ شاید اسے کچھ اور چاہیے۔ مگر اب شاید دیر ہو چکی تھی۔

☆☆☆

ملا کہ وہ یہاں تھا جیسوہ چھوڑ کے گیا تھا۔ وہ سمندر کی وجہ سے فضا کا تم ہوتا... وہی چائے خانوں کی خوشبو... وہی بازاروں کا شور... وہ تھا گاڑی چلاتے ہوئے یہاں آیا تھا۔ سیدھا اپنے گھر نہیں گیا۔ اس کا رخ اس مسجد کی طرف تھا جو اس نے اس خواب میں دیکھی تھی۔

آگے کا راستہ آسان تھا۔ وہ ان گلیوں سے شناسا تھا۔ اس شہر میں اس کا بچپن گزارا تھا۔ یہاں قریب ایک دکان بھی جہاں وہ بہت آیا کرتا تھا۔ کار ایک جگہ روک کے فارح کے ہاتھ پر لکھا تھا نام دونوں سے مختلف نظر آتا تھا۔ سیاہ پیٹ پر سیاہ جیکٹ پہنے اس کے بال ماتھے پر پھیرے تھے اور پٹیل نظر میں اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔
اندھیری سڑک کو پلٹ کر روشنی نے منور کر رکھا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ وہ آگے قدم اٹھانے لگا۔

بہت عرصے بعد وہ اپنی سیڑھی کے بغیر یوں باہر نکلا تھا۔ ملا کہ میں تجھے کے اندر سے کلپ نکالنے والے دنوں کے بعد وہ یہاں نہیں آیا تھا۔ کے اہل کے شور ہنگامے سے دور یہ پرسکون شہر اس کے دل کو عجیب طرح سے کھینچتا تھا۔ جانے کیا تھا جو اس شہر میں کھویا تھا۔ کیا تھا جس کا گواہ سمندر کا پانی تھا اور آسان تھا، یہ راستے تھے... مگر صرف وہی نہیں جانتا تھا...
مطلوبہ دروازے پر وہ رکا اور ڈور میٹ کو دیکھا۔ آج وہاں کوئی سنہری کچھ نہیں تھا۔ باقی سب وہی تھا۔ آدھی رات کو وہ کسی کے گھر دستک کیسے

نہی کر کے انتظار کرے؟ وہ سوچ ہی رہا تھا جب دروازہ کھل گیا۔ فارح نے تعجب سے ابرو اٹھائے۔ چونک میں ایک لمبی فیس اور کرگ پینے کمر پر اٹھانے، چمکتی آنکھوں والا آدمی کھڑا تھا۔ وہ اس کے انتظار میں تھا۔
”خوش آمدید! وان فارح۔ آج آپ کو کیا چیز کے دروازے پر دوبارہ کھینچ لائی؟“ وہ مسکرا کے پھر رہا تھا۔

”دوبارہ؟“ وان فارح کے دل میں کچھ ڈوب کے ابھرا۔ اس کو اس گمشدہ رات کا پہلا اشارہ ملتا تھا۔ وہ واقعی اس گھر میں آیا تھا۔
”میں اندر آ سکتا ہوں کیا؟“ توری چڑھائے پاٹ سے انداز میں پوچھا تو چادروں کے راستہ دے دیا۔

اس گھر میں اگر تیری کی عجیب سی مہک تھی۔ کچھ جگہ موسم بنیاں روشن تھیں۔ جو ایک آدھ بلب جل رہے تھے وہ باہر سے مہلک کے بنے تھے۔
”میں ایک دفعہ پہلے بھی یہاں آیا تھا؟“
تھوڑی دیر بعد وہ دونوں فرش نشست پر آنے سنانے بیٹھے تھے اور درمیان میں لکڑی کی چوکی نما پتی میز تھی۔

”جی! وان فارح۔ آپ سولہ جولائی کی رات کو میرے پاس آئے تھے۔“ آدمی چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

فارح نے جواب میں پہلے ایک طائرانہ نظر دیوار کی طرف دوڑائی جہاں مختلف شیلٹ بنے تھے اور ان میں بوٹیں رکھی تھیں۔ پھر اس آدمی کو دیکھا۔
”کون ہو تم؟ اور تمہارے پاس میں کیوں آیا تھا؟“

”میں تالیہ کا ایک عزیز ہوں۔ اس کے بچپن کا دوست اور آپ مجھے اس کے لیے ایک پیغام دینے آئے تھے۔ آپ کو ڈرتا کہ صبح تک آپ یہ بات بھول جائیں گے۔“
”تم کہہ رہے ہو کہ میں نے تمہیں تالیہ کے

لیے کوئی پیغام دیا تھا؟“

آدمی نے سرانٹات میں ہلایا۔

”اور مجھے کیوں لگتا تھا کہ میں وہ بھول جاؤں گا؟“

آدمی نے لاعلمی سے کندھے اچکا دیے۔ ”میں نہیں جانتا۔“

چند لمحوں کے لیے پرسرا دیوان خانے میں خاموشی چھا گئی۔ موسم بقیل قطرہ قطرہ پھلتی رہیں۔ اگر بقیل ملتی رہیں۔

”کیا پیغام دیا تھا میں نے؟“

جواب اس آدمی نے چوکی پر رکھا دستہ اٹھا کر پہلے صفیے پر قلم سے کچھ لکھا اور پھر صفیے پہاڑ کے اس کی طرف بڑھا دیا۔ فارح نے آنسو سے اسے دیکھا۔ اس پر چند ہندسے لکھے تھے۔

”ان ہندسوں کا کیا مطلب ہے؟“

”اگر آپ چاہتے ہیں اس پیغام کو سمجھ لوں تو کبھی اس کو ہندسوں کی صورت نہ لکھتے تھے۔“

وہ چند لمحوں کے لیے اس کا غد کو دیکھتا رہا۔

”دش اس؟“

”دش اس!“

”کیا تم نے اسے یہ پیغام دیا تھا؟“

”جی۔ میں نے امانت پہنچائی تھی۔“ اس آدمی کی چمکتی نظریں فارح کے اندر تک دیکھ رہی تھیں۔ اسے اس ماحول سے عجیب اکابر ہونے لگی تھی۔ وہ یہاں نہیں بیٹھنا چاہتا تھا مگر ایک سوال ابھی اسے مزید پوچھنا تھا۔

”اس رات کیا ہوا تھا؟“

”میں آپ کی اس سے زیادہ مدد نہیں کر سکتا۔“ وان فارح۔ ”وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ گویا اسے صاف انداز میں جانے کو کہہ رہا ہو۔ وہ باہر آیا تو کلی تاریک پڑی تھی۔ ارد گرد زخروں کی چمکتی والے گہرے اور سرخ نیلی اینٹوں والی دیوار پر تھیں۔

وہ اس چٹ کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔

”کیا آپ کو اس کی بات پہ یقین ہے؟“

آواز یہ وہ رکا۔ آہستہ سے گردن موڑی تو سفید فراک والی بچی اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ بہت دن بعد قافح محل کے مسکراتا تھا۔

”ہاں..... کیونکہ ایسا پیغام میں ہی لکھ سکتا ہوں۔ تمہیں یاد ہے؟“

وہ دونوں اس ٹھنڈی رات میں ساتھ ساتھ قدم اٹھانے لگے۔

”جی ڈیل۔ یہ شفٹ سائفر ہے جس میں میں آپ کو پیغام لکھا کرتی تھی اور آپ کے کمرے میں چھپا دیتی تھی۔“

اتنے عرصے بعد اسے ایسی سکون آور تنہائی ملی تھی۔ وہ مسک کر کنارے ایک چوکی پہ بیٹھا اور سواپل نکالا۔ اسکرین آن کی تو بلیں روٹنی تھیں اس کا چہرہ منور کر دیا۔ وہ اب ایک ایک ہندسے کے مطابق حروف چھپی موبائل میں لکھ رہا تھا۔ پورا فخر مل ہوا تو اس نے ہر لفظ کو پہلے ایک ہندسہ پیچھے شفٹ کر کے دیکھا۔ وہ میہر ہاں نے ایک حرف آگے شفٹ کیا تو یک دم پورا فخر تریب سے بٹا گیا۔

”اس کا قاتل اس کی پندہ گیری میں ہے۔“

وہ اجنبی سے اس کاغذ کو دیکھ رہا تھا۔ کسی لڑکی کی بات ہو رہی تھی۔ وہ تالیہ کو کسی کے قاتل کے بارے میں بتا رہا تھا۔

”یہ کس کے بارے میں ہو سکتا ہے؟“ ساتھ بیٹھی آریانہ نے کندھے اچکاے اور چہرہ ہتھیلیوں کے پیالے میں گر دیا۔

”کس کو فیری میلو پندہ تھیں ڈیل؟“

”کیا مجھے اس رات کسی کے قاتل کے بارے میں علم ہوا تھا اور میں تالیہ کو کچھ بتانا چاہتا تھا؟ اتنے مہینے تک تالیہ اس کے لیے کام کرتی رہی اور اس نے ایک دفعہ بھی اس کو پیغام کا ذکر نہیں کیا۔ کیوں؟“

اس کا ذہن ملا کہ جواب تلاش کرنے آیا تھا۔ یہاں آگے وہ مزید الجھ گیا تھا۔

سفید میز بیٹروالی لڑکی ابھی تک اسے دیکھ رہی

تھی۔ ”کس کو فیری میلو پندہ تھیں ڈیل؟“

☆☆☆

وہ جٹ اگلی صبح کے ایل میں اپنے آفس میں بیٹھے قافح کی جیب میں مڑی تری حالت میں رہی تھی۔ وہ ایک کے بعد ایک میٹنگ اینڈ کرتا اور میٹنگ کے درمیان وقفے میں اس جٹ کو نکال کے پڑھتا پھر واپس رکھ دیتا۔ کس کا قاتل؟ کون سی فیری تھی؟

جواب ایک ہی تھا جو بار بار وہ رد کر دیتا تھا۔ آریانہ کو فیری میلو پندہ تھیں اور وہ خود کو اسنو واٹ سے فہم دیا کرتی تھی۔ ایک دفعہ اس نے کہا تھا۔ اس کی زندگی کے سارے کردار اسنو واٹ جیسے ہیں۔ وہ بادشاہ کی بیٹی ہے اور اس کی ایک سو تیلی ماں بھی ہے۔ ملکہ۔

”مگر تمہاری ماں ایل کو نہیں جیسی تھوڑی ہے؟“ وہ دونوں صوفے پہ بیٹھے باتیں کر رہے تھے جب عصر مسکرا کے کہنے ان کی بے ساختگی کے چبھی۔ آریانہ جھکی پڑ گئی۔

”ظاہر ہے نہیں۔“ اسے تب لگا تھا کہ وہ شرمندہ ہوئی ہے۔ اس نے نظر انداز کرنا چاہا۔

کارمن کافی دیر آئی تو اس نے اسے پکارا۔ ”تم نے اسنو واٹ پر بھی بے کارمن؟“ وہ سادہ سی لڑکی مسکرائی۔ ”کس نے نہیں پڑھ رکھی؟“

”اس میں اسنو کو کس نے مارا تھا؟“ اسے لگا وہ کچھ بھول رہا ہے۔

”اس کی سو تیلی ماں نے..... بادشاہ کی بیوی..... ملکہ بد نے.....“ وہ رکی اور بولی۔ ”مگر ملکہ اس کو مارنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ اس نے جنگل میں اس کے لیے ڈکاری کو بھیجا تھا مگر.....“

”ہاں ٹھیک ہے۔ جاؤ۔“ وہ ہاتھ جھلا کے بولا اور ٹائی کی ناٹ ڈھکی کی۔ وہ ایک دم پریشان نظر آنے لگا تھا۔

پہلی عجب صورت اختیار کر گئی تھی۔ وہ اسے مل نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ابھی صبح دوپہر میں نہیں بدلی تھی جب عصر کا فون آنے لگا۔ ایک ڈیلیکٹ ابھی آفس سے اٹھ کے گیا تھا۔ قافح کے پاس پانچ منٹ تھے۔ اس نے کمرہ کی سانس لے کر فون کان سے لگایا۔

”کہو عصر۔“

”تم رات گھر نہیں آئے۔“

”میں ملاک میں رک گیا تھا۔ صبح فجر کے بعد واپس نکلا اور سیدھا آفس آ گیا۔“

”کل ہم نے جس نوٹ پہ بات ختم کی، تمہارے پاس اس کا اثر زائل کرنے کو دو منٹ بھی نہیں تھے؟“

وہ کمرہ آنے کا شہوہ کر رہی تھی۔

”عصر میں جھگڑے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ میری آج بیک نوٹ بہت سی میٹنگ ہیں شام میں سیمینار ہے اور.....“

”کیا تم اس سے ملے؟“ اس کا لہجہ بھیگا ہوا تھا۔

”کس سے؟“ وہ اتھان بن گیا۔

”وہی جس کے تعاقب میں تم ملاک گئے تھے۔“

”نہیں۔ میں اس سے نہیں ملا۔“ اس نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ وقت کم تھا۔ اسے کانفرنس روم میں پہنچنا تھا۔

”قافح..... کیا میں یہ ڈیز رو کرتی تھی؟ تمہارا یہ سرور یہ تمہاری بے وفائی؟“

”میں نے بھی تم سے بے وفائی نہیں کی عصر..... تم خود ہی اپنے شک کے ہاتھوں ہمارا تعلق بر باد کر رہی ہو۔“ وہ کوٹ کا بٹن بند کرتے ہوئے اٹھا۔ فون کان اور کندھے کے درمیان تھا۔

”شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ تم شروع سے ہی ایسے تھے۔“ وہ ایک دم غصے میں تیز تیز بولنے لگی تھی۔ وہ اس وقت درست نہیں لگ رہی تھی۔ ”وان

قافح کو کبھی بھی عصر محمود سے محبت نہیں تھی۔ قافح کو صرف قافح سے محبت ہے۔“

”ٹھیک یو۔ میں میٹنگ میں جا رہا ہوں اس لیے.....“ وہ آفس سے باہر نکل آیا تھا۔

”پانچ نہیں آریانہ سے محبت تھی۔ وہ گئی تو تم نے صرف اپنے بچوں سے محبت کی یا پھر تالیہ سے۔ میں تو کہیں بھی نہیں تھی۔“ وہ اس پہ ایک دم چلانے لگی تھی۔ وہ اس کے انداز پہ اٹھانے کے بجائے پریشان ہو گیا تھا۔ شاید اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اسے ایک دم اپنی سر دہری پہ افسوس ہوا۔

”عصر ہم ٹھیک ہو؟ میں شام میں گھر آتا ہوں تو.....“

”کبھی میں سوچتی تھی کہ آریانہ نہ مرنے..... اس کو ہم اس روز جیٹر لفٹ پہ نہ لے کر جاتے..... نہ وہ نئی اور اس کا شوہر اس کو اتوا کرتے اور نہ وہ مرنے..... تو ہماری زندگی مختلف ہوتی۔ تم ابھی بھی میرے ہوتے مگر نہیں۔“ وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”تم تب بھی اسی طرح مجھ سے بے وفائی کر جاتے“ قافح نے جب بھی کسی تالیہ کو ڈھونڈ لیتے۔ ہمارا تعلق آریانہ کے جانے سے مردہ میں ہوا۔“

وہ وہیں کارڈ روم میں کھڑا رہ گیا۔ بالکل ساکت۔ پتھر کا بت۔

”قافح؟ کیا رہے ہو؟ یا کال کاٹ دی ہے؟“ قافح؟ ”وہ چلائی گئی۔“

”تمہیں کیسے معلوم وہ آدمی نئی کا شوہر تھا؟“

ساری دینا وہاں رک گئی تھی۔ اسی کارڈ روم میں۔ ایسا لگتا تھا کہ آتے جاتے لوگ اپنی جگہوں پہ ٹمک کے غصے بن گئے ہوں۔

اور دوسری طرف عصر کا سانس بھی ختم گیا تھا۔ ”کیا؟ کون؟“ اس کی آواز دہسی ہوئی۔ پھر اس نے دوبارہ سے غصہ کرنے کی کوشش کی۔ ”میں تم سے تالیہ کی بات کر رہی ہوں اور تم.....“

”نو۔ نو۔ کو بیک۔ کو بیک۔“ وہ تیزی سے بولا۔ ”تم نے کہا تھا کہ شوہر..... تمہیں کیسے معلوم وہ

اس کا شوہر تھا؟“

”میں.... جانتی نہیں۔“ وہ ہلکے رنگ رہ گئی۔ ”پولیس رپورٹ میں شاید... ظاہر ہے وہ اس کا شوہر ہوا ہے فریڈ کچھ ہوگا مگر...“

”پولیس رپورٹ میں اس آدمی کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ ان دونوں کی لاشیں میں نے دیکھی تھیں صرف۔ میں نے تو کسی کو نہیں بتایا تھا سوائے تمہارے اور میں نے تم سے پوچھا تھا کہ اس آدمی کا تعلق کیا ہو سکتا ہے؟ اور تم نے کہا تھا تم نہیں جانتیں۔“

”فاریخ... تم کیا کہہ رہے ہو؟ میں تو غصے میں مثال دیتے ہوئے کہہ رہی تھی کہ...“

”سانے کھڑا اس کا چیف آف اسٹاف اسے میٹنگ کے لیے بار بار تھا۔ وقت کم تھا۔“

اس کا ذہن جیسے الفاظ کے سمندر کے سمندر میں گھوم رہا تھا۔

”عصرہ... میں تم سے فاریخ ہو کے بات کرتا ہوں۔“ اس نے فون رکھ دیا۔

کارڈروم میں اس کے اٹھتے قدم ہماری تھے۔ بے حد ہماری۔ وہ دھیرے دھیرے چل رہا تھا۔ ساری دنیا اور گردشوں میں رواں دواں نظر آ رہی تھی۔ آوازیں ہماری ہو کے سنائی دے رہی تھیں۔ ایسے میں چند الفاظ ذہن میں گونج رہے تھے۔

”اس کا قاتل اس کی پسندیدہ فیری ٹیل میں ہے۔“

کافرنس روم کے دروازے پر وہ اسے کھڑی نظر آئی تھی۔ میسر بیٹھ بیٹھ اُداس لڑکی جس کے سفید فرائیڈ پہنائے ہوئے لگا تھا۔ اس کی کپٹی سے بھی خون بہہ رہا تھا اور وہ گلابی میزنگروں سے دروازے کے قریب آتے فاریخ کو دیکھ کر ہی گئی۔

”ذیڈ... آپ کو میری پسندیدہ فیری ٹیل کیسے بھول گئی؟ ہمیں الگ ہوئے کیا اتنے برس بیت گئے؟“

وہ سفید چہرے کے ساتھ اسے دیکھتا رہا۔ کھول رہا تھا۔ وہ باہر ہو گئی۔ وہ اندر آ گیا۔ مگر اس کا ذہن ابھی تک ماؤف سا تھا۔ جیسے اس میں بہاؤ شور برپا ہو۔

جیسے اس میں خوف کا سی خاموشی چھا چکی ہو۔ میٹنگ میں اشعر کچھ کہہ رہا تھا۔ اپنی جگہ اٹھ کے ہاتھ ہلا کے۔ فاریخ کو صرف اس کے لب لعل محسوس ہو رہے تھے۔ وہ گال تلے اٹکی بجائے اشعر کو دیکھ رہا تھا مگر نظریں اشعر کے پیچھے کھڑی آریانہ پر جمی تھیں۔

وہ کافرنس روم کے کونے میں کھڑی تھی۔ اس کے سینے پر لگے گھاسے خون اہل اہل کے باہر گر رہا تھا اور وہ پھٹکی آنکھوں سے فاریخ کو دیکھ رہی تھی۔

”کیا ہمیں پتہ چلے گا؟ اتنے برس بیت گئے تھے؟“

میٹنگ ختم ہوئی تو وہ ایک لفظ کے بنا اٹھا اور باہر چلا گیا۔ قدم اٹھا کھین رہا تھا۔ پتہ نہیں رہے تھے۔ کارڈروم میں لوگ ادھر ادھر جا رہے تھے۔ فاریخ نے چلتے چلتے جب سے وہی پرچی نکالی اور اس کی سلوٹیں سیدھی کیں۔

”اس کا قاتل اس کی پسندیدہ فیری ٹیل میں ہے۔“

کوئی اور ہوتا تو ایک لمحے میں سب واضح ہو جاتا مگر وہ فاریخ تھا اور سارے عصرہ ہی۔

ایک لمحے میں سب واضح نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے پرچی مروڑ کے جب میل رکھ دی۔

اسنووائٹ کے لیے جلاد اس کی سولٹی ماں نے بھیجا تھا مگر یہاں وہ اس بات کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ صرف ایک خیال ذہن کو مفلوج کر رہا تھا۔ عصرہ جتنی کے شوہر کے بارے میں کچھ جانتی تھی اور اس سے چھپا رہی تھی؟ اتنا عصرہ؟

وہ آفس میں واپس آیا تو کارسن نے چوکھٹ سے جھانکا۔ ”سر ابھی دس منٹ میں آپ نے پارلیمنٹ کے لیے نکلتا ہے اور...“

”آؤٹ!“ وہ کرسی کی طرف جاتے ہوئے دعاڑا تھا۔ کارسن گڑبڑا کے پیچھے ہوئی اور جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔

اس نے ٹائی ڈھیلی کی اور فون اٹھایا۔ وہ اس بات کو کلیر کے بغیر اگلا کام نہیں کر سکتا تھا۔

”تم آریانہ کی بیٹی کے بارے میں اور کیا جانتی ہو جو تم نے مجھے نہیں بتایا؟“ کال ملے ہی وہ روتی سے بولا تھا۔ ایک ہاتھ سے فون کان پر لگا رکھا تھا دوسرے سے ٹائی ڈھیلی کر رہا تھا۔

”میں کچھ نہیں جانتی۔“ عصرہ تسکین چکی تھی۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میرے منہ سے پتا نہیں کیا نکلا کہ...“

”جب اس آدمی کی کار ملی تھی تو میں نے اور پولیس نے سینکڑوں دفعہ تم سے پوچھا تھا، اس بیٹی کا کوئی مرد دوست دار یا دوست اس سے ملے آتا تھا؟ اور تم نے کہا تھا کہ تم نے جھان پھان کی اس بیٹی کو باہر کیا تھا۔ اس کا کوئی بوائے فرینڈ تک نہیں تھا۔ تم جانتی تھیں مجھے ایسی بیٹی نہیں پسند تھی جس کے یوں تعلقات ہوں۔“

”فاریخ! مجھے نہیں پتا وہ آدمی اس کا کیا لگتا تھا۔ تم نے کہا تھا کہ بیٹی کے ساتھ ایک آدمی کی لاش بھی ملی تو میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اس کا شوہر ہوگا۔ تم مجھ سے کس چیز کا شک کر رہے ہو؟“

وہ اس پر معلومات چھانے کا شک کر رہا تھا۔ اس سے بیٹی کو باہر کرنے میں غلطی ہوئی تھی اور ضرور کوئی مشکوک آدمی آتا جاتا ہو مگر عصرہ نے اسے نظر انداز کیا اور جب خیازہ بھگتا پڑا تو اس نے اپنی غلطی چھپا دی۔

”تم جانتی ہو میں تم پر کس چیز کا شک کر رہا ہوں۔“

”واں فاریخ!“ وہ درد سے چلائی تھی۔ ”کیا آریانہ کی موت کے علاوہ ہماری زندگی میں کچھ نہیں ہے؟ ہر چیز اتنے برسوں سے اسی کے گرد کیوں گھومتی ہے؟ وہ مری ہے فاریخ۔ مگر میں تو زندہ ہوں۔“

”وہ ہماری بیٹی تھی!“ وہ دانت پیس کے نرپا۔ ”ہماری نہیں۔ وہ صرف تمہاری بیٹی تھی۔“ وہ بھی برہمی سے چلائی۔ ”میں نے اتنے سال اسے بالائے اس کا خیال رکھا، مگر آخر میں تم نے مجھے یہ صلد دیا کہ تم مجھ سے شک کر رہے ہو؟“

”میں شک نہیں کر رہا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم نے اپنی غلطی کو راپ کی ہے۔“

”تم... تم یہ کہہ رہے ہو کہ اس آدمی کو میں نے بھیجا تھا آریانہ کو اغوا کرنے کے لیے؟ تم مجھ پہ اتنا برا الزام لگا رہے ہو؟“

اور واں فاریخ کے کندھے ڈھیلے پڑ گئے۔ اس نے مڑی تڑی پرچی نکالی اور اس کی گٹھلیں سیدھی کیں۔ تحریر واضح تھی۔ جو بات وہ خود سے نہیں کہہ سکا، وہ عصرہ نے اپنی آسانی سے کہہ دی تھی۔

”بولو۔ جواب دو۔“ پھر جیسے اس کی خاموشی پر وہ بے قرار ہوئی۔ ”فاریخ... تم واقعی مجھ سے شک کر رہے ہو؟ یہ سب تالیف تمہارے ذہن میں ڈالا ہے۔“

”اس کو... تم نے بھیجا تھا۔“ وہ آہستہ سے بولا تو اس کی آواز مختلف تھی۔ سرد، جھٹی، اندر تک کاٹ دینے والی، عصرہ کی روح تک کاٹ چکی۔

”فاریخ! کیا کہہ رہے ہو... میری بات سنو۔“

”میں شام میں گھر آؤں گا۔ ہم تب بات کریں گے۔ ایک آخری بات۔ اس کے بعد میں تمہاری شکل نہیں دیکھتا چلوں گا۔“ اس نے کال کاٹ دی۔ عصرہ کی دوبارہ کال آنے لگی تو فاریخ نے فون آف کر دیا۔

پھر وہ پرچی زور سے پھاڑی۔ دُچار آٹھ... اس نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔

عصرہ نے کہا تھا۔ ”کیا اسے میں نے بھیجا تھا آریانہ کو اغوا کرنے؟“

اس نے یہ نہیں کہا کہ آریانہ کو مارنے۔ کسی دوسرے کے لیے دونوں باتیں برابر تھیں۔

مگر وہ جانتا تھا کہ وہ لوگ اسے صرف انوار کرنے آئے تھے۔ اسے مارنے نہیں۔ عصرہ نے مارنے کی بات نہیں کی تھی۔ اس نے اپنے بدترین گلت کو باہر نکال دیا تھا۔ اس آدی کو عصرہ نے بھیجا تھا۔ نئی بھی عصرہ نے رکھی تھی۔ آریانہ کی موت کے بعد سب سے زیادہ خوف اور ڈر پریش کا شکار عصرہ ہی رہی تھی۔ سب واضح تھا مگر کون کہتا ہے کہ کبھی کو حیرت انگیز جواب مل جائیں تو دل فوراً سے مان بھی لیتا ہے؟

دل انکار نہیں کرتا بے شک۔ اسے سارا کھیل سمجھ آ جاتا ہے۔ مگر وہ صدمہ..... وہ بے یقینی..... وہ اسے بالکل ٹک کر دیتی ہے۔

وان فارخ نے کس دل سے پار لیان کا سیشن اینڈ کیا۔ صرف وہی جانتا تھا۔ وہ سارا وقت خاموش رہا۔ اس کے ذہن میں کڑے ماہ و سال کسی فلم کی طرح گردش کر رہے تھے۔

کبھی عصرہ کا آریانہ سے تنگ پڑ جانا اور اس سے سلوک بدل لینا۔ کبھی آریانہ کا شکایت کرنا کہ عصرہ فارخ کی غیر موجودگی میں اس کے ساتھ کتنی سے پیش آتی ہے..... مگر اسے اپنے سامنے بھی کچھ محسوس نہیں ہوا تھا۔ عصرہ اس بات کو یوں کور کر دیتی تھی کہ اسے لگتا ہے بچے کی تربیت اور بھلائی کے لیے اگر بحیثیت ماں وہ کتنی کرکھی دیتی ہے تو ابھی بات ہے اور پھر آریانہ نے شکایت کرنا چھوڑ دی۔

وہ اپنی کتابوں میں رہنے لگی۔ اس کو اسنو وائٹ کی کہانی سب سے زیادہ پسند تھی۔ وہ اکثر کہتی تھی کہ وہ اسنو وائٹ ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ خود کو شہزادی سمجھتی ہے بلکہ اس کی بھی ایک ظالم سوتیلی ماں تھی جو اس کے باپ کی غیر موجودگی میں اس کے ساتھ رو بہ بدل لیتی تھی۔

اس نے اپنا خون فام تک نہیں کھولا۔ اسے شام کا انتظار تھا جب وہ گھر جائے گا اور عصرہ سے دو ٹوک بات کرے گا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی کال بند ہونے کے

کچھ دیر بعد تالیہ نے اس نمبر پر مبینہ بھیجا تھا۔ عصرہ کے پاس تھا۔ عصرہ اس وقت دیوانہ وار اس کو ملاتے ہوئے مضطرب سی گھر میں چکر کاٹ رہی تھی۔ خوف سے اس کا دل کا پڑ رہا تھا۔ رات جب وہ آئے گا تو جولیانہ اور سکندر کے سامنے ان کی ماں کی حقیقت کھول دے گا۔ سب کھل جائے گا۔ پہلے اس نے فارخ کو کھویا تھا اور وہ اپنے آپ کو دھیرے دھیرے ختم کر رہی تھی مگر وہ اپنے بچوں کو بھی کھودے گی؟

وہ نڈھال سی صوفے پر گر گئی۔ اس کے جسم میں درد تھا۔ اس کے اعصاب اب ویسے مضبوط نہ رہے تھے جیسے کبھی ہوتے تھے۔ وہ جس شان سے دنیا چھوڑنا چاہتی تھی وہ اس سے شام میں چھین لی جائے گی۔ وہ فارخ کی آنکھوں میں دیکھ کے جھوٹ نہیں بول سکی۔ بولے گی بھی تو وہ جان لے گا۔ وہ غلطی پر غلطی کر رہی تھی۔ سارا کھیل ہاتھ سے پھسل رہا تھا۔ اور تالیہ تالیہ کا سٹیج آیا۔

بس ایک لمحے میں عصرہ کو گم ہو گیا۔ اسے کیا کرتا ہے۔ وہ فارخ کو نہیں نہیں کر سکتی تھی۔ اسے آج شام سے پہلے اس کھیل کو ختم کرنا ہے۔

آگے کا مرحلہ آسان تھا۔ نوکروں کو گواہ بنانا..... دولت کو بلا کے اس کے سامنے تالیہ بے شک کا اظہار کرنا..... اور پھر..... کیک کا آدھا کھلا کھانا جس پر آکسنگ کے طور پر اس نے بہت سا آرسنک چھڑک رکھا تھا۔ ذرا سا کھلا اس نے پھینکا..... اور باقی اپنے اندر اتار لیا۔ پھر صوفے کی پشت سے کیک لگا لی اور گیلی آنکھوں سے حجت کو دیکھنے لگی۔

اس دنیا میں کوئی بھی اپنی مرضی سے مرنا نہیں چاہتا۔ موت ایک فرار ہے۔ اور عصرہ مجبور کو ہمیشہ سے فرار کی عادت تھی۔ اپنا جرم چھپانے کے لیے اول روز سے وہ فارخ کو ملائی شیاء سے واپس امریکہ لے جایا جاتی تھی۔ اسے فرار چاہیے تھا مگر جب یہ تسلی ہوئی کہ آریانہ مر چکی ہے تو چند بیٹیوں کے لیے اسے لگا کہ وہ حکومت کر سکتی ہے۔ وہ نئی زندگی شروع

کر لیتی ہے۔ مگر پھر..... تالیہ نے اس سے سب کچھ لی لیا۔ تالیہ مرانے اس سے سکرانی کی خواہش اس کا شوہر اس کے بچے سب چھین لیے۔ اس کا دل روہ کر دیا۔ اور اب..... اب تالیہ اس کی سزا بھگتے گی۔

عصرہ ایک دیوی کی طرح مرے گی۔ اس کے بچے اس کو ہمیشہ مظلوم سمجھیں گے۔ ایک اور زمین۔ اور تالیہ اس جال سے کبھی نہیں نکل سکے گی۔ عصرہ نے اس کے لیے بچایا تھا۔

وہ کرسی پر بیٹھی تھی..... سر پیچھے لگا رکھا تھا اور انہیں حجت سے لٹکنے فائوس پہنچا رہی تھیں۔

اس کی روشنی کو دیکھتے ہوئے اس وقت عصرہ کو عجیب سا احساس ہونے لگا..... اس نے خود کو کیوں مار دیا..... اس نے میدان تالیہ کے لیے کیوں چھوڑ دیا؟ وہ بی اس کی ان ناعب صدمہ تھی..... اس کے پاس دولت تھی..... گھر تھا..... بچے..... اس نے ان سب کو کیوں چھوڑ دیا؟ نہیں..... سب غلط ہو رہا تھا.....

اسے یہ نہیں کرنا چاہیے تھا..... اسے لڑنا چاہیے تھا..... اس نے اٹھنے کی کوشش کی..... اسے ناک سے خون..... اسے خوف محسوس ہوا..... اسے وہ خوف محسوس ہوا جو مرنے سے پہلے ہر خودکشی کرنے والے کو ہوتا ہے..... وہ سب کچھ رپورٹ کر لینے کی آخری خواہش..... ترپ..... مگر تب تک اس کا جسم مفلوج ہو چکا تھا..... وہ اٹھ نہیں سکی..... گردن دایں طرف ڈھلک گئی۔

اسے اب کرسی کے ساتھ..... آریانہ کھڑی نظر آرہی تھی۔

اس کے سفید لباس پہ خون لگا تھا..... مگر وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ادھ کھایا سیب تھا۔ عصرہ کو دیکھتے ہوئے وہ دھیرے دھیرے اس سیب کے بائٹ لیتی رہی تھی..... پھر ہونٹ بند کیے، اسے چھانی جاتی.....

وہ جب تک گھر آیا..... مگر میں بچوں پہلے سے اٹھا تھا۔ پولیس پیرامیڈیکس اشعر..... اور دولت..... جو شام سے عصرہ کو بار بار کال کر رہا تھا اور ملازم نے جب فون

اٹھا کے اس کے لیے ہوئی کا تپا یا تو وہ فوراً آ گیا تھا۔ مگر سب کو دیر ہو چکی تھی عصرہ مجبور جانا چکی۔

جب وان فارخ نے اس کی تشدد دیکھی..... اس کا سفید چہرہ..... اور اس چہرے کے تاثرات..... تو اس کا دل عجیب دیرانیوں میں گھبرا پڑا گیا۔ عصرہ نے آریانہ کے لیے انوکھا پیسے تھے عصرہ اتنے سال اس سے جھوٹ بولی تھی مگر یہ سب باتیں ثانوی ہو گئیں۔

انسانی موت اپنے اندر خود اتنی بڑی فریڈی ہے جو کبھی بھی زندہ انسان کا دل دہلا دیتی ہے۔ ایک احساس زبیاں ایک غلا..... ایک مالل سا رہ جاتا ہے۔ عصرہ محمود، فارخ کو فیس کیے بنا..... اس سے معافی مانگے بنا..... ایک ہی لمحے میں اپنے لیے اس کی معافی کھسوا گئی تھی.....

وہ ان لوگوں کے ساتھ اسٹریچر کے گرد شکستہ سا کھڑا تھا۔ وہ سب اپنی اپنی کبہ رہے تھے۔ موت کی وجہ..... زہر..... یہ وہ.....

اور بھی اسے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ جیسے اوپر کوئی ہے۔ اس نے نگاہ اٹھائی تو وہ وہاں کھڑی تھی۔ سیاہ ٹوٹی اور سیاہ لباس میں اس کا چہرہ سفید پڑ رہا تھا۔ آنکھیں بے یقینی سے کھلی تھیں۔ ان کی نگاہیں ملیں اور وان فارخ کی ساری حیات جانے لگیں۔

(بھاگ جاؤ تالیہ!) اس نے اسے اشارہ کیا تھا۔ اور اگلے ہی لمحے وہ وہاں سے غائب ہو چکی تھی۔ ☆☆☆

رات خوف ناک حد تک خاموش تھی۔ تاریک آسمان خاموشی سے شہر کی گلیوں میں بھاگتی اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ ایک ٹیکسی سے دوسری بڑی، ایک گلی سے دوسری میں مڑتی..... وہاں بھاگتی بھاگتی اسے گھر تک آ پہنچی تھی۔

اندر داخل ہوتے ہوئے اس نے کھڑی پہ وقت دیکھا۔ زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں پولیس یہاں ہوگی۔ اسے جو کرنا تھا اسی وقت میں کرنا تھا۔

تالیہ مرانے کی سال تک اس بات سے تحقیق کی تھی کہ پولیس اس کے گھر تک کتنی جلدی پہنچ سکتی ہے۔ کون سا اسٹیشن یہاں سے کتنا دور ہے۔ ایک خوف سا

تھا کہی وہ دن آئے گا جب اسے پولیس سے بھاگنا پڑے گا۔ یہ نہیں معلوم تھا کہ بے گناہ ہونے کے باوجود ایسا ہوگا مگر یہ معلوم تھا کہ اگر ایسا ہوا تو کیا کرنا تھا۔ اور جو اسے معلوم تھا اسے آج اپنی جان بچانی تھی۔

اس نے گلیے جوتے ڈور میٹ پہ اتارے اور اپنے فریزر بندوں میں بیٹے۔ پھر سیمنٹ میں کھلنے والے دروازے تک آئی۔ فکٹر پرنٹ سے اسے کھولا اور بیڑھیاں پھلائی نیچے کو لگی۔

سیمنٹ کو عرصہ ہوا وہ خالی رہ چکی تھی۔ اپنے پچھلے اعمال کے تمام جوتوں اور نشانوں سے پاک۔ اب وہاں صرف ایک سے مو جوتی۔

اس نے ہماری میز و کھلی فرش سے ایک کڑی کا پلینک اٹھایا اور نیچے ہاتھ ڈالا۔ خیر خانے میں ایک سیاہ بیک رکھا تھا تالیہ نے وہ بیک اٹھایا اور بچھو لگی۔

اندر تین پاسپورٹ تھے۔ نوٹوں کے چند بنڈل گن چاقو ایک پیڑوں کا جوڑا دو کڑیٹ کارڈ چند دستاویزات رکھے تھے۔ دو گیلنز گلاسز "یافون" چار چڑیاؤں بیک اور چاکلیٹ بارز۔ یہ اس کا کو بیگ تھا۔

برسوں سے وہ اس لمحے کے لیے تیار تھی۔ اس کے ہاتھ کھپکپا رہے تھے اور دل بری طرح سے دھڑک رہا تھا مگر کسی ریپر شل شدہ عمل کی طرح تمام اعضاء تیزی سے کام کر رہے تھے۔

اس نے بیک کندھے سے ڈالا مگر کاروازہ اندر سے لاک کیا اور پچھلے دروازے سے باہر نکل گئی۔ پولیس کے سائرن میں منظر میں سنائی دے رہے تھے۔ اب وہ بیس اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی۔ پڈسٹر پہ گرائے آنکھوں پہ نظر کا چشمہ پہنے اس نے ماحولیاتی آلودگی سے بچنے والا بلیز ماسک تاک پہ جما رکھا تھا۔ یہاں کے ایل میں بہت سے لوگ ماسک پہنے گھوما کرتے تھے۔

ایک فون ہونچہ۔ وہ رکی اور۔ بیورو اٹھا کے ایک نمبر ملایا۔ حسب متوقع آگے سے وائس میل آن تھا۔ "داتن" وہ پھوے شخص کے درمیان کہہ رہی

تھی۔ "پولیس میرے پیچھے ہے۔ اس لیے لپکا رہو۔ نمبر پہ کال نہیں کر سکتی۔ وہ ٹیپ ہو رہا ہوگا۔ میری بات دھیان سے سنو۔" وہ وائس بکس میں سے دھیمی سرگوشی میں کہنے لگی۔ "وہ سمجھتے ہیں کہ عصر کو مارا ہے۔ مگر میں نے اسے نہیں مارا۔ کوئی کچھ بھی کہے اس کی بات کا اعتبار مت کرنا۔ دل کی سننا۔ میں مشکل میں ہوں۔" اس کی آواز گلی۔ چند گہری سانس اندر کھینچیں۔

"کاش میرے پاس وقت کی جانی ہوتی۔ میں وقت میں تین چار ماہ آگے نکل جاتی۔ اس ملک سے دور۔۔۔ شاید جاپان کی طرف۔۔۔"

ابھی۔ ابھی مجھے منگ پور جانا ہے۔ مجھے ایک پاسپورٹ چاہیے۔ وہ ہدایت دے رہی تھی۔ "تم میرا نمبر اپنے گھر سے نہیں نکلو گی۔ ٹھیک کیا رہے؟ تم اپنے گھر کے باہر والے ہمارے مخصوص ڈراپ باکس میں پاسپورٹ رکھ دو گی۔ میں وہاں سے اٹھاؤں گی۔ مگر میں تم سے مل نہیں سکوں گی۔ اور دھیان کرنا۔"

پولیس کو نہیں علم ہونا چاہیے۔ اس کے لیے تم بھی ملک چھوڑ دینا اور میں۔۔۔ میں سنا کور سے آگے نکل جاؤں گی مگر۔۔۔ وہ گلی کی آواز سے مسکرائی۔ "جلی، ہم وہاں ضرور ملیں گے۔ کسی اور زمانے۔۔۔ کسی اور موسم میں۔۔۔"

سمندر کنارے جلی پچھلی کا شکار کرنے۔۔۔ ہم ضرور ملیں گے داتن۔ اس نے فون ہٹایا۔ آنکھیں رگڑیں۔ ہڈ برابر کی اور تیزی سے بس کی طرف دوڑ گئی۔



حالم کا بنگلہ رات کے اس وقت دو شنیوں میں نہایا ہوا تھا۔ باہر کڑی پولیس موبائل کی جلتی جیتی رو شنیوں اور آوازوں نے ساری اسٹریٹ کو خوف و ہراس میں مبتلا کر رکھا تھا۔ دروازے کھلے تھے۔ بیڑھیوں سے اوپر نیچے پولیس اہلکار آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے، چند منٹوں میں انہوں نے تالیہ کا سارا گھر الٹ کر رکھ دیا تھا۔

لاؤنج کے وسط میں دولت کھڑا تھا۔ ہاتھ پہلوؤں پہ جمائے شرٹ کے کف موڑے وہ ناخوش

رہا تھا۔ اس کے کندھوں سے کمر تک پلٹ سے اڑھا ہوا لٹرو سٹول واضح نظر آ رہا تھا۔ "گھر کھینچ رہے ہیں؟" ایک اہلکار نے آگے اٹھ کر دیکھا۔ "دولت نے افسوس سے نفی میں سر ہلایا۔ "ظاہر ہے اسے معلوم تھا ہم آرہے ہیں۔ وہ اہلکار جلی ہے۔ بات سنو۔ اب پوری دن۔" اس نے تالی بکائی تو اوپر نیچے پچھلے اہلکار ہاتھ روک کے اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"میری ابھی وزیر اعظم صاحب سے بات ہوئی ہے۔ عصر محمود ایک ہائی پروفائل خاتون میں اور ان کی موت کوئی عام بات نہیں ہے۔ پردھان منتری نے تالیہ مراد کی فوراً گرفتاری کا حکم دیا ہے۔"

وہ وائس بکس سرگھما تا ایک ایک کو دیکھتا سختی سے کہہ رہا تھا۔

"ایک لمحے میں پولیس کے ہر ناکے شہر کی ہر اینٹری، ایک ہر قحطانی اور تیری پلٹ تالیہ کی تصاویر میں دو۔ شہر کی ہر پولیس پٹرول پونٹ کو اس کا خطبہ اور تصویر ملی جائے۔ اس کے گھر کے ارد گرد کی سی دی وکی سے اس کی نقل و حرکت کو پولیس کرنے کی کوشش کرو۔ اس کے تمام دوستوں کے فونز ٹیپ کرو۔ وہ ان فاق کا بھی۔ وہ کسی سے رابطہ ضرور کرے گی۔"

وہ اب پٹنی اٹھ کر رکھے سوچتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "تالیہ مرا کو اگر میں جانتا ہوں تو اس کا اگلا اسٹیپ۔۔۔ اس نے رک کے سوچا۔ تالیہ اب کیا کرے گی؟"

"فرار۔۔۔ وہ ملک سے فرار ہونے کی کوشش کرے گی۔" وہ مسکرا کے بولا تھا۔ "اور ہمیں اس شہر کے ہر دروازے پہ پہرہ لگا دینا ہے۔"

وہ کہہ رہا تھا جب فون کی کھنٹی بجی۔ اس نے بات روک کے موبائل کان سے لگایا۔

"بولو زائد۔" دوسری جانب اس کا اینالسٹ ایڈ کو اڑتے بات کر رہا تھا۔

"سر۔۔۔ ایک اطلاع ہے۔" اینالسٹ دے دے جوش سے کہنے لگا۔ "یاد ہے ہم نے تالیہ کی کیس انویسٹی

میکین کے دوران اس کی دوست لیانہ صابری کی فائل تیار کی تھی۔ مجھے اس دوران لیانہ کا ایک ایسا فون نمبر ملا تھا جو اس کے گھر کے علاقے میں مخصوص وقت کے لیے آن ہوتا تھا۔ یہ نمبر اس کے نام نہیں ہے اور۔۔۔" مجھے اس سے عرض نہیں ہے کہ تم نے وہ نمبر کیسے ڈھونڈا۔" دولت نے اٹک کے بات کا نی۔ "مجھے یہ بتاؤ کہ اس نمبر پہ تالیہ نے رابطہ کرنے کی کوشش کی ہے؟"

"لیانہ سر۔" وہ دے دے جوش سے بولا۔ "وہ نہیں جانتی کہ ہم اس نمبر کو ٹیپ کر رہے تھے۔ اس نے وائس میل میں پیغام چھوڑا ہے۔ میں آپ کو سنوا رہا ہوں۔"

دولت چند لمحے تک اس پیغام کو سن رہا تھا جو تالیہ نے داتن کے لیے چھوڑا تھا۔ پھر اس نے فون رکھا اور ٹیپ کو کچا لب کیا۔

"بیچ آف پان۔" ہم اس کے گرد گھیرا انگ ضرور کریں مگر تالیہ کے پلوٹ ہونے کی خبر میڈیا نہیں دیں گے۔ وہ سب سے زیادہ اس چیز سے ڈرتی ہے۔ یہ پتا ابھی ہم اپنے ہاتھ میں رکھیں گے اور لیانہ صابری کو ابھی ہم گرفتار نہیں کریں گے۔ وہ تالیہ تک پہنچنے کے لیے ہمارا واحد لنک ہے۔" وہ آس اور اضطراب کے درمیان کہہ رہا تھا۔ "امید ہے کہ تالیہ اس کے گھر کے قریب جائے گی نیا پاسپورٹ اٹھائے۔ ہمیں لیانہ کے گھر کے گرد گھیرا انگ کرنا ہے اور جب تک اپنی کارروائیوں کو خاموش رکھتا ہے۔ تالیہ مراد اس وقت خوف کا شکار ہے اور ایسا انسان غلطی سے غلط کرتا ہے۔ ہم تالیہ کی غلطی کا انتظار کریں گے۔"

اسے تالیہ کی فون کال میں عرصے بعد وہی خوف محسوس ہوا تھا جو تید کے ان پانچ دنوں میں اس کے چہرے پہ نظر آ رہا تھا۔ وہ جس چیز سے ڈرتی تھی وہی اس کے سامنے آگئی تھی۔ بہت اچھے۔

وہ تالیہ مراد کے کردار ایسا حیران بنانے جا رہا تھا جس کو وہ توڑنے کی کوشش میں غلطیاں کرے گی۔ جلی اور چوہہ کا کھیل شروع ہونے والا تھا۔

اگلی صبح آسمان نے دیکھا کہ ایک بڑے سبزہ زار پہ عصرہ محمود کے جنازے کی رسم ادا کی جا رہی تھی۔ لوگوں کا ایک منظم جھوم وہاں کھڑا تھا۔ قطار میں لوگ باری باری آتے اور مرکزی جگہ پہ کھڑے فارح سے ہاتھ ملاتے، تعزیت کرتے، دعا دیتے اور آگے بڑھ جاتے۔

وہ سر کے خم سے ان کی تعزیت وصول کرتا، شکر یہ ادا کرتا اور پھر ایک ویران نظر اپنے دونوں بچوں پہ ڈالتا جو اس کے دائیں طرف کھڑے تھے۔ دونوں نے اب زار و قطار رونابند کر دیا تھا۔ جولیانہ صرف شعلہ شعلی اور سکندر بار بار سر جھکا کے کیلی آنکھیں پونچھتا تھا۔ فارح ایک ہاتھ لوگوں سے ملاتا تھا، اور دوسرا سکندر کے کندھے پہ جمائے ہوئے تھا۔

جولیانہ کے اس طرف اشعر کھڑا تھا۔ ان سب کے چہرے آج سوکرا تھے۔

خاندان کی ایک خاتون بچوں کو اپنے ساتھ دوسری طرف لے گئیں تو اشعر اس کے کندھے کے برابر آ کھڑا ہوا۔

”آپ ٹھیک ہیں آج بک؟“

”ہوں۔“

”میں جانتا ہوں کا کا اور آپ کے اختلافات تھے اور.....“

”میرے اور عصرہ کے کوئی اختلافات نہیں تھے، ایش۔ وہ ایک بہت اچھی بیوی اور ماں تھی۔ اس نے بھی کچھ ایسا نہیں کیا جس سے میں ہرٹ ہوا ہوں۔“ اشعر نے نظروں کا رخ موڑ کے اسے دیکھا۔ وہ جھجکی سے سامنے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اس نے جیسے سارے حساب کتاب ختم کر ڈالے تھے۔ اشعر کو خیال گزرا کہ آخری دنوں میں وہ دونوں کافی بہتر ہو چکے تھے۔ فارح نے اسے نائب چیئر پرسن بھی بنادیا تھا۔ واقعی اب ان کے درمیان کوئی جتنی نہیں تھی۔ وہ واپس تعزیت کرنے والوں کے ساتھ

گمن ہو گیا۔

”فارح۔“ دولت اس کے ساتھ آ کھڑا ہوا تو

فارح نے چونک کے گردن موڑی۔ پھر اس دیکھ کے ماتھے پہ ہل پڑ گئے۔ واپس چہرہ کے زربل بولا۔

”ضہاری تفتیش کہاں تک پہنچی؟“

آدم شہیدنا کو اکر زری تھی۔

”بہت جلد تالیہ مراد جیل کی سلاخوں ہوگی۔“ وہ دونوں نامحسوس طریقے سے دہاں ہٹ گئے۔ اب تعزیت کرنے والوں سے قدر فاصلے پہ وہ گھاس پہ آئے سامنے کھڑے تھے۔

”سب تالیہ نہیں کیا۔“

”تمہیں کیسے معلوم۔“

”اگر تم تعصب کا چشمہ اتار دو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا۔“ وہ پرہیزی سے دولت کو دیکھ کر کہہ رہا تھا۔ ”وہ یہ نہیں کر سکتی۔ اس کو اس میں جا رہا ہے۔“

”اچھا؟“ دولت طنز سے بولا۔ ”کس پھنسیا ہے اسے؟“

”یہ معلوم کرنا تمہاری جا بجا ہے۔“

”کے پیسے دیتی ہے تمہیں۔ جاؤ اور معلوم کرو۔“

ناگواری سے کہہ کے دان فارح آگے بڑھتا۔

دولت نے ضبط سے گہری سانس بھری۔

گھڑی پہ وقت دیکھا۔ دس بج رہے تھے۔ اسے دان کے گھر سے چند فرلانگ دور مقررہ جگہ پہ پہنچنا تھا۔

تالیہ مراد اپنا سپورٹ لٹلے آنے والی ہوئی۔

دان فارح اب قطار میں آئے لوگوں سے تعزیت وصول کر رہا تھا۔ اگلا شعلہ ایلیم تھا۔ فارح اس سے ہاتھ ملایا تو وہ قریب آ کے آہستہ سے بولا۔

”مجھے بہت افسوس ہوا۔“

”مجھے بھی ایلیم۔“ اس نے گہری سانس لی۔

”میں اور میرے بچے اس غم سے کیسے ٹھیک ہو گئے۔“

”ہاں کیونکہ بھانجے سے وہ مزید مجرم لگ رہی ہے۔ ایک دفعہ وہ خود کو قانون کے حوالے کر دے تو اس کو پچا لوں گا کیونکہ وہ بے گناہ ہے۔“

”میرا ان سے رابطہ نہیں ہے۔“

”میرا ان سے رابطہ نہیں ہے۔“

”میرا ان سے رابطہ نہیں ہے۔“

”میرا ان سے رابطہ نہیں ہے۔“

”میرا ان سے رابطہ نہیں ہے۔“

”میرا ان سے رابطہ نہیں ہے۔“

”میرا ان سے رابطہ نہیں ہے۔“

”میرا ان سے رابطہ نہیں ہے۔“

”میرا ان سے رابطہ نہیں ہے۔“

”میرا ان سے رابطہ نہیں ہے۔“

”میرا ان سے رابطہ نہیں ہے۔“

”میرا ان سے رابطہ نہیں ہے۔“

”میرا ان سے رابطہ نہیں ہے۔“

”میرا ان سے رابطہ نہیں ہے۔“

”میرا ان سے رابطہ نہیں ہے۔“

”میرا ان سے رابطہ نہیں ہے۔“

”میرا ان سے رابطہ نہیں ہے۔“

فارح کی بات کا کوئی کھڑا نہ تھا۔

”تالیہ بے گناہ ہے۔ اس نے عصرہ کو نہیں مارا اور اگر تم اس بات پہ یقین نہیں کرنا چاہتے تو مجھ سے دوبارہ اس موضوع پہ بات نہ کرنا۔“ وہ کہہ کے آگے بڑھ گیا۔

اس نے تالیہ کی ای میل آج صبح پڑھی تھی۔ نہ بڑھتا جب بھی اسے یقین تھا کہ وہ کب تالیہ نہیں جیتتی۔ وہ کسی کی جان بھی نہیں لے سکتی۔ ساری بات یہیں آ کے ختم ہو جاتی تھی۔

☆☆☆☆

لیانہ صابری کے گھر سے چند فرلانگ دور ایک پینڈز کچن کی دین کھڑی تھی۔ باہر سے دیکھ کے لگتا تھا وہ کسی گھر میں پینڈز کرنے آنے والوں کی دین ہے۔ البتہ اس کے اندر کا محل کیسے مختلف تھا۔ دہاں کرسیاں تھیں، قطار میں اسکرین نصب تھیں جن کے آگے ٹیکنیکی امور میں ماہر اینالسٹ بیٹھے تھے۔ اور ان کے پیچھے خالی جگہ پہ دولت ٹہل رہا تھا۔ بار بار وہ گھڑی لگتا۔

”گیارہ بج کے پانچ منٹ ہو گئے ہیں۔ لیانہ گھر سے نہیں نکلی۔ اب وہ پاسپورٹ کیسے دے گی؟“

”ہم اس کے گھر کے باہر رات سے موجود ہیں۔ وہ رات سے گھر سے نہیں نکلی۔“ ایک اینالسٹ نے گردن موڑ کے اسے بتایا تھا۔ ”اس کے دونوں فونز آن ہیں اور ان کی لوکیشن گھر کے اندر کی ہی آ رہی ہے۔“

”تو یہ وہ اندر ہے۔“

”اسے اب تک باہر آ جانا چاہیے تھا۔“ دولت خود کلامی کے انداز میں کہہ رہا تھا۔ وہ شدید مضطرب نظر آتا تھا۔

”اوکے۔ ہم مزید انتظار نہیں کر سکتے۔“ وہ رکا اور کان میں لگے آلے پہ اپنی اسے فون کو بزدقوت لیانہ کے گھر کے اندر جانے اور اسے گرفتار کر کے لانے کا حکم دے لگا۔

”سرسر۔ گھر کتر ہے۔“ دس منٹ بعد لیانہ کے

”سرسر۔ گھر کتر ہے۔“

”سرسر۔ گھر کتر ہے۔“

”سرسر۔ گھر کتر ہے۔“

”سرسر۔ گھر کتر ہے۔“

”سرسر۔ گھر کتر ہے۔“

”سرسر۔ گھر کتر ہے۔“

”سرسر۔ گھر کتر ہے۔“

گھر کا دروازہ توڑ کے داخل ہونے والا اہلکار بتا رہا تھا۔ "اس کے دونوں خون بیداروں میں پڑے ہیں چار جنگ پہ۔ وہ فرار ہو چکی ہے۔"

دولت نے زور سے کرسی کو بوٹ سے ٹھوک ماری۔ "وہ کب فرار ہوئی؟ تم لوگ رات سے گھر کے چاروں طرف تھے۔"

"ہم تالیہ کے اس پیغام کے قریباً پچیس منٹ بعد یہاں پہنچے تھے۔ وہ اپنے فوجی نہیں چھوڑ کے ہمارے آنے سے پہلے ہی فرار ہو چکی ہوئی۔" اس کا اینالسٹ یاپوسی سے بتا رہا تھا۔

"لیکن اب وہ تالیہ کو پاسپورٹ کیسے دے گی؟" ایک دوسرے اینالسٹ نے کہا تو دولت چونکا۔ ٹھوک مارنے سے اس کا ہیر درد کرنے لگا تھا مگر اس ایک فقرے نے اسے سب بھلا دیا۔

"تالیہ مراد کو پاسپورٹ کیوں چاہیے تھا؟" "ملک سے بھاگنے کے لیے سڑا۔"

"اس نے پہلے سے ہنگامی صورتحال کا انتظام کیوں نہیں کیا؟ پاسپورٹ میسجی نئی شائیں۔ اس کے پاس اس کا اپنا گوبک ہر وقت ہونا چاہیے تھا۔ ایک منٹ.... دوہرے کارڈنگ.... وہ دوبارہ چلاؤ۔"

وہ تیزی سے ماتحت کی کرسی کے قریب آیا اور جبکہ اس کی اسکرین پر چمکا۔

ماتحت نے چند من پر اس کیے تو رات والی کال کی ریکارڈنگ چلنے لگی۔ پہلے دولت نے اس ریکارڈنگ میں جس شے سے زیادہ غور کیا تھا وہ تالیہ کی آواز تھی۔ جیجی خوف سے لبریز آواز جس میں کیکیا بیٹ تھی۔ ایک میا کو شکار کی ایسی آواز سن کے لطف آتا تھا۔ وہ اس سے آگے کچھ نہیں دیکھ سکا تھا۔ مگر اب وہ الفاظ سن رہا تھا۔

"میں کوئی کچھ بھی کہے اس کی بات کا اعتبار نہیں کرتا۔" تالیہ کی آواز ابیکز میں گونج رہی تھی۔ دولت نے بے دردی سے اہٹاپ کاٹا۔ (کیا اس کی باتوں کا وہی مطلب تھا جو وہ نظر آتا تھا؟)

"کاش میرے پاس وقت کی چابی ہوتی تو

میں وقت میں تین چار ماہ آگے لے لے جاپان۔"

"جیجی ہم دوبارہ ضرور ملیں گے۔"

زبانے میں.... کسی اور موسم میں....

جیجی کا شکار کرنے.... پرانے وقتوں کی طرح ضرور ملیں گے۔"

دولت ماتحت سے مل ڈالے سیدھا ہوا۔

نے کہا۔ "وقت کی چابی۔"

ماتحت نے مڑ کے اسے دیکھا۔ "سرا۔"

معلوم تو ہے۔ بے تالیہ کی تیسوری جو انہوں پر ایک یوٹراجم نظام کو بتاتی تھی کہ وہ وقت میں نہیں اور۔۔۔۔۔"

"انہوں۔۔۔۔۔ پچھے نہیں.... اس نے کہا۔"

میں آگے جانا چاہتی ہے۔۔۔۔۔ وہ پہلوؤں پر ہمارے کرسیوں کے پچھے چلنے لگا۔

"اس نے لیانہ کو پاسپورٹ کے لیے فون کیا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ ہم کال چپ کر رہے۔"

گے۔ اس کو جیجی یہاں نہیں آتا تھا۔"

"تو پھر اس نے یہ کیوں کیا؟"

"اگر ہم یہ کال نہ سنتے.... مڑ کے کیسے کیسے۔"

اینالسٹ کو دیکھا۔ "اگر تم مجھے یہ کال نہ سنو۔"

میں اسی وقت لیانہ صابری کی گرفتاری کا حکم دے رہا تھا۔ میں تالیہ کے فراموشی خیر ہر جگہ چلانے جا رہا تھا۔ اس کال نے ہمیں لوٹک دیا۔ دونوں کو موقع پکڑنے کی خواہش نے ہمیں روک دیا۔ وہ لیانہ بھاگنے کا وقت دے رہی تھی۔

وہ جانتی تھی کہ دولت کا خواب کیا ہے۔ تالیہ خوفزدہ دیکھنا۔ کون دومن نے اس کو ایک خواب دکھایا ایک دلفریب سراب جس کے تعاقب اس کو بھانسیہ دے ڈالا۔

"یعنی سر.... تالیہ مراد نے لیانہ سے نہیں کیا تھا؟"

اور اس سوال پہ ٹھٹھا ہوا دولت رکا۔ اسے ایک عجیب سا خیال آیا۔

"آف کورس۔ دی کیوب دو چیزوں کے لیے

"انہوں۔۔۔۔۔ تالیہ کے پاس لیانہ سے رابطے کی ایک خبر تھا۔ اسے اس سے بات بھی کرنی اور اسے خوف بھی تھا کہ پولیس اسے شپ کر رہی۔ اس نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ وہ واقعی میں لیانہ کو ملاقات کے لیے بلاری تھی مگر۔۔۔۔۔"

وہ خود دوبارہ اسکرین تک آیا اور جبکہ کے مٹن کیا۔ ریکارڈنگ بھر سے چلنے لگی۔

"کاش میرے پاس وقت کی چابی ہوتی.... تو وقت میں تین چار ماہ آگے چلی جاتی۔ جاپان۔"

اس نے اسٹاپ کا مٹن دیا اور دوسرے سے ہوا۔ "چار ماہ کے بعد جاپان میں کیا ہوتا۔"

"جاپان۔۔۔۔۔" اینالسٹ نے انگلیوں پر اب کیا۔ "کچھ بھی نہیں۔ چار ماہ بعد اپریل ہے۔"

اور۔۔۔۔۔"

بس اس ایک لمحے میں پزل کے سارے ٹکڑے جگہ جگہ پھیل گئے۔

"ساکورہ ہانامی۔" دولت بوڑیا۔ "مارچ میں میں جاپان میں ساکورہ ہانامی شروع ہو جاتا۔"

وہین میں خاموشی چھا گئی۔ سب ایک دوسرے دیکھنے لگے۔ دولت نے البتہ کراہ کے کبھی پھوٹی۔

ی۔۔۔۔۔"

"اے جاپان نہیں جانا تھا۔" دولت نے استے سے ٹپ سی سر ہلایا۔ "وہ اسے دی کیوب میں رہی تھی۔"

"دی کیوب؟ وہ جاپانی ریسٹوران؟" ایک انار نے چونک کے کہا۔

"ہاں۔ کیونکہ اس نے کہا وہ لیانہ کے ساتھ جیجی کی کال کا شکار کرنا چاہتی ہے۔" اس نے تکلیف سے انیسٹ نکلیں۔ اینالسٹ نے بے اختیار سر پر ہاتھ مارا۔

"آف کورس۔ دی کیوب دو چیزوں کے لیے

مشہور ہے۔ سوشی (کچی پھلی کی ایک جاپانی ڈش) اور ہانامی۔ اس ریسٹوران کے جاپانی مالک نے اس کو ہانامی کے رنگوں سے سجا رکھا ہے اور وہاں دیواروں پر جاپان کے ہانامی کے مناظر ٹھری ڈی پیہ چلائے جاتے ہیں۔ وہاں جاکے لگتا ہے کہ۔۔۔۔۔"

"کہ آپ وقت میں چار ماہ آگے جاپان میں چلے گئے ہیں اور آپ کے اور گرد چیری ملازم کے پھول گر رہے ہیں۔ ڈیم اٹ۔" دولت نے ٹی سے کہتے ہوئے دوبارہ کرسی کو ٹھوک ماری۔ اب کے خالی کرسی الٹ کے پرے جا گری۔

"میں ابھی ایک ٹیم اس ریسٹوران بھیجتا ہوں۔" ماتحت نے جلدی سے فون اٹھایا مگر دولت نے انفسوس سے سانس بھری۔

"ضرور بھیجو مگر وہ ٹی گھٹنے پہلے لیانہ سے ملاقات کر کے وہاں سے روپوش ہو چکی ہوں گی۔"

تالیہ مراد ہم سے ہمیشہ ایک قدم آگے رہتی ہے۔"

☆☆☆

چند گھنٹے قبل جیجی رات میں واپس جاتے ہیں۔

داتن کے لیے پیغام ریکارڈ کروا کے تالیہ فون بوتھ سے نکلی۔ سر پہ ہڈ برابر کی آنسو پونچھے اور اندر سے میں کسی طرف بڑھ گئی۔

بس میں کھڑکی کے ساتھ بیٹھی تالیہ کی آنکھوں میں اب سیٹ سا تھرا تھا۔ وہ بار بار کال ٹی کی کھڑکی دیکھتی تھی۔ اگر اس کا اندازہ درست تھا تو داتن آدھے گھنٹہ تک دی کیوب پہنچ جائے گی۔ پولیس اگر کال ٹیپ کر رہی تھی اور پیغام کوڈی کوڈ بھی کر لے تب بھی ان کے دی کیوب پہنچنے تک وہ دونوں وہاں سے جا چکی ہوں گی۔

کے ایل کے دل میں واقع یہ ریسٹوران اندر سے نیم اندیرا سا تھا۔ ایک گول سا ہال جس کے وسط میں لکڑی کا جھونپڑا بنا ہوا تھا۔ جھونپڑے کے اندر شنگ ایڑیا تھا۔

مدھم موسیقی چل رہی تھی اور کھانا سرو کیا جا رہا

تھا۔ دیوار پر ایک پینٹنگ لگی تھی۔ اس میں جاپان کی ایک سڑک کی تصویر تھی جس کے کنارے چیری بلازم کے گلابی پھول گئے تھے۔

مارچ اپریل میں ایس ریسٹوران میں ”ہانی فلیورنگ“ شروع ہو جاتی تھی اور بوڑھا جاپانی مالک اس جگہ کو گلابی رنگوں سے سجا دیتا تھا۔ مگر ابھی چونکہ سرما تھا اس لیے یہاں ہانی کی محض چند ایک نشانیاں موجود تھیں۔

البتہ فی الحال بہار دور تھی۔ سرما ہر سو پھیلا تھا۔ اس لیے ریسٹوران قدرے خالی خالی سا تھا۔ ہال کے وسط میں بنے جھونپڑے میں بیٹھی تالیہ بار بار گھڑی دیکھتی تھی۔ سر پہ ڈاکر رکھا تھا اور انگلیاں مروڑ رہی تھی۔

دفعتاً بوڑھا جاپانی شیف قریب آیا اور قبوے کی پیالی سامنے رکھی۔ پھر قریب جھکا اور سرگوشی کی۔ ”اگر پولیس لیانے سے پہلے آ جائے تو تم مڑے بغیر چکن میں چلی آنا اور وہاں سے۔“ اشارہ کیا۔

تالیہ پیکا سا مسکرائی اور تشکر میں سر ہلایا۔ ”شکر ہے تاؤ۔ اتنی جلدی پولیس یہاں نہیں آئے گی۔ لیکن اگر آگئی تو میں تمہیں مشکل میں نہیں ڈالوں گی۔“

تاؤ نے مسکرا کے اس لڑکی کا چہرہ دیکھا جو پڈ کے ہالے میں زرد سا بڑھا تھا۔ پھر اس کی پیالی میں سنہری قبوے کی دھار اٹھ گئی۔

”کون ہو تم؟ میں تو تمہیں جانتا ہی نہیں۔ اور سی سی ٹی وی صبح سے خراب پڑا ہے۔“ وہ مسکرا کے آگے بڑھ گیا۔

”میں نے سنا تھا تم مجھ سے ناراض ہو۔“

خفا سی آواز سنائی دی تو تالیہ مراد نے گہری سانس لے کر سر اٹھایا۔

بھاری بھر کم سی ٹھکر بایاے بالوں والی داتن ماتھے پہ بل ڈالے اس کے سامنے کرسی بچھ رہی تھی۔ اتنے عرصے بعد اسے دیکھا تھا اور وہ اسے

دیکھ ہی لگی تھی۔
”میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ میں اس سے ناراض بھی۔“

داتن نے کھانا میز پر رکھیں اور آگے کے کرسی پر بیٹھ گئی۔ تالیہ..... تم نے بھی کیسے کہ تم تمہیں اکیلا چھوڑ دیں گے؟ ہمارے کچھ تھے کہ تم ٹھیک ہو۔ اور میں پچھو دوسرے کا میں چھٹی ہوئی تھی۔ میری غلطی ہے کہ میں عرصہ دھوکے میں آگئی اور بھی کہ.....“

”تم کمزور لگ رہی ہو۔ کیا ہوا ہے؟“
داتن لمحے بھر روکی اور پیکا سا مسکرائی۔
”ڈائیننگ کر رہی ہوں۔ خودی تو کبھی جس کو وزن کرو۔“

تالیہ ہلکے سے فس دی۔ آنکھوں میں پانی آ گیا۔

”مجھے تم سے گھر نہیں ہے۔ ہر انسان کو اپنے آپ کو خود بھانا پڑتا ہے۔ میں اس سے بھی نکل آؤں گی۔ اور پہلے بھی۔“

”تالیہ!“ اس نے بات کاٹ کے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا۔ ”ہم اس دلدل میں عاصفہ تھے۔ ساتھ نکلیں گے۔ تمہارے پاس پاسپورٹ ہے؟“

”ہم آج ہی سنگا پور جا رہے ہیں۔“
”تمہیں داتن صرف تم سنگا پور جا رہی ہو۔“

تالیہ کا انداز قطعاً تھا۔
داتن نے ابرو جھپٹے۔ ”ہمارا فرار کا پلان کی سالوں سے وہی ہے تالیہ۔ پہلے سنگا پور اور وہاں سے دہلی۔ سب تیار ہے۔ ہم ایک نئی زندگی شروع کر سکتے ہیں۔ میں اپنی فلیٹی کو وہیں بلالوں گی اور.....“

”مگر میری فلیٹی نہیں ہے۔ ایڈم یہاں ہے۔“
داتن قہر میں یہاں ہیں۔ میں ملک نہیں چھوڑ سکتی تھی۔

صرف..... ”وہ آگے کو بچی اور آواز مدھم کی۔“
ایل میں ٹھہرنے کو جگہ چاہیے۔
”کوئی سیف ہاؤس؟ ہاں ایک دو جگہ ہیں لیکن اگر پولیس کو علم ہو گیا تو.....“

”میں اپنی حفاظت خود کر سکتی ہوں داتن!“
بوڑھا تاؤ پھر سے ان کے قریب آیا اور کہا۔ ”کیا تم لوگ سوٹی کھاؤ گی؟“

”نہیں تاؤ۔“ تالیہ نے ہاتھ سے اسے جانے اشارہ کیا۔ وہ اس وقت کچھ بھی نہیں کھا سکتی تھی۔
روکی ہاتھ رکھنے کے باوجود اس کی رنگت زرد لگی جا رہی تھی۔ اور وہ بار بار اضطراب سے انگلیاں مروڑتی تھی۔

”میں تمہیں یہاں چھوڑ کے نہیں جا سکتی۔“
”داتن فکر مند سی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ تالیہ اس سے مسکرائی۔
”میں نے عرصہ کو نہیں مارا مگر میں بھاگ نہیں سکتی۔ صرف چھپنا چاہتی ہوں۔ کچھ دن کے لیے۔“

”اور کاش؟“
”وہ جانتے ہیں کہ میں نے گناہ ہوں۔ مگر مجھے نہیں معلوم وہ میرے لیے کچھ کر سکیں گے یا نہیں۔“

اس کے انداز میں شک تھا۔ داتن نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور سنجیدگی سے بولی۔
”مجھے وان فارغ سے بہت سی باتوں پہ اختلاف ہے مگر تم اپنے دل سے یہ بے یقینی نکال دو۔“

تالیہ نے وہ سنجیدگی سے اکیلا چھوڑ دیں گے۔ ہم انہیں تمہارے ساتھ ہیں اور تمہارے لیے ہر حد تک یامیں گے۔“

تالیہ کی داتن چچی نگاہیں جھپٹنے لگیں۔
”اگر میں اچھائی کا راستہ نہ اپناتی تو یہ سب میرے ساتھ نہ ہوتا۔ میں برائی کے راستے پر رہتی تو بھی رہتی۔“

”نہیں تالیہ۔ میں ہمیشہ کہتی تھی کہ انسان اس راستے کو ترک نہیں کر سکتا مگر میں غلطی۔ انسان سب کر سکتا ہے۔ تم نے درست کیا جو کیا۔“
وہ اعتراف کر رہی تھی مگر تالیہ نے نفی میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھوں میں زخمی سا تاثر تھا۔

”کیا فائدہ ہوا سب ترک کرنے کا؟ مجھے

ایسے جرم میں پھنسا یا جا رہا ہے جو میں نے کیا ہی نہیں ہے۔ میں سمجھتی تھی کہ انسان اچھے راستے پہ آجائے تو دوسرے انسان بھی اس کی مدد کرتے ہیں مگر اب داتن..... اس نے ارد گرد دیکھا۔ ”اب مجھے اس دنیا اور اس کے انسانوں کے اندر کی اچھائی سے امید ختم ہوئی جا رہی ہے۔“

لیانے نے اسے کبھی یوں بے بس اور ہاوس نہیں دیکھا تھا۔ وہ بار بار لب کاٹ رہی تھی۔ کبھی گردن کی پشت کو پھینک دیتی۔ کبھی میز پر ناخن رگڑتی۔ داتن دھیرے سے تیکے ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

”تالیہ..... کوئی بھی ہمت ہار سکتا ہے۔ مگر تم نہیں۔“

”میری زندگی میں ایک کے بعد ایک مسئلہ شروع ہو جاتا ہے۔ میں اب ان مسئلوں سے ایک ہی دفعہ چھٹکارا پانا چاہتی ہوں۔“ پھر اس نے سر ہاتھوں میں گرا دیا۔ ”مگر مجھے نہیں معلوم کہ میں کیا کروں۔ میرے پاس کوئی پلان نہیں ہے۔“

”میرے ساتھ سنگا پور چلو۔“
”نہیں۔“

تالیہ مراد نے سر اٹھایا۔ وہ جھونپڑے کے اندر بیٹھی تھی۔ سامنے داتن تھی۔ دونوں کے قبوے کی پیالیاں لالاب بھری تھیں۔

اسی بل تاؤ نے ریسٹوران کی بٹیاں مدھم کر دی تھیں۔

مرکزی دیوار ساری کی ساری اسکرین بن گئی تھی اور اس پر ایک منظر چلنے لگا تھا۔

ایک طویل سڑک کا کنارہ..... وہاں آگے ڈیڑھروں درختوں کی قطار..... ہلکی چلتی ہوا اور درختوں سے گرتے چیری بلازم کے گلابی اور سفید پھول..... کوئی مدھم سروں میں پیانو بجا رہا تھا.....

دیوار پہ نظر آئی سڑک کے کنارے پھولوں سے بھرتے جا رہے تھے۔
تالیہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”تم.....“

”جو دوست تھے ان کو بھی میری بے گناہی کا یقین نہیں آئے گا۔ اور جس کو آئے گا اس کی عمر ختم ہونے والی ہے۔ میں دوستوں کے معاملے میں بہت بد قسمت ہوں۔“ اور دروازے سے باہر نکلی گئی۔

ملاک کہ ساہل اس گھنے اندھیرے میں دیران بڑا تھا۔ چاند بادلوں میں چھپا تھا اور لہریں قدرے پر سکون تھیں۔ وہ ریت پہ کھڑی تھی ہڈ چھپے کرار کی تھی اور چھوٹے بال پولی میں مقید تھے۔ وہ خاموشی سے پانی کو دیکھ رہی تھی۔ لہریں لپک لپک کے آتیں اس کے پیروں کو بھگو دیتیں اور واپس پلٹ جاتیں۔ وہ اپنی حد سے چاہنے کے باوجود نہیں بڑھ سکتی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ پانی میں قدم آگے بڑھانے لگی۔ اس کے چہرے پہ عجیب سی بالائی تھی۔ دماغ جیسے کہیں دور اجماع تھا۔ خفے پانی میں ڈوبنے لگے۔ وہ جاتی گئی۔ آگے۔۔۔ اور آگے۔۔۔

”اب گھر جانے کا وقت ہے پتری تالیہ۔ اس سے پہلے کہ سورج نکلے اور تمہیں کوئی دیکھے۔“ کسی نے اس کو گہنی سے بکڑ کے رکھا تو تالیہ پتھر ہو گئی۔ پھر بے یقینی سے مڑی تو بوڑھا چادوگر سامنے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں دیسی چمکتی ہوئی تھیں اور چہرہ ساپ تھا۔

”تم۔۔۔ میرے پیچھے آرہے تھے؟“ وہ بھونکی رہ گئی تھی۔

”تم دوستوں کے معاملے میں بد قسمت نہیں ہو۔ تم ملاک کی شہزادی تالیہ ہو اور تم پولی واپس ہو کے اس پانی میں قدم نہیں رکھ سکتیں۔“ وہ درسی سے بولا تو وہ چند لمحوں پہ کچھ بول نہ سکی۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ریت پہ چلتے سڑک کی طرف جا رہے تھے۔

”تم بہت کیسے بارکتی ہو؟“ اس کی جلدی؟“ وہ سینے پہ بازو لپیٹے کندھے اچکا کے بولی۔

”میں۔۔۔ سوچنے کے لیے یہاں آئی تھی۔ میں صرف پانی میں کھڑے ہونا چاہتی تھی۔“

”تم پانی میں کھڑی نہیں ہو رہی تھیں، تم آگے

بڑھ رہی تھیں۔ بنا کچھ سوچے کچھ۔ اندھا حد۔“ اس کی طرف گھوا اور انفس سے اسے دیکھا۔ دوسری طرف دیکھنے لگی۔ ”کیا تمہارے سامنے اتنا بڑا پہاڑ ہے جس پر تم چڑھ نہ سکو؟“

”اس پہاڑ کو عبور کرنے کے لیے کوئی سڑک نہیں ہے ذوالکفلی! وہ ایک دم دبا دبا سا چینی۔ وہ دونوں آنے سامنے ریت پہ کھڑے تھے۔ سیاہ آسمان اور تاریک سمندر خاموشی سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

”تالیہ کے پاس تو ہمیشہ پلان ہوتا تھا۔“

”اب نہیں ہے۔ میرے پاس اب کچھ بھی نہیں ہے۔ سر چھپانے کو جگہ تک نہیں ہے۔ میرے دوست تک کھو گئے ہیں اور داتن۔۔۔ اس کی آنکھیں بھینکنے لگیں۔ ”داتن کو کیسے ہے۔ وہ مر رہی ہے اور میں اس کو بچا بھی نہیں سکتی۔ میں ایسی زندگی نہیں گزارنا چاہتی جس میں مجھے خوف کے سامنے تلے رہنا پڑے۔ میں تنگ آئی ہوں۔“

”تو اپنے خوف کو شکست دو۔“

”میں نے باج و دن قید میں کالے ہیں۔ قید میرا سب سے بڑا خوف ہے اور میں دوبارہ اس میں نہیں جاسکتی۔ میرے پاس چھپنے کے لیے بھی جگہ نہیں ہے۔ میں۔۔۔“ اس نے لپٹ کر پانی کو دیکھا۔

”میں اس سمندر میں چھپنے کے لیے جا رہی تھی۔ شاید یہ مجھے اپنے اندر پناہ دے۔“

”اگر میں نہ آتا تو۔۔۔“

”اگر تم نہ آتے، تب بھی میں واپس لپٹ جاتی۔ ڈوب کے مرنے میں سنا ہے بڑی تکلیف ہوتی ہے اور میں مزید تکلیف نہیں اٹھا سکتی۔“ وہ دشمنی سا مسکرائی۔

”تمہیں سمندر کی پناہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی ملاک میں پناہ گاہیں ختم نہیں ہوئیں۔“ وہ دبی سے بولا اور اسے پلٹے کا اشارہ کیا۔

فجر روشن ہو رہی تھی جب وہ دونوں واپس اس کے گھر میں داخل ہوئے۔ ذوالکفلی سیدھا راہداری

میں آگے آیا اور کونے سے میٹ ہٹایا۔ وہاں ایک لکڑی کا تختہ تھا جو فرش کا حصہ لگتا تھا۔ اس نے احتیاط سے اسے اٹھایا تو نیچے ایک ٹریپ ڈور تھا۔ ذوالکفلی نے اسے کھولا اور سر اٹھا کے تالیہ کو دیکھا۔ وہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”یہ کیا ہے؟“

”یہ وہ جگہ ہے جہاں تک کوئی پولیس نہیں پہنچ سکتی۔ تم یہاں جتنا عرصہ جا پورا ہو سکتی ہو۔ میں کسی کو ادھر داخل نہیں ہونے دیتا لیکن میں یہ بھی نہیں برداشت کر سکتا کہ تم سمندر میں پناہ ڈھونڈو۔“

تالیہ ایک قدم پیچھے کو ہٹی۔ اس کے چہرے پہ الجھن تھی۔ ”میں کسی قبر میں نہیں رہ سکتی۔ میرا سانس گھٹ جائے گا۔“

”اب تمہارے پاس کوئی بہتر پناہ گاہ ہے پتری تالیہ۔“ بوڑھا چادوگر پوچھ رہا تھا۔ اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

ٹریپ ڈور کے نیچے کلکڑی کا ایک زینہ بنا تھا۔ وہ اسے عبور کر کے پتھر پر پڑی تالیہ کو اندھیرے میں اتنا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک طویل ہال ہے۔ دیوار پہ بن چک رہے تھے۔ اس نے ایک بن دیا تو دم درویشیاں جل اٹھیں اور سارے ہال کو روشن کر گئیں۔ وہ ہال اتنا وسیع تھا جتنا کہ اوپر موجود ذوالکفلی کا سارا گھر۔ وہاں قطار در قطار کتابوں کے ریک رکھے تھے اور ان میں پرانے چمڑے کی جلد والی کتابیں بھی تھیں۔ وہ کتابوں کا ایک عظیم الشان مقبرہ تھا۔

”یہ سب کیا ہے؟“ وہ ہال کے دہانے پہ کھڑی حیرت سے بولی۔ ذوالکفلی زینہ اتر کے پیچھے آ رہا تھا۔ سادگی سے کندھے اچکا کے اور بتانے لگا،

”یہ ممنوع کتابیں ہیں۔ اکثر کاغذی پتھر سے بنے ہیں اور باقی دیگر علوم کی ہیں۔ جادو ان دیکھی طاقتیں۔ علم طب۔۔۔ یہ میرا ذخیرہ ہے۔ تمہارے کام کا نہیں ہے۔“ وہ اب دور میں کے درمیان سے گزر کے ہال کے دوسرے سرے تک آیا اور اسے کونے میں موجود ایک کمرہ دکھانے لگا جس کے اندر

ایک بیڈ تھا۔ ساتھ ایک چھوٹا کچن جس میں کچلی کا چولہا تھا۔ چھوٹا فریج، ہاتھ روم اور ایک اسٹڈی ٹیبل لگی۔ سمیت گویا پراسرار لائبریری کے اندر ایک شخص کی رہائش کا سارا اہندہ دست موجود تھا۔

تالیہ قدم قدم آگے بڑھنے لگی۔ دم دم زرد تپاں روشن ہوتی گئیں۔ ریس میں نئی کتابیں خاموشی سے اس کو دیکھ رہی تھیں۔ ان میں کرد کی بو بھی تھی اور کوئی عجیب سی ویرانی تھی۔

”تم یہاں آرام سے رہ سکتی ہو۔ تمہیں سمندر کی پناہ گاہ کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ مسکرا کے کہہ رہا تھا اور تالیہ بھی اداسی سے مسکرا دی تھی۔

کتابیں۔۔۔ ایک ایک دفعہ پھر اس کی پناہ گاہ بن گئی تھیں۔ خاموش دوست۔ محرم راز۔

قید کی ساسھی ہو۔

☆☆☆

تین دن بعد۔

دوپہر کے باوجود زیر زمین بنے کتب خانے میں نیم اندھرا اچھلا تھا۔ اس کے تین دن اسی حالت میں گزرے تھے، جو فی الوقت نظر آرہی تھی۔ کتب خانے کی دیوار میں موجود شیشے کا دروازہ کھلا تھا اور وہ اندر کمرے میں منسلک بیڈ سے نیم دراز تھی۔ ہینڈ زفری کانوں میں لگائے وہ موبائل دیکھ رہی تھی۔ ماتھے پہ تل تھے اور آنکھوں میں بے بسی بھرا غصہ تھا۔ لباس وہی تھا۔ اور اگلے اگلے ہال پولی میں بیٹھے تھے۔

موبائل پتروں کا ٹین چل رہا تھا۔

”تالیہ مراد جو کہ دان فارغ کی ایکس چیف آف اسٹاف بھی رہ چکی ہیں اس کیس میں مرکزی suspect ہیں۔ پولیس کے مطابق پتے تالیہ اس وقت لاپتا ہیں اور ان کی تلاش جاری ہے۔ اب ہم اس بارے میں اپنے پرنٹس سے بات کریں گے۔“ نیوز انکسٹراب اسٹول پگھوم کے اسٹوڈیو میں موجودا دی کی طرف متوجہ ہوئی۔

”آپ کے خیال میں پتے تالیہ کا عصرہ محمود کے قتل میں کیا موٹیو ہو سکتا ہے؟“ انکسٹراب نے پتے

سارے فیصلے سنا کے ملزم کو مجرم تصور کر چکے تھے۔
دانشور تجزیہ نگار نے ٹھکانے کے گھاسا صاف کیا۔
”دیکھیں اگر یہ کل تالیف مراد نے کیا ہے تو
صاف ظاہر ہے۔ عصرہ محمود بی این کی واکس چیئر پر سن
تھیں۔ ان کی جگہ لینے کے لیے۔۔۔۔۔“
”میرا خیال ہے کسی ذاتی رقابت کی وجہ
سے۔۔۔۔۔“ ایک کے بعد ایک تجزیہ نگار اپنی رائے کا
اظہار کر رہا تھا۔

اس نے زور سے ہن دیا کہ ویڈیو بند کی۔
پھر پیچھے گئی تو اشعر محمود کی ویڈیو کل گئی۔ وہ اپنے
آکس میں بیٹھا رپورٹرز سے بات کر رہا تھا۔
”ظاہر ہے میری بہن کی جان تالیف مراد نے
لی لی ہے۔“ وہ غوغت اور برہمی سے کہہ رہا تھا۔
”میں پولیس کو بتا چکا ہوں اور بار بار سب کو یاد کروانا
رہوں گا کہ عصرہ محمود نے خود ہمیں متعدد بار وہ ایک
دکھائے تھے جو تالیف ان کو بھیجتی تھی۔“ سرد انداز میں
بھرا لہجہ۔ تالیف نے لب کاٹنے ہوئے دیکھا۔ اگلی
ویڈیو وان فارغ کی گئی۔

وہ چند افراد کی معیت میں کار کی طرف جاتا
دکھائی دے رہا تھا۔ تیز ہوا سے اس کی ٹائی بار بار
پیچھے کو اڑتی۔ وہ ٹائی ہون لگتا بھول گیا تھا۔ شاید کوئی
یاد کروانے والا موجود نہیں تھا۔ چہرہ ساٹ تھا مگر
افرد لگتا تھا۔

ماتیک پکڑے رپورٹرز کا جھوم اس کے سامنے
اٹنے قدموں چلنا پیچھے کو آ رہا تھا۔ وہ سب کار
پارکنگ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

”سر۔۔۔ میڈیکل رپورٹ کے مطابق آپ
کے جسم سے بھی آرسینک ملا ہے مگر اس کی مقدار بے
ضرر ہے۔ کیا یہ اس لیے ہے کہ آپ نے ایک کم
تعداد میں کھا ہے؟“

وہ کار کے قریب رکھا اور ساٹ سے انداز میں
رپورٹرز کو دیکھا۔

”میں آن گوینگ تفتیش کے بارے میں
رائے نہیں دے سکتا۔ یہ پولیس کا کام ہے کہ وہ

حقائق سامنے لائے۔“

”سر۔۔۔ تالیف مراد کا آپ کی بیوی کو مارنے کے
پیچھے کیا مقصد ہو سکتا تھا؟“

فاتح نے دروازے پر ہاتھ رکھے اسی ٹھنڈے
تاثر کے ساتھ رپورٹرز کو دیکھا۔

”یہ تالیف نے نہیں کیا۔ پولیس اپنی نا اہلی
چھپانے کے لیے ایک بے گناہ لڑکی کو مجرم بنانے کے پیش
کر رہی ہے۔ اور اگر بالفرض وہ وہی اس میں ملوث
ہے تب بھی عدالت کے فیصلے تک ہم ملزم کو بے گناہ
تصور کرتے ہیں۔ اس لڑکی کا میڈیا ٹرائل بند کر دیا
جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔“ وہ برہم ہوا تھا۔ ایک
رپورٹرنے پیچھے سے پکارا۔

”سر اگر ایسا ہے تو تالیف مراد سامنے آ کے اپنی
بے گناہی ثابت کیوں نہیں کر دیتی؟ وہ روپوش کیوں
ہیں؟“

وان فاتح نے ابرو اچکائے۔ ”ہمیں نہیں
معلوم کون کس وقت کس مسئلے میں چبھتا ہو مگر مجھے
یقین ہے کہ وہ جلد ہی سامنے آ کے خود کو ان الزام
سے بری کر والے گی۔“ اور ہاتھ کے اشارے سے
”بس“ کہہ کے وہ کار میں بیٹھنے لگا۔

”سر۔۔۔ آپ ان کے پاس رہے ہیں۔ کیا انہوں
نے آپ سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی؟“ کسی نے
سوال کیا تھا۔ فاتح نے ہن لیا تھا مگر اس نے دروازہ بند کر
دیا اور ڈرائیور کو چلنے کا اشارہ کر دیا۔ البتہ اس سوال پر بھی
دفعہ اس کے ساٹ تاثرات میں دروازہ کی دکھائی دی
تھی۔ جیسے وہ ڈسٹرب ہوا ہو۔ جیسے وہ اداں ہوا ہو۔ اور پھر
کار آگے بڑھ کر اور ویڈیو ختم ہو گئی۔

تالیف کی آنکھیں جھپکنے لگیں۔ اس نے فون رکھا
اور پینڈ زفری کانوں سے فوج اتارے۔ وہ گزشتہ
تین دن سے خبر ہی نہ دیکھ رہی تھی۔ سارا ملک اس کو
قاتل کہہ رہا تھا۔ نیو فوری کتاب سے بنائی چند دن کی
شہرت ماند پڑ گئی تھی اور اب وہ عصرہ محمود کی قاتل اور
ایک Fugitive بن کر رہ گئی تھی۔

اس نے ٹھنٹوں کے گرد بازو لپیٹ لیے اور

لوہڑی ان پہ جمادی۔ جیسے کتابوں کے اس دبران
مقبرے میں وہ خود کو اپنے ہی گلے سے لگائے محفوظ
کرنا چاہ رہی ہو۔

خوف اور بے بسی پر مبنی جاری تھی۔ مگر ایک
بات طے تھی۔ تالیف بھی دوبارہ پولیس کی پہنچ میں نہیں
جائے گی۔ وہ اب کسی نئی جیل کی سیل میں ہو سکتی تھی
وہ ان کے ہاتھ دوبارہ نہیں آ سکتی تھی۔

سامنے رکھے بک ٹیبلٹ پر ایک کتاب ترغیب
دلانے والے انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے
گہرے نیلے وردق کے سفید سفید الفاظ جگا رہے تھے۔
”خودکشی کرنے کے لیے تین تین لیس زہر۔“
وہ چپ چاپ اس کتاب کو دیکھنے لگی۔

کوئی ٹھک نہیں کہ وہ کتابیں ممنوعہ تھیں۔ اس
نے آنکھیں بندیں تو پھر اس دن کی یادان کے
سامنے ابھری۔

وہ ریسٹوران کے مصنوعی چھو پڑے میں داتن
کے سامنے بیٹھی تھی۔۔۔۔۔
اسی بل تاؤ کے ہتھان مدھم کی تھیں۔۔۔۔۔ اور خالی
دیوار پر ایک منظر چلنے لگا تھا۔۔۔۔۔

سڑک کنارے درختوں کی قطار۔۔۔۔۔ اور نیچے
گھاس پہ گلابی سفید چیری پلاس کے پھولوں کی پھٹی
تہ۔۔۔۔۔ ہوا چل رہی تھی اور پھول گرتے جا رہے
تھے۔۔۔۔۔

”تم۔۔۔ تم ٹھیک ہو ذات؟“
فصاحاں جھپکنے تنے کی مہک تھی۔ اور شورو کا
شور بھی۔ قبوے سے بھری پیالوں سے بھاپ اٹھ
رہی تھی۔

”یہ کینسر کی دوا ہے اور یہ بول تمہاری ہے۔ تم
کینسر کی دوا کیوں لے رہی ہو؟“

پانورک گیا۔ جھپکنے تنے کا شور خاموش ہو گیا۔
”تم کس کے برٹ ہو گی۔ اسی لیے میں نے تم
سے چھپایا۔“

پانورک تیز ہو گیا۔ کاؤنٹر پر کھڑا تاؤ ٹھک ٹھک
سوٹی رول کو چھڑے سے کاٹنے لگا۔ دیوار پر ابھی تک

پھول گرتے نظر آ رہے تھے۔ اور سوٹی رول کٹنے کی
آوازیں۔۔۔۔۔ ٹھک ٹھک ٹھک۔۔۔۔۔

تالیف نے آنکھیں کھولیں۔ وہ کتابوں کے
مقبرے میں بیٹھی تھی اور اس کے سامنے وہی بے نادرد
کے مادے دیے والی زہریلے نگوں کی کتاب مسخرے
اسے دیکھ رہی تھی۔

بالآخر تالیف نے ہاتھ بڑھایا اور دھڑکتے دل
سے اس کتاب کو اٹھالیا۔ ایسا زہر جو درد نہ دے۔۔۔ کیا
بہی اس کا آخری راستہ ہو سکتا تھا؟ آخری پناہ گاہ؟
(بائی آئیندہ ماہ)

دنیاسمجھنے سیکھنے کی تیاری ادب

عمران ڈائجسٹ

Email: id@khawateendigest.com

فروری 2020 کے شمارے کی ایک نمونہ



مرحبا

معاشرے میں عداوتیں اب بھی وہی کج رسم کا مظہر ہیں۔

اس راحت کے خلاف صیبا ہبشار کی کہانی کی اچھی اور آخری کڑی۔

روشنی کی چوری

شریں جلی توں کو کھیلانے والوں کا اسی ٹھکانہ ہے جہاں کج رسم کا مظہر ہے۔

اس کی علامت دیس دیس کی روایتیں، مسکین اور کج رسم کا مظہر ہیں۔

فروری 2020 کا شمارے

رکستہ کشتی ہائیں



پاکستان سے رشابھائی کا فون تھا! ”آپ کب آ رہی ہیں، دس ماہ ہو گئے آپ سے ملاقات نہیں ہوئی۔“

”ابھی تو نہیں سوچا۔“ ہم نے کہا۔

”کیوں؟ اتنا وقفہ تو کبھی بھی نہیں آیا۔ آجائیں، ہم اداس ہیں۔“

ہم سے کچھ کہا نہیں گیا۔

کیسے بتاؤں کہ میرے مدار کی کشش کھو گئی ہے۔ وہ جو تڑپتی تھی، وہ نہیں رہی۔

بچپن میں جب بھی اسکول سے گھر پہنچتے، داخل ہوتے ہی آواز دیتے، اماں آپ کہاں ہیں؟ میں آگئی۔ ایک شٹلے سے سائے جیسی مہربان آواز جواب دیتی۔

”جیتی رہو میری بیٹی، ہاتھ منہ دھو کے آؤ فوراً، تمہاری پسند کا کھانا بنایا ہے۔“

یہ معمول سا لہا سال رہا، نہ ہماری پکار بدلی اور نہ ہی جوانی بیا بھری نظر۔

زندگی بدلی اور ہمارا ٹھکانہ لاہور میں میڈیکل کالج کا ہاسٹل ٹھہرا۔ ہر ماہ کے آخر میں گھر جاتے۔ پہلے سے بتایا ہوتا کہ فلاں شام کی ریل سے پٹری چڑھوں گی۔ بھائی انٹیشن پہ لیتے آتا، گھر قریب آتا جاتا اور بدی کی طلب بڑھتی جاتی۔ حسب توقع اماں گیٹ پہ ملتیں۔ میری وہی پکار، اماں! میں آگئی اور وہی جواب۔

”جیتی رہو، ماں کب سے انتظار کر رہی تھی تمہاری پسند کا کھانا بنایا ہے، چلو نہا دھو کے کپڑے بدل لو۔“ اور یہ سب ہم نے باجی برس مسلسل کیا۔

وقت اور گزرا۔ ڈاکٹر بننے کے بعد شادی ہو گئی اور ہم صاحب کے ساتھ فوجی زندگی گزارنے پاکستان پاؤں۔

وقت کا پہرہ گھومتا رہا اور اب ہم ملک سے باہر تھے۔ ابا رخصت ہو چکے تھے سو اماں کے ہمارے پاس رہنے میں کوئی قدرشن نہیں تھی۔ ہم ہسپتال گئے جب گھر آئے، اماں اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھی ملتیں۔ ہم برسوں پرانی گرم چوٹی سے لہک کے سلام کرتے اور وہ وہی گرمیوں کی آبی ٹھیں۔ نہ اماں بدلتی اور نہ ہی ہم۔ لیکن کتاب نقدیر نے کسی اور بدلاؤ کا سوچ رکھا تھا۔ زندگی کا وہ حصہ اختتام کو پہنچے تو تھا اور اماں ایک نئے سفر پر روانہ ہو کے بدلنے لگا آغا ز کچا نہیں۔ وہ ایک ایسی کہانی لکھنے جاری تھیں جس کے بیشتر ورق خالی تھے، ان کے پاس کچھ کہنے کو بچایا نہیں تھا۔

اماں الٹرا جیسے موڑی مرض کا شکار ہوئیں اور سب کچھ بھول گئیں۔ وہ خاطر داریاں اور دل داریاں سب خواب ہوئیں۔ اب وہ اماں کی پرچھائی تھی۔

مرض اتنا بڑھا کہ باجی سال پہلے اماں کا ہمارے پاس آنا ختم ہو گیا۔ ہمیں تو اماں کا چہرہ دیکھنے اور محبت سے سیراب ہونے کی عادت تھی سو یہ کیسے ممکن تھا کہ اس میں خلل آتا۔ اماں کا آنا حال تھا، ہمارا جانا تو نہیں۔ اماں محبت کے درس بھول چکی تھیں، ہم تو نہیں۔ وہ کسی اور راہ کی بھول جلیں میں کھو چکی تھیں، ہم تو ہیں جو کھڑے تھے اماں کی اگلی قاعدے۔

ہمارے ہسپتال کا قاعدہ ہے کہ انٹل برس کی چھٹی کا پروگرام کرنے والے برس کے دسمبر میں مانگ لیا جاتا ہے تاکہ ہر کسی کی چھٹی شیڈول میں ڈالی جاسکے۔ ہم نے باجی برس پہلے یہ سوچا کہ ہم ہر تین ماہ بعد ایک ہفتے کے لیے پاکستان جائیں گے اماں کے ساتھ چھٹی گزاریں گے، سو ہم نے یہی کیا۔

ہمارے سب ساتھیوں کو علم تھا کہ زندگی میں کسی ہی اچھل پھل کیوں نہ ہو، ہم ہر تین ماہ بعد پاکستان ضرور جائیں گے۔ صاحب، بیٹے، بہن بھائی سب ہمارے پروگرام سے آگاہ ہوتے۔ بعض دفعہ ہم پورے سال کے لیے ایک

ضائع نہ کر۔

اور پھر بالآخر وہ دن آن پہنچا۔ اماں نے ہم سے منہ پھیر کے رب کائنات کے بلاوے پہ لبیک کہا۔ اماں نے دنیا چھوڑی اور ہم نے اماں کے رخصت ہونے کے ایک ہفتے بعد ملک چھوڑ دیا۔

واپس آئے، چھٹی کا شیڈول دیکھا۔ 2019 میں جنوری، اپریل، اگست اور نومبر میں چھٹی منظور ہو چکی تھی۔

جنوری کی چھٹی میں اماں سے آخری ملاقات درحقیقت ہو چکی تھی۔ سوچا، اب یہ اپریل، اگست اور نومبر کا کیا کریں؟ کشش کا مدار نوٹ چکا تھا، وہ جو ایک قوت کھینچتی تھی، آسمان کی وسعتوں میں کم ہو چکی تھی۔ اب کس کے لیے؟ کس کے لیے؟ ہم نے اسے آپ سے سوال کیا۔ کہیں کوئی جواب نہیں تھا، اپنی ہی آواز کی بازگشت تھی۔

چھٹی کینسل کروانے کی درخواست دے دی۔ خریدے ہوئے ٹکٹ کینسل کروا دیے۔ وہ سفر، وہ ملاقاتیں، ماضی کا حصہ بننے جاری تھیں۔

دس ماہ گزر چکے، شبنم سے باپاں! رضا بھائی اور فائزہ بھائی کا کہنا ہے کہ ان کے گھر سے اماں کی رخصتی کے ساتھ سب روٹیں بھی رخصت ہو گئیں۔ وہ جو اماں کی عیادت کے لیے آتے تھے، نہیں آتے۔ جو چاہت میں آتے تھے ان کا مدار نوٹ کیا۔

ڈبل چیئر خالی ہے۔ اگر کم ہاں میں بھی تو دروازہ کھلے۔ وہ نور رحمت بھرا چہرا اڑھیں ہوگا۔ لیکن پھر سوچتے ہیں کہ شاید نہیں اور پھر سے دور ایک خاموش ہستی میں کسی کو انتظار ہو۔ کسی کا دل چاہتا ہو کوئی آئے، چھوٹوں کی چادر چڑھائے اور اسی طرح لپک کے نکالے۔

”اماں! میں آگئی۔“
اور پر سکون موٹی اماں مسکرائیں اور رب کہیں۔
”اتنی دیر لگا دی، میں کب سے انتظار کر رہی تھی۔“
”میں ٹریول ایجنٹ کو فون کر رہی ہوں۔“

ہی دفعہ میں چار لکھ خرید لیے، ہر تین ماہ بعد ایک بار۔ ہم ایئر پورٹ اترتے، بھائی موجود ہوتا۔ گھر پہنچتے تک وہی کیفیت ہوتی، جو برسوں پرانی تھی۔ دروازہ کھلتا، ڈبل چیئر نظر آتی اور ڈبل چیئر پہ وہی مہمان شفقت بھرا چہرا۔ ہم اسی داری سے ملتے، وہ ہاتھ چومیں، بھی پچا نہیں، بھی نہیں۔ لیکن اس وجود کی موجودگی اور آغوش کی گرمی دل کو گلورے لینے پہ مجبور کرتی اور محبت کے نرم گرم احساس سے بھر دیتی۔

☆☆☆

ہماری موجودگی میں دوست احباب ملتے آتے۔ امی اپنی ڈبل چیئر پہ اپنی دنیا میں کم اور ہم ان کا ہاتھ تھامے کزنز سے ٹوک جھونک میں مصروف۔ سب ہمارے اتنی جلد لاہور آنے پہ جملہ بازی کرتے۔ رضا کہتے۔ ”میں تو باجی کے بچھلی دفعہ کے دن کے بعد سے ابھی تک بھائی تک بھی نہیں گیا تھا کہ باجی پھر آئیں۔ شفقت کہتے۔ ”جی جی بتائیے، آپ پھیری کا کام تو نہیں کرتیں کہ وہی اسی طرح بار بار پھر لگاتے ہیں اور اگر کرتی ہیں تو کیا لاتی ہیں۔“

ہم سب کی باتیں سن کے تھک لگتے اور کہتے اب میں تم لوگوں کو بزنس سکرت تو بتانے سے رہی۔ ایک دفعہ ایسے ہی کسی غناک کے دوران ہم نے گولڈ کی کچھ چیزیں بیگ سے نکال کے دکھادیں جو ہماری ایک دوست نے منگوائی تھیں۔ شفقت کے چہرے پہ چلتی چرائی اور پشیمانی اور باقیوں کے فلک صاف تھیں ہم آج تک نہیں بھول سکے۔

اماں اس دوران کھوٹی کھوٹی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی رہتیں۔ اگر یاد کا کوئی جگنو کہیں چمک اٹھتا تو وہ اب کی کوئی بات کرتیں یا اپنی ماں کو یاد کرتیں اور بچپن کی کوئی بات سناتیں۔

☆☆☆

پانچ برس بیت گئے ہمیں آتے جاتے، سفر کرتے، پاکستان کے سارے موسم دیکھتے، لیکن اماں سے ملنے کی ہر کوشش ختم نہ ہوئی۔ ہر دفعہ وہی اشتیاق وہی

طلب۔ ذہن میں ایک خیال ضرور ہوتا کہ نہ جانے کب یہ چاند چہرہ اوچھل ہو جائے گا؟ نہ جانے کتنی سہلت باقی ہے؟ سو اسے دل بے تاب، دیدار کرنے کا کوئی موقع

اے دل بے خبر،

اس کڑے وقت میں

کون تیرے سنگ ہے؟

کس کے ہاتھوں میں سنگ ہے

کون دشمن تیرا؟

کون سا بن تیرا؟

کون تیری ہنسی کا طلب گار ہے

کون تجھ کو دل لانے کو تیار ہے

اے دل خوش فہم

کچھ پتا ہے تجھے، کیا گم ہے تجھے

تو ہر اک بات سے ہے بے گار، مسایکوں

زندگی کی حقیقت فسانہ ہے کیوں؟

اے دل خوش فہم

اے دل بے خبر

ہے کوئی چارہ گر

اے دل بے خبر!!

سباں گل

یہ مدارات اہل دفا کر گئے

محفل گل میں یادیدہ تر گئے

ہم تو کترا کے گزے، مگر کیا کریں

داتے سب کے سب آپ کے گھر گئے

میری کم آشنائی، تیسری بے زنی

سارے الزام تقدیر کے سر گئے

آپ کو کیا خبر، آپ کو کیا پتا

وہ بھی تھے لوگ جو جیتے جی مر گئے

اہل دانش میں دم دفا بزمِ نعتی

لوگ دالتہ بزمِ وفا کر گئے

زندگی کی رگوں کو لہو بخش کر

اہل دل فرض اپنا ادا کر گئے

ادا جمعری



بات پھوٹوں کی سنا کرتے تھے
ہم کبھی شاعر کہا کرتے تھے

اب کوئی اور تمنا ہے عذاب دل و جان
اب کسی حرف میں ٹوہے نہ تری ذات کا دکھ
ہم اندھیروں میں چلا کرتے تھے

اب کہاں ایسی طبیعت والے
جوٹ کھا کر جو دعا کرتے تھے

ترک احساس محبت مشکل
ہاں مگر اہل وفا کرتے تھے

بکھری بکھری ہوئی زلفوں والے
قافلے روک لیا کرتے تھے

آج گلشن میں شگوفے ساغر
شکوہ باد صبا کرتے تھے

ساغر صدیقی

شکستہ جگہ



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،
”جس شخص نے مسلمانوں پر غلہ (مہنگا کرنے کے
لیے روک رکھا تو وہ گنہگار ہے“
حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ روایت
کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ
ارشاد فرماتے ہوئے سنا۔

”جو شخص مسلمانوں کا غلہ (کھانے پینے کی چیزوں کو)
روک رکھے، یعنی باوجود ضرورت کے فروخت نہ
کرے، اللہ تعالیٰ اس پر کوڑھ اور تنگ دستی کو مسلط
فرمادیتے ہیں“ (ابن ماجہ)
ف۔ روک رکھنے والے سے وہ شخص مراد ہے جو لوگوں
کی ضرورت کے وقت ہنگامی کے انتظار میں غلہ روک
رکھے جبکہ غلہ عام طور پر نہ مل رہا ہو۔

رشتوں کی خوبصورتی،
”رشتوں کی خوبصورتی ایک دوسرے کی بات کو
برداشت کرنے میں ہے۔ بے عیب انسان تلاش کرو
گے تو ایسے مل رہے جائیں گے“
(حضرت علیؓ)

مستحق حسین تارڑ،
بینیوں کی کوخیز ہوئی ہے۔ یہ تو چشم کے شجر ہوئی
ہیں۔ پانی نہ بھی ملے تو دھرتی کی کوکھ میں سے بھی جوس
کر دھڑکا تھی جاتی ہیں۔ پریشے تو دھان کا کھیت، ہونے
ہیں جن کی مسلسل آبیاری نہ کی جائے تو وہ مرجھا جاتے
ہیں۔ ان میں فانی بھی نہیں پڑتا۔
(شخص و عاشق زمانے)

آپ کتے باکرہ دار ہیں،

* اگر آپ کسی بھول میں پائے جیتے ہوئے عام طور
پر گھر پر جانے پینے کی نسبت زیادہ پیہنی ڈالتے
ہیں تو آپ کے بد عنوان اگر بیٹ ہوئے کے
امکانات ہیں۔

* اگر آپ ہلکے دامن روم میں گھر کی نسبت زیادہ
نوش پیرا یا استعمال کرتے ہیں تو آپ کے اندر ایک
چور تھا بیٹھا ہے کہ اگر آپ کو کوئی موقع مل گیا
تو آپ مزدور جوری کریں گے۔

* اگر آپ اپنی بیٹی میں محبوب سے زیادہ محض
اس لیے کھانا ڈالتے ہیں کہ اس کا دل کسی دوسرے
کی جیب سے جا رہا ہے تو آپ لالچی ہیں۔

* اگر عام طور پر آپ غلط توڑ کر کھانے کی کوشش
کرتے ہیں تو اگر آپ کو کوئی طاقت و وجہ
دیا جائے تو اس بات کا پورا امکان ہے کہ آپ
اپنی حیثیت کا ناجائز فائدہ اٹھائیں گے۔

* اگر عام طور پر بیٹھ جاکر آپ قطار توڑ کر
دوسری گاڑیوں کے اندر گھسنے کی کوشش کرتے
ہیں تو آپ کو کبھی سرکاری پیسے کا رکھوالا بنایا جائے
تو اس بات کا پورا امکان ہے کہ آپ اس میں
غبن کے مرتکب ہوں گے، کیونکہ آپ کو قوانین و
ضوابط پر عمل سے نفرت ہے۔

* اگر آپ اپنے گھر کے گندے مانی کا بہتر انتظام
کرنے نہ سمجھتے ہیں تو اس کا رخ دوسرے کے گھر کی
طرف کر دیتے ہیں تو آپ کو معاشرتی آداب
معلوم نہیں۔

* اگر آپ حیران ہیں کہ اس پورٹ کو زیر بحث
لانے کی کیا ضرورت ہے تو آپ بددیانت

ہیں۔ آپ اپنے فائدے کی عزت سے بڑی آسانی سے معاشرے میں خیریاں پیدا کر دیں گے۔
آئیے جہاں بھی موقع ہے ہم خود یا کردار انسان بننے کی کوشش کریں۔۔۔!

مشکل کام،

جب امریکہ میں غلامی اپنے عروج پر تھی، تو ایک ہنسٹ نامی قانون نے خفیہ تنظیم بنائی، جو غلاموں کو بھاگ ملنے میں مدد کرتی تھی۔ ایک ایسا قانون سے پوچھا گیا کہ تمہارے مشن میں سب سے مشکل مرحلہ کون سا ہوتا تھا تو اس نے کہا۔
”غلام کو ترغیب دینا کہ تم غلام نہیں ہو، بھاگ سکتے ہو۔“

کچھ اچھی باتیں،

۱۔ ہزاروں میل لمبا سفر ایک قدم سے شروع ہوتا ہے۔
۲۔ اگر کسی کے دل کی خوشی آپ سے وابستہ ہے تو یقین کیجئے آپ کا وجود قابل رشک ہے۔
۳۔ کتنی افسوس ناک بات ہے کہ انسان کے حسین ترین ہندیات بھی میرے سے وابستہ ہیں۔
۴۔ مشکلات کا پتھر رات سے جو پیرا لگتا ہے،

وہ کامیابی ہے۔
۵۔ جب کوئی آزمائش شروع ہوتی ہے تو اس وقت تک صبر نہیں ہوتی جب تک اس میں کوئی نہ سیکھا جائے جو اس میں پوشیدہ ہوتا ہے۔
۶۔ عورت اگر خوبصورت نظر آنا چاہتی ہے تو اسے چاہیے کہ وہ نظری نہ ڈالے۔
۷۔ محنت کے مادی لوگ لہجوں کی سختیاں برداشت نہیں کر سکتے۔

ملارہ نذیر۔ بھاگ لڑالہ

تفریح،

ایک مری سلیزین کاروباری دودھ سے پر تھا۔ راستے میں اسے ایک گاڑی میں دیکھا۔ گاڑی کا کام

سے خارج ہو کر شام کو اس نے سوا کر کچھ تفریح کی۔ ملے۔ اس نے ایک عوامی دہائی سے پوچھا۔
”پہلا کوئی سنا ہے؟“
”نہیں“ دہائی نے جواب دیا۔
کوئی تفریح وغیرہ ہے، جہاں آدمی جا کر کوئی ڈراما یا شو وغیرہ دیکھے؟“
”نہیں جناب“ دہائی نے نفی میں سر ہلایا۔
”حیرت ہے“ پھر تم لوگ تفریح کیسے کرتے ہو؟“
شہری سلیزین نے پوچھا۔
”میری سوہ بازدار میں ایک محلے کا خانہ ہے۔ ہم وہاں جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ وہاں کوئی نہ کوئی شہری باور آکر بیٹھا ہوتا ہے۔ ہم اسے دیکھتے ہیں۔ بس یہی ہماری تفریح ہے۔“

ایشال فاطمہ کراچی

توقعات،

توقعات کا بھی عجیب مسئلہ ہے۔ یہ پوری چھٹی اگست والی فصل ہے۔ ایک بچہ کراچی کی ساری کیمپری بھر جاتی ہے۔ انسان کو لگتا ہے کہ وہ کوئی توقع نہیں ادا اندری اندر کوئی توقعات وابستہ ہوتی ہیں۔

(بالقدسیہ)

اتنی سی بات،

پہاڑی علاقے کی ایک نہایت ضعیف عورت کو ایک چھڑے کے سلسلے میں گواہ کے طور پر عدالت میں پیش کیا گیا تو جج صاحب نے پوچھا۔
”آپ اس چھڑے کے سلسلے میں کیا باتیں ہیں؟“
”ایسی کوئی خاص بات تو نہیں مجھے“ چھڑیوں بھرے چہرے والی خاتون نے بہم سا جواب دیا۔
”پھر بھی آپ بتائیے تو یہی...“ آپ نے کیا دیکھا، جج نے اصرار کیا۔
”ایسی کوئی خاص بات نہیں مجھے“ ججی نے بری بی نے ایک بار پھر بے پروائی سے ہاتھ ہلا کر کہا۔ بس ادھر عجب گلے شہباز خان کو بھجوا دیا تو شہباز خان نے عجب گلے کے سر پر ہنڈا مارا۔ عجب گلے ادھر گلے کھنڈا ہو گیا۔

عجب گلے کا دوست ادھر کھنڈا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ عجب گلے گریباں تو اس نے خیر نکال کر شہباز خان کا پیٹ مچا دیا۔ ادھر شہباز خان کا دوست بھی موجود تھا۔ اس نے جب یہ دیکھا تو کوئی چلا کر عجب گلے کے دوست کو مار دیا۔ اس بات پس میں دو تین آدمی مر گئے۔ پس اتنی سی بات پر چھڑا شروع ہو گیا۔
نمرہ، اقرار۔ کراچی

نیر تریت،

نوجوان صاحبزادے نے نئی نئی گاڑی خریدی اور ابھی ڈرائیونگ سیکھ ہی رہے تھے کہ ایک دوست اصرار کر کے والد صاحب کو ساتھ بٹھا کر لے گئے۔ کچھ فاصلے کرنے کے بعد صاحبزادے نے گویا مکان لگا کر سننے کے بعد والد صاحب کو مخاطب کیا۔
”ابا جی! آپ یہ ٹھک ٹھک کی آواز سن رہے ہیں...“ نیر تریت اصرار کر کے اس گاڑی کے رنگ پٹنی خراب ہیں یا کوئی اور مسئلہ ہے؟
”یہ رنگتے چلن کی آواز نہیں ہیں بیٹا۔“ والد صاحب نے اپنی سی کراہ کے ساتھ جواب دیا۔ بلکہ جس طرح غم بار بار ایک لگا رہے ہو اس کی وجہ سے میرے کھنڈے ذیلیں بوڑھے مگرا رہے ہیں۔ یہ ان کی آوازیں ہیں“

فاطمہ، تحویم۔ گوجرہ

بہتر سے بہتر،

زندگی تب بہتر ہوتی ہے جب آپ خوش ہوتے ہیں لیکن زندگی تب بہترین ہوتی ہے جب آپ کسی وجہ سے کوئی دوسرا خوش ہوتا ہے۔

نازاضی،

اللہ کے خوف سے تنہائی میں رونے کے سوا کوئی بھی چیز نہ ان کی نازاضی نہیں مٹا سکتی۔

ذہانت،

امام شافعی کا قول ہے کہ ذہانت میں چار چیزوں سے اضافہ ہوتا ہے۔
۱۔ فضول گفت کو چھوڑنا۔

۲۔ سوا کرنا (پرہیز سے پہلے)
۳۔ نیک لوگوں کی صحبت میں بیٹھنا۔
۴۔ علما کی مجلسوں میں بیٹھنا۔

بیویوں کے طعنے،

بیویوں کے چند معروف طعنے اور طعنے۔ جو تاریخ میں سترہ الفاظ ہیں لکھے جائیں گے۔
۱۔ آپ کے سارے بھائی اتنے چالاک ہیں۔ آپ کیوں اتنے بے وقوف ہیں۔
۲۔ سارے گھنے آپ نے تو ڈھونڈ کر بر باد کر دیے ہیں۔
۳۔ آپ کے بھوکھ والوں نے کبھی مجھے ہوسلم نہیں کیا۔
۴۔ آپ کبھی میری بات نہیں مانتے۔
۵۔ میری طبیعت اتنی خراب ہے لیکن آپ کو تو پرواہ ہی نہیں۔
۶۔ مجھے میری بات نہیں مانتے اور آپ انہیں کچھ نہیں سمجھتے۔
۷۔ مجھے لگتا ہے میں کوئی ناخوشیز ہوں۔
۸۔ دلے کیا سوچ کر ڈی کی حق مجھے ہے؟
۹۔ شادی سے پہلے تو ایسے نہیں تھے آپ۔
۱۰۔ کتنے دن سے آپ نے مجھ سے حال ہی نہیں پوچھا۔
۱۱۔ بندہ خوش کرنے کے لیے ہی کہہ دیتا ہے کہ جو دل کرے مانگ لو آج۔
۱۲۔ میں آپ کے فائدے کے لیے ہی سمجھتی ہوں۔
۱۳۔ میں بھی آگے سے بولی ہوں۔
۱۴۔ میں جب بات کر رہی ہوں تو میری طرف دیکھا کریں۔
۱۵۔ اپنی دغا آپ کو بڑا غصہ آتا ہے۔
۱۶۔ آپ نے مجھے کبھی کبھی کو خوش نہیں کیا۔
۱۷۔ بس اپنی مرضی کیا کریں، بندہ مشورہ تو کر لیتا ہے۔
۱۸۔ کرنی تو آپ نے اپنی مرضی ہوتی ہے اس لیے مجھ سے مت پوچھا کریں۔
۱۹۔ آپ کے بھائی ہر بہت میں بیویوں سے مشورہ کرتے ہیں اور ایک آپ ہیں؟
۲۰۔ مندرجہ بالا باتوں کو ہنسی مذاق تک محدود رکھا جائے۔ ورنہ نتائج آپ خود سہرا ہوں گے۔

اس کے لیے مبارک باد۔ آپ کو پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ بہت بھی کراچی آئیں ہم سے ضرور ملیں، لیکن دوپہر بارہ بجے کے بعد اور شام چوبیس بجے سے پہلے آئیں۔ آپ کے شوہر نے حوصلہ افزائی کی تو آپ کی ملازمتیں سامنے آئیں۔ بلاشبہ آپ کے شوہر کا ہم حراج ہو ناوار ہوئی کی پسندنا پسند کا خیال رکھنا، آپ کی خوش خمتی ہے۔ عزیز سید کے لیے آپ خط لکھ کر ہمیں بھجوا دیں ہم ان تک پہنچا دیں گے۔

ڈاکٹر فریال خان..... ڈی جی خان آج بارش ہے تو ذرا ایزی میچی ہوں۔ ایزی اس لیے کہ بارش کی وجہ سے مرلیض کم ہیں۔ مزے دار بات جیسے ہی نیا رسالہ پڑھنا شروع کروں گی، مرلیض بھی دھڑا دھڑا شروع ہو جائیں گے۔ جیسے سوراخ سے چھپ کے دیکھ رہے ہوں کہ جیسے ہی میں رسالہ نکالوں وہ پوچھوں گی طرح بلوں سے ٹکنا شروع لیکن پھر دل پر بیان رکھ کے مرلیض چپک کرتی ہوں۔ اچھا مجھے یہ بتائیں میں بھی کراچی نہیں آئی، نہ آپ نے بلایا، نہ فون کیا کہ آجاؤ۔ وہاں واقعی سردی نہیں ہوتی۔ یہاں ہماری روزگاری جتنی ہے، اب شکر یہ ادا کروں گی ام انعام کا جنہوں نے مجھے یاد کیا۔ آپ سے شکوہ کہ ایک بار بھی نہیں کراچی آیا کہاں ہو، آجاؤ جو کم سے۔ ہائے کتنا مزا آتا آپ کا یہ فقرہ پڑھ کر۔

مجھے یہ بتائیں یہ جو ہماری رائٹرز جتنے نئے سے ناول لکھتی ہیں، بس اتنی چھوٹی چھوٹی فکشن تھیں، کچھ زیادہ کھل کر۔ اتنے سال پہنچ جاتی ہیں۔ نمرہ جی۔ واہ کیا خوب لکھتی ہیں۔ حالم سے بہت سیکھا، کچھ خاص طور پر مضبوط بنا۔ خوش رہنا اور لوگوں سے ان کے مطابق ملنا اور لوگ کہتے ہیں فریال ڈھینٹ ہوئی ہے۔

”تعلی جیسا پیار“ منسوخ اچھا ہے لیکن بات پھر دہن آگئی ماں باپ کو دیکھ کر دینا۔ یار ماں باپ میں باپ کو اتنی تکلیف نہ دیا کریں یا پھر باپ اتنا شفیق نہ ہو۔ میرے دل کو کچھ نہ تھے۔ میں اپنے ابو کے ساتھ بہت اچھے ہوں۔ میں جب گھر جاؤں تو ان کے گلے گلے کے

ہیں پر سر رکھ کر ساتھ چوم کے، آنکھوں پر ہاتھ لگاؤں گا۔ ہاں کہتی ہیں۔ ہاں ہاں ہاں کچھ نہیں لگتی، میں نے کہا اس آپ کی وجہ سے تو اب میرے باپ بنے ہاں۔

”رنگ ریز میرے“ اس کا بھی میں ناگ اور کمال بھی بہت چھوٹی سی ہوتی ہے۔ مکمل ناول دونوں ہی اے کلاس۔ سب اچھا اچھا لکھ کر میں آپ کو امپریس کر کے لے کر کوشش کر رہی ہوں، پلیز ہو جائیں اور کہہ دیں ”ڈاکٹر فریال آپ ہمارے ادارے کے لیے بھی کچھ لکھیں۔“ یہی سچی ہے چارٹی کا دل خوش ہو جائے گا۔ عزیز سید سے ملاقات بہت اچھی رہی۔ ویسے ان کی تحریروں میں بہت کچھ کہنے کو ملتا ہے، ایک ان کی دوسرا نمرہ احمدی ہرگز ہر کو کم از کم بھی میں چار بار پڑھتی ہوں۔ نئی چیز بنتی ہے پڑھتے، کہنے کو سمجھنے کو۔

☆ پیاری فریال! اتنی خوش باش، خوش مزاج، ہنسنے ہنسانے والی ڈاکٹر کو تو دیکھ کر مرلیض تندرست ہو جائے۔ ہم تو پہلے ہی آپ سے بہت متاثر ہیں۔ آپ سب اچھا اچھا لکھ کر مزید متاثر کرنے کی کوشش نہ کریں۔ کہاں تک ملازمت کی بات ہے تو ہمیں لگتا ہے تو آپ کے لیے میں حراج لکھنے کی صلاحیت ہے، آپ کوئی بلی چھلکی کر لکھ کر بھجوا میں۔

والدین سے محبت تو فطری بات ہے لیکن ہمیں آپ کی یہ بات اچھی لگی کہ آپ اس محبت کا اظہار بھی کرتی ہیں۔ کسی سے محبت ہو تو زبان اور دودوں سے اس کا اظہار بہت ضروری ہے۔

ایک مشورہ دیں گے کہ اگر آپ حال میں پیٹھ کر سالے پڑھنا چھوڑ دیں، کسی کو غلط سلط دوا دیے تو بے چارے مرلیض تو مارے جائیں گے۔

ناہید اسماعیل..... کراچی نیا سال مبارک ہو۔ ویسے وطن عزیز کے حالات کو دیکھ کر رنجش تو مبارک کا لفظ ہانپنے کو دل کرتا ہے سروے میں بھی اسی لیے حصہ نہ لے سکے کہ پہلے سوال پڑی ایسے ایسے دل جلے جواب دل میں آئے کہ نہ ہی پوچھیں بہت کچھ کا پتا چاہتے تھے مگر وہ کیا ہے ہاں کہ خیالات کا جہم اتنا بڑھا کہ الفاظ کو رستہ نہ ملے والی صورت حال پیدا ہوگئی۔

کتنی سنی کی سطر سطر غور سے پڑھتے آگے بڑھے تو

جوراز ہے وہ ہم جان بھی سمجھتے وہ اس قدر فطری ماحول میں بیٹھ کر کھتی ہیں۔ رنگ رنگ پھول تو ہمیشہ اچھا ہوتا ہے۔ یاد رہی خانہ میں گڑ بارانیت اچھی سلیقہ مند لگیں۔ نفسیاتی انجینئرس میں مسا اقبال صاحب کی بیٹی کے لیے دعا گو ہیں شائستہ انجم کو بھی عدنان بھائی نے بہت اچھا سمجھایا۔

وج: پیاری ناہید! افسانہ زرخیز میری قرۃ العین خرم ہاشمی کا تھا پھر افسانے پر شاز یہ الطاف ہاشمی کا نام لگ گیا۔ اس سہو کے لیے ہم بہن قرۃ العین خرم ہاشمی سے معذرت خواہ ہیں۔

آپ کا تبصرہ تو ہمیشہ ہی بہت خوب ہوتا ہے، تفصیلی اور مدلل۔ دیگر سلسلوں میں اس ماہ ڈائری میں بھی آپ کا انتخاب شامل ہے۔ آپ دیگر سلسلوں میں بھی لکھیں۔

حنا علی..... لاٹھی کراچی

سرونی بہت خوب صورت تھا ذیل کا معصوم حسن دل کو بھاگ گیا۔ ”کبھی سنی“ میں اتنی پیاری دعا وہ بھی ہم قارئین کے لیے شکر یہ جی، سال نو کے سروے میں اپنا نام نہ دیکھ کر خود ادا اس ہوا پر اگلے ہی کچھ ٹھوس بعد جب شعاع کے سرفہرست میں میرا حیدر پڑ گیا پڑی تو یقین مایے اتنی خوش ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ آپ جیہاں کا انٹرویو کریں۔ ”حالم“ کی قطع ہمیشہ کی طرح زبردست رہی۔ ”تعلی جیسا پیار“ پڑھا۔ اف زہبی سے اتنی بے وقوفیوں کی امید نہ تھی۔ ”رنگ ریز میرے“ بہت خوب صورتی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ ”نفسانی واژ دوامی“ انجینئرس میں شائستہ انجم پر انتہائی حیرت ہوئی دل کر رہا تھا بس کسی طرح انہیں ان صفحات سے نکال کر اپنے سامنے بٹھا دوں اور کہوں کہ بہن یہ آپ کر کیا رہی ہیں؟ میری کلاس کی تقریباً آدھی لڑکیاں بھی ان ہی کے نقش قدم پر چلی رہی ہیں..... ایک کو تو پکڑ کر میں نے اتنی زیادہ چھین کیں کہ پہلے تو وہ مجھے یہی کہتی رہی کہ جب ہمیں محبت ہو گی، تب تم سے پوچھوں گی؟ جس پر میں چند منٹ تو

عزیز سید کا انٹرویو لے کر شاپن رشید صاحبہ نے مجھ پر تو احسان ہی کیا ہے۔ عزیز سید کے تو ہم اس قدر رشیدانی ہیں کہ ہمیں ان کا انٹرویو بہت مختصر لگا۔ سروے میں تمام بہنوں نے ہی بہت اچھے جوابات دیے۔ کسی ایک کا نام لینا زیادتی ہوگی۔ ام انعام کے اچھے خطوط لکھنے کے پیچھے

ساتھ اترنا

ہماری ہر دل عزیز مصدراحت جنہیں کے سر رضائے الہی سے انتقال کر گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔

مسئله نیست زیرا که ————— که در اینجا

آئیے نا سیکھیں مجھ کو
دیکھئے نا بکھر گیا ہوں میں

نوال افضل گھمن _____ کراچی

میں خود پہ ہنس رہا تھا زمانے کے ساتھ ساتھ
وہ مرحلہ بھی عشق میں کس حوصلے کا تھا

منجھ اکرم
تجھ کو سو بار پکارا شبِ تنہائی میں

اور سہ بار تجھے پاس نہ پا کر دھڑے

کہاں سے ہو کے کہاں تک حیات آتی ہے
اداس بلیوں یہ تارے جھلک رہے ہیں ابھی

فناکرہ سہیل

کراچی

کچھ ایسا برفِ محنتی اس کی نظر میں

عزیز نے کے لیے راستہ نہیں تھا
سے امجد آج تک وہ شخص دل میں

جو اس وقت بھی اپنا نہیں تھا
شیر قطب _____ کراچی

یقین مانو کوئی مجبور یاں نہیں ہوتیں
لگ بس عادتاً وفا نہیں کرتے

آکسید جاوید

ہر ہجیرہ کا صد مہ مجھے پہلا سال کا تھا

دن تو اس شہر کی رونق میں گزر جاتا ہے

نادیہ یاسر

میں برف کا انسان ہوں تو دھوپ کی صورت

ریحانہ جو مدد ری..... بدو کے رندہ

ڈائجسٹ پڑھنا شروع کیا تو حشر خاں بھٹوکا ناول ”ہوا سہیل چلی سا کوئی“ ہی اس ناول تھا جو دلوں کا بے حساب ہے۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے، آپ بھی پریشان نہ ہوں ان شاء اللہ 2020ء آپ کے خوابوں کے شرمندہ

بھاگ دوڑ میں سمجھ میں آنے والا نہیں تھا۔ سیاست کے سمندر میں ہر لمحہ اخی الگ داستان، نیا ہی ظلمت کا سال

سے مل کے بہت خوشی ہوئی اور پھر انشاجی کی بات کیا کریں کیا؟ وہ ہر دل کے پاس ہیں۔

قرۃ العین خرم ہاشمی کا افسانہ ”زرخیز مٹی“ بہت اچھا تھا۔ تمام سلسلے بہترین تھے سب بہنوں کے سروے اچھے

گئے اور یوں لگا کہ کبھی آج کی کامیاب مصنفات بھی کل کی سروے رائٹر رہیں ہوں گی اور یہ سروے رائٹر شاید

آئندہ کی بہترین مصنفات ثابت ہوں۔
ج: رحمانہ جی! ہم آج کے خیال سے مقررہ

ہماری قارئین کے خطوط، سروے بڑھ کر ہمیں بھی لگتا ہے کہ آگے چل کر بہت اچھے مصنفین مل سکتے ہیں۔

اپنے لیے رات کو دس تو کیا پانچ منٹ بھی نکالنے
سب ہی بہت باصلاحیت ہیں۔

سب سے پہلے ہیں۔ تاہم اس میں - سینیٹ میں - مسکن کو

ماہنامہ غامین و جست اور ادارہ غامین و جست کے تحت شائع ہونے والے رسائل ماہنامہ شعل اور ماہنامہ شمع میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی قسمی حصے کی اشاعت یا کسی بھی نئی وی چینل یا ڈراما یا ذرائع نقل اور سلسلہ وار قطعہ کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پیشتر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ صورت دیگر ادارہ قانوناً جابر ہوگی یا کافر کہتا ہے۔

عالم کی ڈاڑھی

ناہید املاہیل کے ذائقے سے

میری ڈاڑھی میں تحریر ایک منزل قارئین کی نذر
اب تک یہی سنا تھا کہ بازار بک گئے
اس کی گلی گئے تو خریدار بک گئے

لگے لگی ہیں مجھ سے۔ ناقص کی بولیاں
یعنی جہاں کے سارے ہی شہکار بک گئے

جس نے ہمیں خریدنا، منافع کما لیا
اپنا یہ حال کہ ہر بار بک گئے

انجام یہ نہیں تھا کہانی کا اصل میں
کیا ایسے کہ بیچ میں کر دار بک گئے

جنگل کی دھوپ میں بھی زسایہ میں ملا
قیمت لگی تو ذیلیے استہجار بک گئے

استا تو فرق ہے پلو اپنوں میں جبر میں
اپنے تھے خرم سار، مگر یاد بک گئے

مست پوچھ ان کا کہتے محبت کے مول جو
روئے تمام عمر کے بے سار بک گئے

کیسے شکایتیں بھلا اب کس کے دہرو
قاصد بکا بہل، یہاں دہار بک گئے

حنا سلیم لون کے ذائقے سے

میری ڈاڑھی میں تحریر گولو کی یہ نظم بچے دلہند

ہے۔ آپ سب کی نذر
تم جس خواب کا بادل لے کر

اپنے گیت بناتے ہو
تم جس آنکھ سے آنسو بہ کر

اپنا درد بھالتے ہو، بادلوں کی طرح گہراتے ہو
تم جس یاد کی خوشبو سے

اپنی شام بھالتے ہو، لفظوں کو مہکاتے ہو
تم جس میر کی چھاؤں ادا لے

رستہ رستہ، مٹی مٹی، آگے ادا لگاتے ہو
دھوپ میں پھول کھلاتے ہو

برکھا، باد، پرندہ اور پتھر کی بن جلتے ہو
میں اس خواب کے جادو، آنکھ کے آنسو

یاد کی خوشبو
اداس پیر کی چھاؤں سے

دودھ دانے کے رستوں اور دشاؤں سے
بارشوں اور ہواؤں سے

ایک سستہ نظم بنا کر
روز تھارے شہر کی جانب روانہ کرنا ہوں

ملے گا بہار کرنا ہوں
ملے گا بہار کرنا ہوں

نہ شاعر تو خوب بسایا تم نے
کیوں پرانا ہوا میرا، ذرا دیکھ تو لو

نہ شاعر تو خوب بسایا تم نے
کیوں پرانا ہوا میرا، ذرا دیکھ تو لو

ان چراغوں کے تلے ایسے اندھے کیوں ہیں
تم بھی رہ جاؤ گے حیران، ذرا دیکھ تو لو

پھر مقرر کوئی سرگرم سر مہر ہے
نفس کے بے فعل کا سامان، ذرا دیکھ تو لو

تم یہ کہتے ہو کہ میں غیر ہوں پھر بھی شاید
نکل آئے کوئی پہچان، ذرا دیکھ تو لو

تیم شجرین کے ذائقے سے

میری ڈاڑھی میں تحریر فاخرہ بول کی یہ غزل پری
پسندیدہ ہے۔ آپ بھی پڑھیں اور بتائیے کہ آپ

کونسی لگی۔

نہیں پہلے،
سہمی لہسی، بوجھل بوجھل

اکٹھم کس کا موسم جل متل
اُٹھتی گرتی ان پر جنہل

پاگل کر دے ان کا دشن
دات سی گہری ان کی رنگت

ہوش گنوا دے ان کی سنگت
بھکے بھکے پیمانے ہیں

قاصر ان سے غانے ہیں
چپ رہ کر بھی گھٹنوں بولیں

مجید یہ من کے سارے گھوٹیں
دوب کر ان میں کوئی نہ ابھرے

ساگر سے بھی بڑھ کر گہرے
شاعر ان پر گیت کہتے ہیں

ان کو من کا میت کہتے ہیں

سوئے میں ہر دم مانگیں
بیتم ہیں یہ شیریں آنکھیں

ہیرے، موق، نعل گہریں
شیریں آنکھیں میرا گہریں

ملا نا کوثر کے ذائقے سے

وقت بنا آہٹ کے گزرتا ہے۔ میں یادیں رہ
جاتی ہیں دلوں میں۔ کچھ یادیں پھول بن کر کھل جاتی ہیں

کچھ تارے بن کر چمک جاتی ہیں، دہانے کے گوشوں میں۔ ایسے
پہاڑیوں پر مینی عبد اللہ عظیم کی یہ غزل صورت نظم قارئین

بہنوں کے نام۔

جاد،
کبھی بھی کوئی یاد

کوئی بہت بُرائی یاد
دل کے درد اڑنے پر

شام کو سیسے تار نکلے
صبح کو بیسے پھول

پیسے دھیرے دھیرے زمین پر
روشنیوں کا نزول

سے روتے روتے امانک
نفس دے کوئی ملول

کبھی بھی کوئی یاد کوئی بہت بُرائی یاد
دل کے دوا نہ لے پر

ایسے دستک دیتی ہے

سورج کی شہیت

ماٹل	نساہ چپیں
میک اپ	روزی بینائی پھاوا
ٹوٹی گرائی	میں سے رضا

ہے۔ (اوہ..... یعنی) زیادہ نرمی دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔ محبت کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ بیوی کو ہر طرح کی آزادی دے دی جائے (گٹ پھڑ کے رہیں)۔ بیوی کے سامنے مرد بن کے رہنا (بہت شوخانہ نہیں) بیوی کو ڈھیل دو گے تو وہ سر پر چڑھ جائے گی (بیردی جونی بیروچ دیں) پھر تم بچھتاؤ گے۔ محبت اپنی جگہ ہے اور مرد کی حاکمیت اپنی جگہ۔

(یہ خط یقین مائیں مارلن براؤن کی بیوی بھی نے اپنے بھائی کو لکھا تھا۔ بھاشیر دی جینن نے نہیں۔)

فوکس

علی ظفر یوں تو بالی وڈ کی کئی فلموں میں کام کر چکے ہیں لیکن پاکستان میں وہ طیفان ٹریل کے بعد نظر نہیں آئے جبکہ ان کی فلم باکس آفس پر کامیاب بھی رہی تھی علی ظفر نے اس کے سیکول کا اعلان بھی کیا لیکن فی الحال تو ایسے آثار نظر نہیں آ رہے۔ اس



سراغ

کہتے ہیں کہ ساس بھوکا جھگڑا ہر معاشرے اور ہر طبقے میں ہوتا ہے خواہ ترقی یافتہ ہو یا پائس ماندہ صرف مشرق ہی نہیں مغرب بھی اس ساس بھوکے جھگڑے سے محفوظ نہیں حد تو یہ ہے کہ برطانوی شاہی خاندان بھی اس کا شکار رہا ہے اور ابھی بھی ہے۔

مشہور بالی وڈ اداکار مارلن براؤن اپنی زندگی کے بارے میں بتاتے ہیں کہ ”میرے والد کا شادی کے بعد میری والدہ کے ساتھ جو رویہ رہا، اس کے پیچھے کون سی نفسیاتی گڑبڑیں کام کر رہی تھیں اس کا تصور بہت سراغ آپ کو شاید ان کی بیوی بہن کے ایک خط سے مل سکے جو انہوں نے اس روز میرے والد کو لکھا تھا جس روز میرے والد کی شادی تھی۔

انہوں نے اس خط میں لکھا تھا کہ ”مارلن! شادی کے بعد پہلے دن سے ہی اپنی بیوی کے سامنے باس بن کے رہنا۔ (ہائیں! وہاں کی تندرستی بھی.....؟) اسے شروع سے ہی احساس دلادینا کہ گھر میں حاکم کون



حوالے سے علی ظفر نے ایک انٹرویو میں انکشاف کیا کہ وہ جلدی جلدی اسکرین پر نظر آنے پر یقین نہیں رکھتے (کس کے جلدی جلدی آنے پر؟) میں جب بالی وڈ میں کام کرتا تھا تو بھی سال میں ایک فلم کرتا تھا (وہ لیتے ہی ایک فلم میں تھے)۔ کیوں کہ میں اداکاری کے ساتھ ساتھ اپنے میوزک پر بھی فوکس رکھتا ہوں (پرنتی چیز تو میوزک میں بھی نہیں نظر آتی تو پھر فوکس؟ کبھی کبھی؟)

اگلی فلم میں وہ مایا علی کے بجائے نئے ٹیلنٹ کو سامنے لانے کی بات کرتے ہیں بقول ان کے پاکستان میں نوجوانوں خاص طور پر خواتین کو سامنے لانا چاہیے ہیں کیوں کہ ہمارے معاشرے میں خواتین کا میوزک انڈسٹری کا حصہ بننا ممنوع سمجھا جاتا ہے۔ (ارے تو یہ جو (آئی) خواتین موسیقی میں نام بن رہی ہیں وہ کیا.....؟)

سوچ

پاکستانی فلموں میں مختلف کردار ادا کرنے والی اداکارہ رشمن لی وہی پر بھی کی ڈراموں میں اداکاری کے جوہر دکھا چکی ہیں۔ رشمن کی خاص بات یہ ہے کہ وہ کسی بھی ایکٹرنل سے بچ کر اپنے کام پر توجہ دیتی ہیں۔

2020ء کی اچھی خبر یہ ہے کہ رشمن نے اس سال شادی کا اعلان کر دیا ہے۔ رشمن کا کہنا ہے کہ اپنے معیار اور پسند کے مطابق کوئی لڑکا نہیں مل سکتا تھا (لڑکا.....؟) اور طلاق کی بڑھتی ہوئی شرح اور شوہر کی ناکام شادیوں کی وجہ سے ہی شادی سے انکار کرتی رہی۔ کیوں کہ شادی بھانے کا نام ہے اور اس کے لیے جیون ساتھی آپ کی پسند کا ہی ہونا چاہیے۔ (نہ ہو تو.....؟)

رشمن نے حال ہی میں بتایا کہ وہ کس سے اور کب تک کریں گی کیوں کہ سال میں تو بارہ میمنے ہوتے ہیں اور ابھی تو سال 2020ء کا آغاز ہے۔

کچھ ادھر ادھر سے

خلیل الرحمن قمر کا کہنا ہے کہ ”میرے پاس تم ہو“

ایک نہیں بہت سے مردوں کی کہانی ہے۔ میں نے ایسے کئی مردوں کو دیکھا ہے جن کے ساتھ ایسا ہوا، میں نے دیکھا ہے کہ جب ایک عورت بے وفائی کرتی ہے تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتی ہے کیونکہ اسے دوسرے مرد کا سہارا ہوتا ہے لیکن جب ایک شادی شدہ مرد بے وفائی کرتا ہے تو وہ نظریں جھکا کر بات کرتا ہے کیونکہ اسے شرمندگی ہوتی ہے۔

(خلیل الرحمن قمر)

جمہوری دور کا زوال ہو اور اٹھارویں برس تک کی جمہوری قوتیں پسپا ہو گئیں۔ ایک طرف میڈیا آزاد نہیں رہا، دوسری طرف شہری حقوق محفوظ نہ رہے۔ آئین کی حقیقی مکمل داری کی جگہ طاقت کی بالادستی ریاست کے رگ و پے میں پیش پیش چلی گئی۔ دوسری طرف مہنگائی ہے کہ ہر روز لوگوں کو خط غربت سے بچنے دھیل رہی ہے۔ اوپر سے اقتصادی بحران ہے کہ بوھٹا جا رہا ہے آئندہ دو برسوں میں بھی شرح نمو تین فیصد سے اوپر نہ چاہئے گی۔

(انتہا عالم۔ انگیت)



موسم کے پکوان

خالد جیلانی

سے ہٹا کر ڈش میں نکال کر سرور کریں۔

چنیوٹی بریانی

اجزاء:

چاول	آدھا کلو
گائے کا گوشت	آدھا کلو
دہی	ایک پاؤ
پسی ہری مرچ	دو کھانے کے چمچے
پیادھنیا	دو کھانے کے چمچے
نمک	دو چائے کے چمچے
لال مرچ	ایک چائے کا چمچ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچ
گرم مسالا	ایک کھانے کا چمچ
بادیان کے پھول	چار عدد
جاقٹل جادری	آدھا چائے کا چمچ
ادرک لہسن	دو کھانے کے چمچے
آلو بخارہ	حسب پسند
ہر ادھنیا	آدھی ٹمبی
پودینہ	آدھی ٹمبی
زرد رنگ	آدھا چائے کا چمچ
تیل	چھ کھانے کے چمچے
پیاز	ایک کھانے کا چمچ

ایک دھیمی میں ڈھائی گلاس پانی، دہی، ہلدی، لال مرچ، نمک، تیل، گرم مسالا، لہسن اور ک، جاقٹل، جادری اور بادیان کے پھول ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں۔ پھر اس میں ابلتا گوشت شامل کر کے دس منٹ تک پکا لیں۔ دہی میں زرد رنگ اور چاول شامل کر کے دو ٹکی پکالیں۔ اوپر پیاز، نمٹا، آلو بخارہ، ہر ادھنیا، پودینہ، ادرک اور تیل شامل کر دیں۔ دس سے بارہ منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔ چولے

سبزیوں کا نوابی سالن

اجزاء:

ایک پاؤ	گاجر
ایک پاؤ	پھول گوشت
ایک پاؤ	تازہ پھلیاں
ایک کھانے کا چمچ	چینی
ایک کپ	پانی
ایک عدد	گرہوی کے اجزاء
دو عدد	پیاز
ایک کلو	بادیان کے پھول
ایک کھانے کا چمچ	دار چینی
آدھا چائے کا چمچ	زیرہ
حسب ذائقہ	کئی لال مرچ
آدھا چائے کا چمچ	نمک
چار کھانے کے چمچے	ہلدی
دو عدد	خشخاش
حسب پسند	سبز الائچی
دو کھانے کے چمچے	اٹی کا گودا
آدھا کپ	ہری مرچ
	تیل

تمام سبزیوں چینی، نمک اور ایک کپ پانی کے ساتھ ابلالیں۔ دھیمی میں تیل گرم کر کے زیرہ اور پیاز فراٹی کریں پھر اس میں نمٹا، پوری، سبز الائچی، خشخاش، ہلدی، ہری پسی مرچ، کئی لال مرچ، نمک، دار چینی اور بادیان کے پھول ڈال کر ہلکا سا فراٹی کر لیں۔ سبزیوں ڈال کر مکس کریں۔ ڈھانپ کر بیس

منٹ تک پکائیں اور آخر میں اٹی کا گودا ڈال کر چولے سے ہٹالیں۔ مزے دار سبزیوں کا نوابی قورمہ تیار ہے۔

چکن ڈنٹس

اجزاء:

ایک کلو	آلو
آدھا کلو	چکن کا قیہ
آدھی ٹمبی	پودینہ
آدھا چمچ	زیرہ
پانچ عدد	سبز مرچ
ایک عدد	پیاز
دو عدد	اٹلے
چار کھانے کے چمچے	کارن کلور
چھ کھانے کے چمچے	میدہ
ایک کھانے کا چمچ	کئی لال مرچ
ایک کھانے کا چمچ	لہسن اور ک
ایک چائے کا چمچ	گرم مسالا
آدھا چائے کا چمچ	ہلدی
حسب ذائقہ	نمک
تیلے کے لیے	تیل

ترکیب:- آلو ابلالیں۔ قیہ میں تمام اجزاء اچھی طرح ملا لیں۔ پھر ان سب کو اچھی طرح ٹیس لیں۔ اب اس آمیزے کو گول کباب کی شکل میں تیار کر لیں۔ آگوشے کی مدد سے چکن ٹنٹس کے درمیان سوراخ کر دیں۔ پھر کباب کو اٹلے میں ڈبو کر بریڈ کر میز میں رول کریں۔ پھر اسے تل لیں۔ لذیذ چکن ڈنٹس تیار ہیں ٹائو کپ یا چینی کے ساتھ پیش کریں۔

میکرونی

اجزاء:

ایک کپ	میکرونی
--------	---------

سفید پنے

آلو

پیاز

نمٹا

سیب

ہری مرچ

لیمون کا رس

کٹا ہر ادھنیا

چینی

اٹی کی میٹھی چینی

ترکیب:-

آلو اور پنے میکرونی کو الگ الگ ابلالیں۔ میکرونی ابل جانے تو اسے ٹھنڈے پانی سے تھار لیں اور ایک چمچ تیل ڈال کر اچھی طرح ملا لیں۔ پھر ک پیالے میں اٹی ہوئی میکرونی اور اوپر دیئے گئے اجزاء ڈال کر اچھی طرح ملا لیں۔ تاکہ تمام اجزاء اچھی طرح میکرونی میں جذب ہو جائیں۔ پھر حسب پسند اٹی کی چینی ڈال کر پیش کریں۔ مزے دار میکرونی چاٹ تیار ہے۔

ملائی لڈو

کنڈینسڈ ملک

آدھا کپ

ایک پاؤ

دو تین قطرے

دو چمچ

دو سے تین قطرے

ایک عدد

پنہ کو اچھی طرح چور کر کے اس میں کنڈینسڈ ملک ملا دیں اور پھر دھیمی میں اس آمیزے کو ٹکی آج پر چولے پر پکا لیں۔ چمچ مسلسل چلائی رہیں جب آمیزہ گاڑھا ہو جائے اور اپنی جگہ چھوڑنے لگے تو اس میں دینا لٹکس ملا کر چولے سے اتار لیں اچھی طرح مکس کر کے کسی کٹلے برتن میں نکال لیں ٹھوڑا ٹھنڈا ہو جائے تو لڈو بنائیں اس پر الائچی یا ڈر چمچ کر دیں اور اگر ہو سکے آسانی سے تل جائیں تو چاندی ورق بھی لگا دیں۔

مجبوری کی صورت میں تورکی روٹی منگوائی جاتی ہے۔ دوسرا سالن میں جتنے بھی سالے استعمال کرتی ہوں گھر کے یعنی بازار سے ثابت گرم سالہ، خشک دھنیا لاکر گھر میں پھینک کر استعمال کرنے سے سالن کا رنگ اور ذائقہ دونوں بہت خوب ہوتے ہیں۔ سالن ایک وقت بنایا اور دو وقت چلا لیا۔ گرمیوں میں دوپہر میں لی لازمی ہوتی ہے۔

س: گھر میں اچانک مہمان آجائیں کھانے کے وقت تو کیا کرتی ہیں فوری تیار ہونے والی ڈش کا نام بتائیں جو پیش کر لیں؟

ج: اچانک تو آج کل کوئی نہیں آتا ہے موبائل نے یہ بہت پیدا کر دی ہے پھر بھی اگر کوئی آجائے تو فریزر میں گوشت ہال کر رکھا ہوتا ہے جو کہ چار آمپوں کے لیے کافی ہوتا ہے۔ مہمان کے آنے پر تھیں پلاؤ لایا گیا، ٹماٹر ڈالے، ساتھ میں گوشت ڈال کر ملی آجائے۔ جب ٹماٹر اور گوشت کا پانی خشک ہو جائے تو درمیان آجائے پھر یوں کر آخر میں ہاتھ کا پا کر مسالا دھوا دھنیا ڈال دیا۔ ویسے میرا پلاؤ بہت مشہور ہے۔ اگر نائم ہو تو پلاؤ جو کہ سب بناتے ہیں غدا ہی ترکیب کے ساتھ بنایا اور ساتھ میں رائے اور اجا پھیں۔

چائے کے وقت اگر کوئی آجائے تو میں پکڑے بناتی ہوں۔ میرے پکڑے بھی بہت مشہور ہیں ذائقے میں بھی اور سائز میں بھی۔ اللہ پاک غریق رحمت کرے میرے تانا ابا کو۔ جب انہوں نے پہلی دفعہ میرے ہاتھ کے پکڑے کھائے تو اپنے گھر جانے کے بعد جو بھی ان کے گھر آتا میرے پکڑوں کی تعریف ضرور کرتے۔

دوسرا پہلی بار میرے ہاتھ کے پکڑے کھانے کے بعد انہوں نے مجھ سے پوچھا پتہ! کوئی سانچا رکھا ہوا ہے جو تمہارے پکڑوں کا سائز اور شکل ایک ہی

ہے؟ سادہ کک، خطائیاں یہ بھی گھر میں بناتی ہوں۔ آج کل میرا انیم روٹ مشہور ہے اور میرا مشہور ہے آپ سب کو بھی۔ چکن جب بھی آئے اسے دھوکر اس کا پانی خشک ہو لو، لہسن، ادراک کا پیسٹ، خشک دھنیا اور سفید زیرہ تو پھر یوں لیں، پھینک کر ساتھ میں سرخ، کالی مرچ حسب ذائقہ، نمک حسب ضرورت اور چکنی بھرزو دے کارنگ۔ یہ سب چیزیں چکن پر لگا کر فریزر کریں پلاسٹک کی تھیلی میں۔

مہمان آنے پر کسی دیکھنے میں برش سے ہلکا سا آئل لگا لیں اور مسالا لگا چکن ڈال کر دم دیں۔ اگر سرخ پانی میں منٹ بعد چھچھلا کر دوبارہ دم دیں۔ اگر سرخ پانی چھوڑ دے تو بالکل آخر میں دھنیا لگا کر دس منٹ کے لیے درمیان آجائے۔ پانی خشک ہو جائے تو کوسے کا دھوا لیں چکن بہت نرم بنے گا جو بزرگ حضرات کو زیادہ پسند آئے گا۔ اس طرح بنانے سے چکن نرم بھی رہتا ہے اور ذائقہ بھی۔

س: صبح کا ناشتہ کیا بناتی ہیں؟ کوئی خاص چیز؟

ج: نہ جی! یہ لادائیں ہوتے، ہماری اماں حضور پر اٹھوں کے خلاف ہیں کہ آئل اور ڈالڈا نقصان دہ ہے کھانی ہے تو سادہ روٹی کھاؤ، سوسا دہ روٹی، چائے، ساتھ میں جس نے فرانی انڈا کھانا ہو تو خود بنائے۔ ملائی، رات کا سالن یا پھر حلوے شلوے ہمارے ہاں کوئی نہیں کھاتا۔ ایک دو دفعہ میں نے بچے پوریاں ٹرائی کی تھیں لیکن صبح میں ممکن نہیں سو یہ ڈش جی شام کی چائے کے ساتھ بنالیتے ہیں۔

س: مینے میں کتنی بار کھانا کھانے باہر جاتے ہیں؟

ج: کبھی بھی نہیں گئے مینے، سالوں کی تو بات ہی ذکر کریں۔ گھر کے مردوں کا فرمان ہے جو کھانا ہے۔ بناؤ۔ گھر لے کر آئیں۔ باہر والا لاؤ نہیں ہے۔ اپنی شادی کی شائنگ میں باہر دوپہر کا کھانا کھانے کا اتفاق ہوا تھا۔ بس۔

س: کھانا بناتے وقت موسم کو مد نظر رکھتی ہیں؟

ج: کیسا موسم، کہاں کا موسم، موسم تو آپ کے اندر

کا ہوتا ہے وہی دال ماش گرمیوں میں کھاتے ہیں تو سردیوں میں بھی وہی کھاتے ہیں۔ وہی مرغی گرمیوں میں پکیتی ہے تو سردیوں میں بھی وہی پکیتی ہے۔ صرف سبزیاں مونکی پکیتی ہیں۔ گرمیوں کی بارش ہو یا سردیوں کے پکڑے اور چٹا جات تو پھر موسم کو کیا مد نظر رکھیں۔

س: چکن کی کوئی ٹپ؟

ج: بیج جس وقت بھی چھلکا دفعہ چکن میں جائیں تو دروازے میں کھڑے ہو کر سات دفعہ بسم اللہ پوری پڑھ کر راشن، آئل کی چٹنی، فریج غرض سارے چکن پر چھوکر دیں۔ برکت ہوگی۔ اور ساتھ میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کریں کہ اس نے پکانے اور کھانے کو دے رکھا ہے ورنہ کتنے ہی گھروں میں دو دو دن چولہا غنڈا پڑا رہتا ہے۔ رات سونے سے پہلے چکن کے حلیات صاف کر کے، برتن دھوکر اور پکڑے والی باسکٹ پر نیا شاپر لگا کر، دن بھر کے پکڑے کوشا پر میں ڈال کر باندھ کر چکن سے اٹھا دیں۔ دوسری صورت میں گندے اور نکھرے ہوئے چکن میں جب تک آپ دھل ہوں گی تو آپ ہی کو کوفت، اجبھن کا شکار ہونا پڑے گا۔

آخر میں تمام ماؤں سے گزارش ہے کہ بچوں کو چکن میں گھسا کر بھول مت جائیں۔ انہیں بھی ریلیکس ہونے کا موقع دیں۔ گھر میں مہمان آجائیں تو انہیں بھی ان کے ساتھ بیٹھ کر کپ شپ لگانے دیں۔

ہمارے ہاں ادھر بچیاں بڑی ہوتیں۔ مائیں بچن بچوں کے حوالے کر کے خود کھلے اور خاندان کے دروں پر چلی جاتی ہیں۔ گھر مہمان آگئے تو خان کے ساتھ بیٹھ کر دنیا بھر کے قصے چھیڑتی تھیں ہیں اور بچیاں بچن کے سمجھڈوں میں الجھی رہتی ہیں۔ ہر کام، ہر ذمہ داری کو ایک مناسب وقت اور مناسب طریقے سے حوالے کیا جائے بچوں کی دلچسپی اور لگن قائم رہے گی۔

وقت سے پہلے اور حد سے زیادہ ذمہ داری چڑچڑاہیں، کوفت اور اجبھن کا باعث بنتے ہیں۔ اپنا خیال رکھیے گا۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

فرحت اقبال

دس سال پہلے میری پہلی شادی ہوئی۔ شوہر بہت اچھے تھے۔ میرا بہت خیال رکھتے۔ شادی کو سال ہی گزرا تھا کہ میں اس سے ہوئی۔ میرے شوہر بہت خوش تھے لیکن اللہ کو چکا اور ہی منگور تھا۔ میرا بچہ ضائع ہو گیا۔ ڈاکٹر نے پندرہ ریت کے لیے کہا۔ سال بعد وہ میں اور زندگی اس نے کھری گئی۔ میرے شوہر نے فل نام ملازمہ رکھی۔ خاصی پختہ عمر کی عورت تھی۔ اس نے میری سال کے بھی سب کام نبھال لیے۔ ملازمہ بیکار بی بی تو اس نے اپنی بی بی کو کام کرنے کے لیے بھیجا۔ رینڈ نام تھا لڑکی بہت طرح دار اور تیز طرز نظر آتی تھی۔ وہ میرے شوہر کے آفس جانے کے بعد ان کی گئی۔ شاید ایک آدھ بار ہی شوہر سے سامنا ہوا۔ دو تین بعد اس کی ماں ٹھیک ہوئی تو اس نے آ کر کام نبھان لیا۔ ایک ماہ بھی نہ گزرا تھا کہ میرے شوہر سرخ پٹروں میں ملبوس سولہ گھسار کیے دہن زہرینے کے ساتھ کمر میں داخل ہوئے۔ انہوں نے سروسے میں اطلاع دی کہ وہ دوسری شادی کر چکے ہیں۔ میں ہکا بکا دیکھتی رہ گئی۔ میں بڑی لکھی، سلیطہ مند تھی، خوش شکل تھی۔ ہماری شادی کو ابھی سال ہی گزرا تھا پھر ایک دوسری شادی..... پتا نہیں انہوں نے کب زہرینہ کو دیکھا اور اتنی جلدی سارے معاملات طے بھی ہو گئے۔ میرا دماغ کاؤف تھا اور میں ٹکر کر دیکھ رہی تھی۔

بہر حال جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔ اب رونا، دھونا، وادیا کرنا فضول تھا۔ ایک ماہ بعد مجھے طلاق کا حکم دے کر اس گھر سے بھی نکال دیا گیا۔

شادی کے صرف ڈیڑھ سال بعد میں طلاق کا دھو لگا کر اپنے گھر واپس آ گئی۔ میں خوب صورت تھی، تعلیم یافتہ تھی، اچھے گھر آنے سے تعلیق تھی۔ کئی لوگ اب بھی شادی کے لیے تیار تھے۔ لیکن میرا اعتبار دوس سے اٹھ چکا تھا۔ شادی کے نام سے وحشت ہوئی تھی۔ میں چاہتی تھی، کہیں جاب کر لوں لیکن مجھے گھر میں برواشت کرنے کو تیار نہ تھیں۔ انہوں نے اپنے روتے سے اس قدر مجبور کر دیا کہ میں دوسری شادی کے لیے رضامند ہو گئی۔

میرے دوسرے شوہر بھائی کے دوست تھے۔ خوش شکل، تعلیم یافتہ اور برسر روزگار تھے۔ وہ ہمارے گھر آتے جاتے تھے۔ قدرت ختم ہونے کے فوراً بعد جب انہوں نے شادی کی بات کی تو بھیا فورا ہی راضی ہو گئے کیونکہ وہ انہیں اور ان کے گھر والوں کو ابھی طرح جانتے تھے۔ ان کے گھر والے رشتے لے کر آئے اور میں بیاہ کر کے گھر میں آئی۔ میرے دل میں بہت سے خدشات تھے لیکن وہ خدشات غلط ثابت ہوئے۔ میرے شوہر بہت اچھے ہیں۔ گھر میں سب کو لوگ میرا بہت خیال رکھتے ہیں لیکن نہ جانے میرے دل میں کیا خوف اور بے اعتمادی ہے کہ شوہر کو زرا دیر ہو جائے تو میں پریشان ہو کر انہیں فون کرنے لگتی ہوں۔ وہ کسی دوست کے گھر جا میں تو مجھے خدشات ستانے لگتے ہیں۔ وہ لڑکی پر کسی انٹرنیٹس کو فون سے دیکھیں یا تھرٹل کر دیں تو میں چڑ جاتی ہوں۔ گھر میں ملازمہ رکھی جائے، اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ گھر میں جو ملازمہ رکھی، اسے بھی میں نے بہانے بنا کر نکال دیا۔ اب سارے گھر کے کپڑے اور برتن مجھے ہی دھونا پڑتے ہیں۔

میرے شوہر کہتے ہیں کہ میرے روتے سے وہ مٹن محسوس کرتے ہیں۔ میری خاموشی انہیں اچھن میں مبتلا کرتی ہے۔ میری پوچھ گچھ سے انہیں ذلت کا احساس ہوتا ہے کہ میں ان کے کردار پر شک محسوس کر رہی ہوں۔

وہ جو مجھ کہتے ہیں، ایک لفظ بھی غلط نہیں ہے لیکن میں بھی کیا کروں۔ ہر روز خود سے عہد کرتی ہوں۔ پھر پتا نہیں مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ میں خود پر سے اختیار کھینچتی ہوں۔ خدا دا مجھے مشورہ دین، میں کیا کروں۔ میں خوف زدہ ہوں کہ میرے دیکھے سے ننگ آ کر میرے شوہر مجھے چھوڑ نہ دیں۔

ج: عزیز بہن! جو کچھ آپ کے ساتھ ہوا اور جس طرح اچانک ہوا۔ یہ باتیں اس کا رد عمل ہیں۔ اب جو صورت حال ہے، وہ آپ کی ازدواجی زندگی کے لیے خطرہ ہو سکتی ہے۔ اگر آپ کے رویے میں تبدیلی نہ آئی تو آپ کے لیے کوئی بڑا مسئلہ بھی ہو سکتا ہے۔ بہتر ہے کہ کسی سائیکالوجسٹ سے مل لیں۔ کچھ دواؤں اور علاج سے آپ کی ذہنی کیفیت بہتر ہو سکتی ہے۔

ش۔ حیدر آباد

س: میں بہت پریشان ہوں۔ میرا مسئلہ بہت سنگین نوعیت کا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں۔ ساری ساری رات صبحے پروتے گزر جاتی ہے۔ پلیز آپ ہی میری رہنمائی کریں۔ اللہ پاک آپ کو بہت اجر دے گا۔ میرے دو بیٹے ہیں۔ دونوں انجینئرز ہیں۔ ان شاء اللہ۔ بڑے بچے کو حال ہی میں سرکاری جاب ملی ہے۔ دوسرا فاعل ایمر کا اسٹوڈنٹ ہے۔ چھوٹا بیٹا جب ایف ایف ایس میں قیام ہے وہ اپنی نئی کوپنڈر کا تھا لڑکی بھی اسے بہت چاہتی تھی۔ تین سال پہلے میرے چھوٹے بیٹے نے کہا: ”آپ میرے لیے ماموں سے بات کرلو۔“ میں نے کہا: ”پہلے کچھ بہن جاؤ۔“ بہر حال میں نے اپنے بھائی کے کان میں بات ڈال دی۔ اس بات کا میرے سارے گھر والوں کو پتا تھا۔ سب بہت خوش تھے کہ کھر کی بات ہے۔

اب ایک سال پہلے بڑے بیٹے کی سرکاری جاب ملی ہے تو یہاں سے حالات بگڑ گئے۔ اب وہ لڑکی بڑے بیٹے کے آگے پیچھے پھرتی ہے حالانکہ دونوں کو پتا بھی ہے۔ پھر بڑے بیٹے نے مجھ سے کہا: ”میری اس سے شادی کر دو۔“ میں بہت پریشان ہوئی۔ بیٹے نے کہا: ”لڑکی سے پوچھ لو وہ بھی راضی ہے۔“ میں نے لڑکی سے بات کی تو اس نے کہا: ”بھئی۔ میں چھوٹے کو پسند کرتی ہوں۔“ میں نے اس سے کہا: ”سوچ لو۔“ مگر اس نے پھر مجھے چھوٹے کا ہی نام لیا۔

بڑا لاکا اس خد کہ بڑا بڑا آپ اس سے زبردستی کر رہے ہو۔ اس لڑکی نے خود مجھ سے کہا ہے، حالانکہ یہ بات سچ نہیں۔ میرا بڑا بیٹا بہت اچھے گھر دار کا اور مجھ دار پچھا ہے اسے پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ چھوٹے بیٹے کے اصرار پر میں نے اس لڑکی سے منگنی بھی کر دی ہے کہ اس طرح بڑا بیٹا خود ہی حالات سے چھوٹا کر لے گا۔ پر اب بڑا خاموش ہو گیا ہے، کسی سے بات چیت بھی نہیں کرتا۔ مجھے اپنا ذہن بھٹاتا ہے۔ وہ لڑکی ابھی نہیں ہے، بہت جھوٹ ہوئی ہے۔ چھوٹے کے ساتھ خوش ہے بہت۔ لیکن بڑے بیٹے سے کہتی ہے ماں باپ کی عزت کے لیے سر جھکایا ہے۔ اس لڑکی کا اب بھی بڑے سے خون پر رابطہ ہے۔

بڑا بیٹا مجھ سے بہت نفرت سے چپ آتا ہے۔ اب اگر میں اس لڑکی کے بارے میں چھوٹے سے بات کروں گی تو اسے بھی خود کوئی اور اگر وہ لڑکی گھر آئے گی تو بھی پتا نہیں کیا ہو گا۔ خدا را آپ مجھے مشورہ دیں۔ میں اسے شوہر کو بھی کچھ نہیں بتا سکتی۔ وہ ہارٹ پیسٹ ہیں۔ ہم بہت شریف لوگ ہیں، ان حالات میں میرے کو دل چاہتا ہے۔ آپ بتائیں میں کیا کروں؟ ج: عزیز بہن! آپ کا مسئلہ اتنی بہت پریشان کن ہے۔ اس میں سارا قصور اس لڑکی کا ہے۔ لڑکیوں کو لڑکوں سے بات کرتے ہوئے بہت بہت متاثر ہونا چاہیے۔ اس لڑکی کو آپ کے بڑے بیٹے کی حوصلہ افزائی نہیں کرنا چاہیے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ اس لڑکی سے آپ اپنے کسی بھی بیٹے کی شادی نہ کریں۔ کیونکہ اس معاملہ میں نگاہ اور محبت سے زیادہ دونوں بھائیوں کے درمیان خد کا عنصر شامل ہو چکا ہے۔ وہ لڑکی آپ کے گھر کی تو دونوں بھائیوں کے درمیان کشیدگی میں اضافہ ہو گا۔ لیکن معاملہ آپ کے بھائی کا بھی ہے۔ اگر آپ نے رشتہ توڑا تو ان کے لیے مسئلہ ہو گا اور وہ آپ سے ناراض ہو جائیں گے کیونکہ آپ کے چھوٹے بیٹے سے اس لڑکی کی منگنی ہو چکی ہے۔ آپ فوری طور پر یہ کام کر لیں کہ بڑے بیٹے کے لیے لڑکی تلاش کریں۔ لڑکی خوب صورت، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور آپ کے بھائی کی بیٹی سے ہر لحاظ سے بہتر ہونا چاہیے۔ لڑکوں کے جذبات میں غموں یا انداز کی نہیں ہونی۔ خوب صوبی دیکھ کر نکل جائے۔ ایک بات کا خیال رکھیں کہ لڑکی آج کے زمانے کے ساتھ چلنے والی، خوش گفتار اور پرکشش ہونا کہ آپ کے بیٹے کا خیال دیتے ہیں۔ ان کا بیٹا انجینئر ہے، انے اچھی سے اچھی لڑکی مل سکتی ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آپ اپنے بھائی سے بات کریں، ان کو ساری صورت حال بتائیں اور ان سے کہیں کہ ان حالات میں وہ خود یہ رشتہ ختم کر دیں۔ اس طرح آپ پر اثر نہیں آئے گا اور آپ کو اس فساد کی بڑے نجات مل جائے گی۔

رابعہ خان..... پشاور

س: میں جب بھی مسکارا لگاتی ہوں پلکیں جڑ جاتی ہیں۔ عجیب سی نظر آتی ہیں۔ مجھے مسکارا لگانے کا صحیح طریقہ بتادیں؟

ج: مسکارا لگانے سے پلکیں خم دار اور گھنی نظر آتی ہیں اور اس وجہ سے آنکھیں بھی خوب صورت لگتی ہیں۔ بشرطیکہ مسکارا درست طریقے سے لگایا جائے۔

آپ کی پلکیں اس لیے جڑ جاتی ہیں کہ آپ ضرورت سے زیادہ کوٹ لگاتی ہیں جس کی وجہ سے مسکارا جلد ہی سخت ہو جاتا ہے اور پلکوں سے اکھڑنے لگتی ہے۔

مسکارا لگانے کا صحیح طریقہ یہ ہے مسکارا لگاتے ہوئے برش کو اوپر سے نیچے اور پھر نیچے سے اوپر لگاتے

زیگ انداز میں حرکت دیں۔ پلکوں پر مسکارا بے کا برش زیادہ بار نہ پھیریں۔ دو تین مرتبہ مسکارا پلکوں

پر پھیرنا — کافی ہوتا ہے۔ اگر اس طرح مسکارا لگائیں گی تو آپ کی آنکھیں سحر انگیز نظر آئیں گی۔

ایک ضروری بات یہ ہے کہ مسکارا جلد خشک ہو کر خراب ہو جاتا ہے۔ یہ خیال رکھیں کہ آپ کا

مسکارا اچھ ماہ سے زیادہ عرصہ کا نہ ہو۔ چھ ماہ کے بعد مسکارا خشک ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اس لیے چھ ماہ

بعد پرانا مسکارا پھینک دیں۔

غزل فاطمہ..... کراچی

س: میری عمر بیس سال، قد پانچ فٹ دو انچ اور وزن 52 کے جی ہے۔ میں زیادہ موٹی تو نہیں لیکن

فرہی مائل ضرور لگتی ہوں۔ کوئی ایسا نسخہ بتائیں کہ میں چھریری اور پتلی نظر آؤں۔ مجھے یہ بھی ڈر ہے کہ

آگے چل کر میرا وزن بڑھ گیا تو میں بھدی لگنے لگوں گی۔ نسخہ ایسا ہو جو میں آسانی کے ساتھ کر سکوں؟

ج: آپ کا وزن قد کے اعتبار سے بالکل مناسب ہے۔ اگر کم کرنا چاہتی ہیں تو ایک دو کلو وزن کم کر لیں۔ اس کے لیے پندرہ منٹ کی چہل قدمی کافی ہوگی۔ ایک اور آسان نسخہ بھی ہے۔

صبح سویرے ایک گلاس نیم گرم پانی میں ایک چمچہ شہد اور ایک لیموں کا رس ملا کر پیئیں۔ اس سے نہ صرف آپ کا وزن کم ہوگا بلکہ صحت بھی شان دار رہے گی۔

لیموں، شہد اور نیم گرم پانی کے گلاس سے نہ صرف قبض دور ہوتا ہے بلکہ شہد فوری طور پر خون میں شامل ہو کر توانائی بھی دیتا ہے۔ اس نسخہ پر عمل کرنے سے آپ کی جلد بھی صاف شفاف ہو جائے گی۔

فوزیہ ستار..... لاہور

س: میرے بال اتنی تیزی سے گر رہے ہیں کہ لگتا ہے کچھ دنوں میں جی ہو جاؤں گی۔ پلیز کوئی نسخہ بتائیں جس سے بال گرنا بند ہو جائیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔

ج: ایک دن میں سو بال گرنا عام بات ہے لیکن ایک دن میں اس سے زیادہ بال گرتے ہیں تو یہ خطرے کی گھنٹی ہے۔ بال گرنے سے روکنے کے لیے

درج ذیل ہدایات پر عمل کریں۔

☆ ہمیشہ اپنے بال صاف رکھیں۔

☆ ہو سکتا ہے جو شیمپو آپ استعمال کر رہی ہیں، وہ آپ کے بالوں کے لیے مناسب نہ ہو۔ اپنے

بالوں کی ساخت کے مطابق شیمپو اور کنڈیشنر استعمال کریں۔

☆ بادام، ارنڈی اور زیتون کا تیل یکساں

مقدار میں ملا کر سر میں مساج کریں۔ آپ کے بال مضبوط ہو جائیں گے۔

☆ چائے کے دو چمچے دہی میں لیموں کا رس ایک چمچہ ڈال کر اچھی طرح چھینٹیں اور سر پر لگائیں۔

بیس منٹ بعد شیمپو کر لیں۔

ان ہدایات پر عمل کرنے سے بال گرنا رک جائیں گے۔

☆